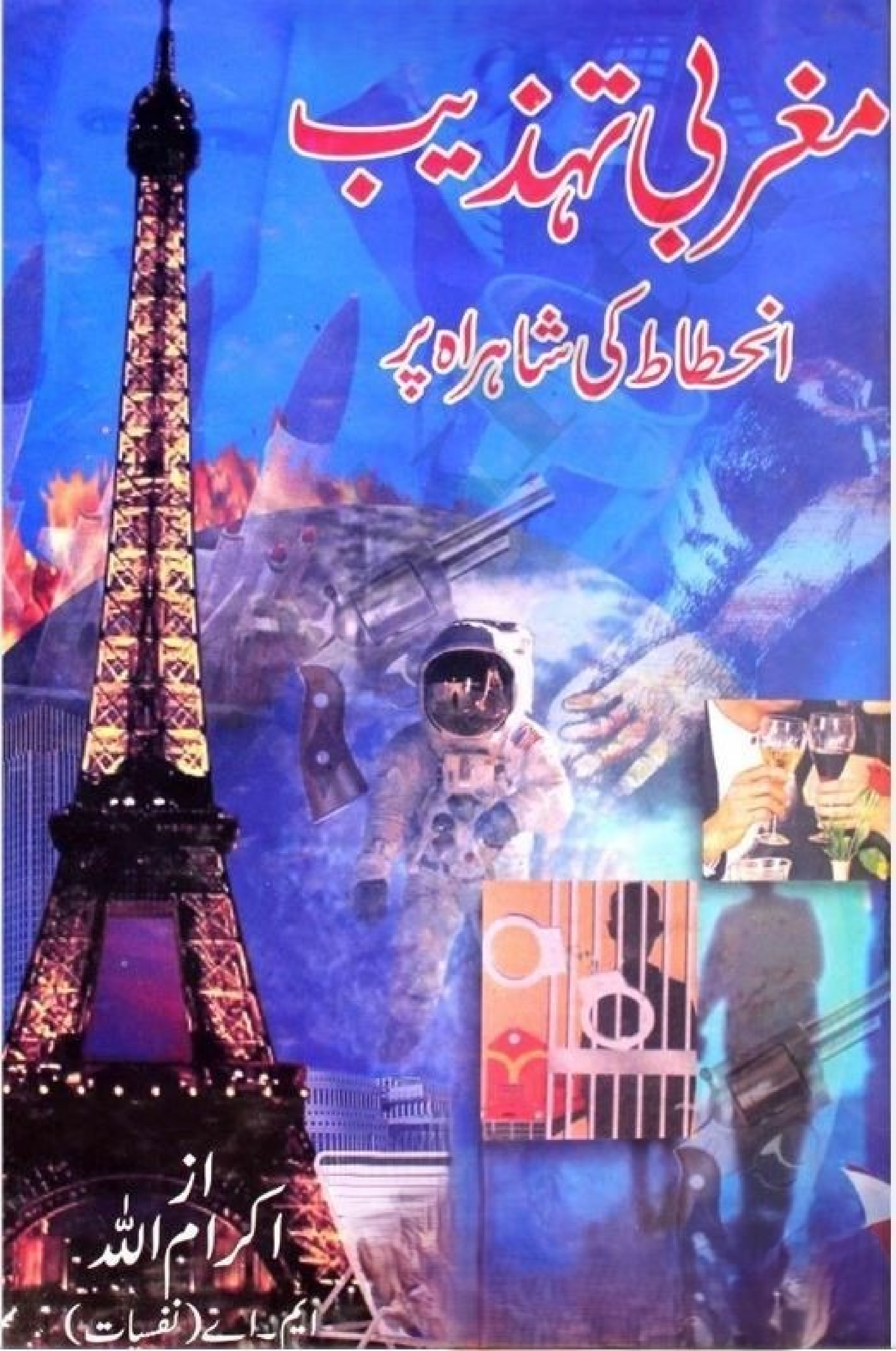
مغربی تہذیب

انحطاط کی شاہراہ پر



از

اکرام اللہ

ایم۔ اے (نفسیات)

مغربی تہذیب
انحطاط کی شاہراہ پر

MAGHRIBI TAHZEEB
INHETAT KI SHAHRAH PAR

از:
اکرام اللہ
ایم۔اے(نفسیات)

کتاب کا نام	:	مغربی تہذیب انحطاط کی شاہراہ پر
مصنف و ناشر	:	اکرام اللہ
سال اشاعت	:	۲۰۰۳ء
تعداد	:	چار سو (۴۰۰)
کمپوزنگ	:	ایپروچ کمپیوٹرز، لکھنؤ۔فون : 2623778
طباعت	:	پاریکھ آفسٹ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
قیمت	:	ایک سو بیس روپے Rs. 120

ISBN 81-900589-2-4

ملنے کے پتے:

اودھ بک سینٹر
96/130 گنیش گنج، لکھنؤ۔۱۸
فون : 2682180

ایجوکیشنل بک ہاؤس
3191 گلی عزیز الدین وکیل
کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی۔۶

الفرقان بک ڈپو
114/31 نظیر آباد، لکھنؤ۔۱۸
فون : 2270143

مکتبہ جامعہ
اردو بازار
جامع مسجد، دہلی۔۶

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد

میموریل کمیٹی

حکومت اُتر پردیش

لکھنؤ

کے

مالی تعاون سے

شائع ہوئی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

از

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

الحمدللہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی خاتم انبیائہ محمد الامین، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امابعد!

مغربی ممالک یوں تو عیسائی مذہب کے ماننے والی قوموں پر مشتمل ہیں اور شروع کے عیسائی مذہب پر عمل کرنے والوں میں ترک راحت اور زہد کو رہبانیت کی حد تک اختیار کرنے کا رواج رہا ہے، لیکن گذشتہ صدیوں میں وہاں مذہب کے خلاف بغاوت ہوئی اور مذہب کو عبادت خانوں کے اندر محدود کرکے عام زندگی سے خارج کردیا گیا اور عام زندگی کو ہر شخص کی محض اپنی سمجھ اور پسند کے تابع بنالیا گیا، چنانچہ آسمانی رہنمائی اور اخلاقی ودینی قدروں سے آزاد ہوکر اپنی پسند اور رجحان کی قدروں کو اختیار کیا جانے لگا، اس سے ان لوگوں کی سیرت واخلاق میں انارکی پیدا ہوگئی اور اس طرح کے رجحانات آہستہ آہستہ پیدا ہوتے گئے جو جانوروں کی آزادانہ زندگی میں پائے جاتے ہیں، بلکہ ان من مانے رجحانات کو ان کے اہل قلم نے بھی اپنی علمی وعقلی دلیلوں سے مناسب اور صحیح قرار دینا شروع کردیا لیکن حقیقت حقیقت ہوتی ہے، سیرت واخلاق کی انارکی نے جو نتائج پیدا کئے اور جو صورت حال بنی وہ بڑی ہولناک اور افسوسناک ہے، مشکل یہ ہے کہ یورپ کی جو بالادستی اس وقت دنیا پر قائم ہے اس کے پروپیگنڈے کے ذریعہ اس کے مذموم پہلو منکشف نہیں ہو پاتے، ان کے اخفاء کے ساتھ صرف چمکدار پہلو سامنے لائے

جاتے ہیں، اس کی وجہ سے مشرقی ممالک کی قومیں بھی مغربی زندگی کی خرابیوں میں ملوث ہوتی جارہی ہیں۔ یہ بڑی فکر کی بات ہے، اس زندگی کے خراب اور نقصان دہ پہلو چونکہ ہمارے مشرقی لوگوں کے سامنے عام طور پر نہیں آتے، اس لئے وہ اس پر دھیان نہیں دیتے، وہ صرف چمک دمک دیکھ کر اور اس طرح زندگی کو اچھا بنا کر پیش کئے جانے سے اچھا تاثر قائم کرلیتے ہیں۔

جناب اکرام اللہ صاحب نے مغربی زندگی کی سیرت واخلاق کے مذموم پہلوؤں کو اور ان کے نتائج کو معتبر طریقہ سے اور حوالوں کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا تاکہ وہاں کی زندگی کی بدنما تصویر سے ہمارے مشرقی ناواقف لوگ واقف ہوسکیں اور مغربی افکار اور مغربی تہذیب کی نقل سے بچنے کا سامان کرسکیں، اس کتاب سے اگر یہ فائدہ حاصل ہوجاتا ہے تو ہماری مشرقی اور اسلامی قدروں والی زندگی کو کسی نہ کسی حد تک اخلاقی انارکی سے بچایا جاسکتا ہے جو اس کا شکار ہونے کے راستہ پر ہے۔ میں اس حیثیت سے اس کتاب کو ایک مفید کوشش سمجھتا ہوں اور اس کے اس فائدہ کے حصول کی امید کرتا ہوں لیکن یہ کتاب دراصل صرف خواص اور اہل علم کے پڑھنے کی ہے، جو اس کی بنیاد پر اصلاح اور اچھی زندگی کی طرف رہنمائی کا کام لیں۔

محترم اکرام اللہ صاحب نے اس کتاب کی تیاری میں برسوں تلاش میں اور مستند حوالوں کے ساتھ تیار کرنے میں وقت صرف کیا ہے، میں ان کی اس محنت پر قدر کا اظہار کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اصلاح کا کام کرنے والوں کو اس کتاب سے مفید دلائل مل سکیں گے اور وہ اپنے اصلاحی کام میں ان سے مدد لے سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ مفید بنائے اور قبول فرمائے۔

کتبہ

محمد رابع حسنی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں، رائے بریلی

سنیچر، ۱۲؍شعبان ۱۴۲۳ھ

مقدمہ

مغربی تہذیب کا بنیادی ستون مادّیت ولادینیت ہے جس میں روحانی واخلاقی قدروں کو یکسر فراموش کردیا گیا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سائنس وٹکنالوجی کی حیرت انگیز ایجادات واکتشافات نے مادّی راحت وآسائش کی بے شمار ایسی چیزیں بنادیں جنہیں دیکھ کر عام انسان مرعوب ہوگئے اور اس تہذیب کے شیدائی اور پرستار بن گئے اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں اسی پر چلنے کو فلاح وکامیابی کی راہ سمجھنے لگے اور ملک کی ترقی کے لئے اسی کو ماڈل ماننے لگے لیکن مشرق کے دانشور اور ارباب بصیرت تمدن کی اس ظاہری چمک دمک سے مرعوب نہیں ہوئے اور اس کی خامیوں پر تنقید کرتے رہے، ایسی شخصیتوں میں ایک ممتاز شخصیت علامہ اقبالؒ کی ہے جنہوں نے اپنے زمانۂ قیام یورپ (۱۹۰۵-۱۹۰۸) میں اس تہذیب کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور اپنے عمیق مطالعہ نیز مشاہدہ کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو قوم 'فیضان سماوی' سے محروم ہو اس کے کمالات کی حد وبرق وبخارات تک ہی محدود رہتی ہے۔

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات

اس تہذیب کے ابتدائی خدوخال کو دیکھ کر ہی علامہ موصوف نے ایک صدی قبل ہی یہ پیشین گوئی کردی تھی۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

کسی بھی انسانی معاشرہ کی تشکیل میں قدریں (Values) نہایت

اہم رُول ادا کرتی ہیں۔ معاشرہ اپنے ارتقائی منازل میں ضروری قدروں کو اپناتا اور غیر ضروری کو ترک کرتا جاتا ہے لیکن کچھ بنیادی قدریں ایسی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے ہر معاشرہ میں اپنائی جاتی رہی ہیں اور اُن پر گامزن رہ کر ہی معاشرہ حقیقی ترقی کرتا ہے اسی سے معاشرہ میں نظم واستحکام برقرار رہتا ہے اور یہی افراد کی فلاح وبہبود کا ضامن ہوتی ہیں۔

گذشتہ چند صدیوں میں عالمی پیمانے پر قدروں میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں اور نئی نسل نے فرسودہ قدروں کو ترک کرنے کے سلسلہ میں اس قدر افراط سے کام لیا کہ بہت سی بنیادی اخلاقی قدروں کو بھی غیر ضروری اور فرسودہ قرار دیتے ہوئے پس پشت ڈال دیا جس کے نتیجہ میں معاشرہ میں انتشار وانانیت پھیل گئی۔ اقتصادی خوشحالی اور مادّی ترقی بذات خود اُن اخلاق قدروں کو پیدا نہیں کرسکتیں جو صحیح معنوں میں ایک صالح وصحت مند معاشرہ کے قیام وبقا کے لئے ضروری ہے۔ اخلاقی قدروں کی ناقدری اُن سے غفلت وبے توجہی برتتے ہوئے صرف مادّی خوشحالی کو نصب العین بنالینا معاشرہ کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔

اسٹاک مارکیٹس کسی بھی ملک کی اقتصادی خوشحالی کا بیرومیٹر ہوتے ہیں لیکن بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کا حل محض خوشحالی سے نہیں نکلتا جیسے خاندانی زندگی کا بکھراؤ، جنسی انارکی، کمسنی کے حمل، رشتۂ ازدواج کے باہر ولادتیں، طلاق وتفریق، جرائم وتشدد وغیرہ۔ امریکا جیسے خوشحال ملک کی ایک سرکاری کمیٹی نے (جس کے صدر ایس چارلس راب (S. Robb) تھے) متنبہ کیا کہ دس سے انیس سال کی عمر کے پندرہ فیصدی امریکی نوجوان منشیات، جرائم اطفال، نیز کمسنی کے حمل کی وجہ سے آگے چل کر کام کرنے کے لائق فرد (Productive Adult) نہ بن سکیں گے کیونکہ وہ معاشرہ سے الگ تھلگ (Alienated) ہوتے جارہے ہیں، صرف ریاستہائے متحدہ امریکا میں دس لاکھ کمسن لڑکیاں ہر سال حاملہ ہوجاتی ہیں، ہر ۹۰ منٹ پر ایک نوجوان خودکشی کرتا ہے اور کمسنی کے حمل (Teenage Pregnancy) میں ۱۹۶۰ء کے مقابلہ میں 109 فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اور قتل انسانی (Homicide) کی شرح میں سفید فاموں میں 232 فیصدی اور سیاہ فاموں میں 16 فیصدی کا اضافہ ہوا ہے! ان حقائق کا انکشاف کرتے ہوئے کمیٹی ہذا نے

یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ’’خاندان، کمیونٹی اور اسکول نیز سوشلائزیشن وانٹگریشن کے دوسرے ادارے اب ویسا کام نہیں کر رہے ہیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے‘‘۔

برطانیہ کی اقتصادی ومعاشرتی ریسرچ کونسل نے اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا کہ ’’آج کا برطانوی نوجوان سیاسی عدم شعور کا شکار ہے اور حد سے متجاوز نسلی امتیازات میں الجھا ہوا ہے اور بنیادی طور پر اپنے معاشرہ اور ماحول سے غیر مطمئن ہے‘‘ کونسل نے حکومت، اساتذہ اور چرچ کے حکام کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسی نسل وجود میں آرہی ہے جو بنیادی طور پر افسردہ (Frustrated) ہے۔ایک اوپنین پول سے منکشف ہوا کہ ’’برطانوی نوجوانوں کی بڑی اکثریت محبت اور دوستی سے بھی زیادہ دولت کو ترجیح دیتی ہے اور یہ یقین رکھتی ہے کہ ترقی کا انحصار دولت پر ہی ہے۔‘‘ عالمی ادارۂ صحت کا کہنا ہے کہ ’’آج کے نوجوان خود اپنی عادات واطوار سے خودکشی اور حادثات کا شکار ہو رہے ہیں اور جدید لائف اسٹائل انہیں مختلف امراض میں مبتلا کر کے ہلاکت وتباہی کی طرف لئے جا رہے ہیں‘‘۔

ریاستہائے متحدہ امریکا میں اموات کا سب سے زیادہ اضافہ نوجوانوں کے طبقہ میں ہوا ہے۔ پچھتر فیصدی موتیں قتل اور خودکشی کے سبب ہوتی ہیں جو اس امر کی جانب اشارہ کرتی ہیں کہ وہ خطرات سے کتنے زیادہ نزدیک ہیں، ان اموات میں ساٹھ فیصدی موتیں صرف حادثات سے ہوتی ہیں۔اخلاقی قدروں سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے وہ مادّیت میں پورے غرق ہوگئے ہیں اور زندگی کا واضح نصب العین اور اعلیٰ قدروں سے روشناس نہ ہونے کی وجہ سے وہ موقع پرستی اور سوقیانہ عادات واطوار میں الجھ کر رہ گئے ہیں، شراب نوشی اور ڈرگس کی لت، رکیک تفریحات اور آزادانہ لذت کوشی نے انہیں گمراہی کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

صحت مند نوجوان ہر معاشرہ کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔اقوام متحدہ نے کچھ عرصہ قبل ’’بین الاقوامی نوجوانوں کا سال‘‘ منایا تھا اس کا تھیم تھا "Healthy Youth Our Best Resource" اس وقت یہ بتایا گیا تھا کہ ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے نوجوان اب دنیا کی کل آبادی کا بیس فیصدی ہوگئے ہیں اور ان کی مجموعی تعداد ایک ارب پانچ کروڑ ہے۔دنیا کی تاریخ میں نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں تھی۔نوجوانوں کے اتنے

بڑے طبقہ کے سامنے اخلاقی قدروں کی پامالی کی وجہ سے گونا گوں اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کا حل ڈھونڈھنے میں دانشور، ماہرین سماجیات، اور ارباب بصیرت خود اپنے کو بے بس پا رہے ہیں۔ امریکا کے ایک بااثر ڈیموکریٹ میروکیمو (Mario Cuoumo) نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا کہ ’’امریکا کو سب سے بڑا خطرہ یہ لاحق ہے کہ وہ اپنے نوجوانوں کو اخلاقی قدروں کی اہمیت سمجھانے سے قاصر ہے‘‘۔

"Failure To Teach Values To The Young"

نوجوانوں کی کردار سازی میں خاندان اور تعلیمی ادارے سب سے اہم رول ادا کرتے ہیں۔والدین اور اساتذہ کے برتاؤ کا زبردست اور دیرپا اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ جن بچوں کو اپنے والدین کی بے پناہ شفقت ومحبت ملتی رہتی ہے وہ اسکول میں بھی راحت محسوس کرتے ہیں اور اپنی پڑھائی کی طرف بھی معقول توجہ دیتے ہیں۔ایسے بچے نہ شراب وسگریٹ کی لت میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ قبل از وقت جنسی اختلاط میں اور نہ ہی ان میں خودکشی کا رجحان پنپتا ہے ایسا ہی اثر اساتذہ کے کردار کا بچوں پر پڑتا ہے۔اگر خاندان اور تعلیمی ادارے صحیح انداز میں بچوں کی تربیت کریں تو بہترین کردار کے حامل نوجوان نشوونما پا کر نکلیں جو اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کر کے معاشرہ کی ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔لیکن آج ان دونوں محاذوں پر شدید افراتفری کا عالم ہے۔خاندان کا نظم واستحکام اور ڈسپلن کمزور ہوتا جارہا ہے اور تعلیمی ادارے بھی اپنے فرائض بہ خوبی انجام نہیں دے رہے ہیں، نتیجہ ہمارے سامنے ہے نوجوان گمراہی کے راستہ پر بھٹک رہے ہیں جس کے لئے خود بالغ افراد اور ان کی کارگزاریاں ذمہ دار ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ معاشرہ کی اقتصادی خوشحالی کی بنیادیں رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ صالح طرز زندگی کی بھی بنیادیں رکھنی چاہئیں۔ یہ سوچنا کہ پہلے صنعتی ترقی کو اپنا کر خوشحالی پیدا کر لی جائے اور اچھی زندگی یا عظیم معاشرہ کی تشکیل بعد میں ہوتی رہے گی یا از خود ہو جائے گی بڑی بھاری بھول ہے جسے اب مغربی مفکرین بھی تسلیم کرنے لگے ہیں۔دراصل ایک صالح پاکیزہ اور صحیح معنوں میں ترقی یافتہ معاشرہ کی تشکیل کے لئے یہ دونوں طریق کار ایک ساتھ عمل میں لائے جانا چاہئیں تب ہی متوازن اور خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکیں گے ورنہ وہی صورت حال ہوگی جو آج مغربی ملکوں کی ہے یعنی اقتصادی

اور صنعتی ترقی کے لحاظ سے بام عروج پر اور اخلاقی وروحانی اعتبار سے انحطاط کے قعرِ مذلت میں!

پیش نظر کتاب اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرتب کی گئی ہے کہ مغربی تہذیب کے اخلاقی انحطاط کا جائزہ لے کر یہ دکھایا جائے کہ اخلاقی قدروں سے انحراف نے ان کی تہذیب میں کیا گل کھلائے ہیں کیسے کیسے پیچیدہ مسائل سے معاشرہ کو دوچار کردیا ہے اور کس بحرانی دور سے ان کا معاشرہ گزر رہا ہے تاکہ ہمارے ایشیائی وافریقی ممالک جو بے تحاشا مغرب کی تقلید میں دوڑے جارہے ہیں وہ اُن خامیوں سے واقف ہوکر عبرت حاصل کرسکیں اور اپنے یہاں کے معاشرہ کی تعمیر میں اُن فروگذاشتوں سے کنارہ کشی اختیار کریں اور ایسے اقدام کریں کہ مغربی تہذیب کی خوبیاں تو اپنالی جائیں لیکن خرابیوں کو چھوڑ دیا جائے ان کے محاسن تو اپنی تہذیب میں ضم کرلئے جائیں لیکن معائب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے تاکہ ہمارے مشرقی معاشرہ میں وہ برائیاں نہ پیدا ہوں جو آج مغربی ملکوں کا مستقل دردِ سر بن گئی ہیں۔ مغربی تہذیب کے نبض شناس اور ترجمان حقیقت علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اکرام اللہ

لکھنؤ

۱۰ر فروری ۲۰۰۳ء

’’تمدن جدید نے انسانوں کو مذہبی اصولوں اور پاکی کی عائد کردہ تنظیمات سے آزاد کردیا ہے اور یہ انہیں ہر ممکنہ طریقہ سے حصولِ زر کی ترغیب دیتی ہے۔ موجودہ طرزِ زندگی انسانوں کو اکثر وبیشتر جنسی خواہشات میں مبتلا کرتی ہے اور جنسی بھوک کی آسان تسکین فراہم کرتی ہے۔ یہ مسلسل کوشش، تنظیم، جدوجہد اور ہر اُس چیز سے نجات دلاتی ہے جس میں مشکلات اور محنت ہو۔‘‘

ڈاکٹر الکسس کیرل
(Man the Unknown)

It is quite true that we North Americans using the capitalist System, have built the richest civilization the world has ever seen. We can boast of having the most cars, the highest skyscrapers, the fastest trains, the brightest city lights, the finest household gadgets- in a word, the biggest everything, including the biggest death rate from illegal operations, the largest number of immoral children, the most illegitimate babies, divorces and VD clinics.

"For what is a man profited" Christ reminded us," if he shall gain the whole world and lose his own soul".

(Dyson Carter)
SIN AND SCIENCE

حصہ اول

محرّکات

باب ۔ ۱

پورنوگرافی کا سیلاب

دور جدید کے آزاد معاشرہ کی ایک بدترین لعنت پارنوگرافی (Pornography) نے دوسری عالمی جنگ کے بعد سے بڑی تیز رفتاری سے بڑھ کر اب ایک وسیع کاروبار کی شکل اختیار کرلی ہے۔ جس کے غارت گرو تباہ کن اثرات معاشرہ کے ہر طبقہ میں رونما ہو رہے ہیں۔ انسانی جذبات کے برانگیختہ کرنے بالخصوص نوجوانوں کے جذبات میں شدید ہیجان پیدا کرنے میں فحش لٹریچر، عریاں تصاویر و اشتہارات کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اُن کے بٹھائے ہوئے نقوش ذہن پر بڑے گہرے ثبت ہو جاتے ہیں اور قارئین کے افکار و خیالات کو عرصہ دراز تک متاثر کرتے رہتے ہیں۔ کمسن بچوں اور نوجوانوں کے دل و دماغ پر خاص طور سے یہ اثرات زیادہ دیرپا ہوتے ہیں اور اُن کے خام ذہن ایسے لٹریچر کے مطالعہ اور عریاں تصاویر کے مشاہدہ سے عموماً کجروی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات انہیں جرائم کے ارتکاب پر بھی آمادہ کر دیتے ہیں۔

منحرف اور کج ذہنیت رکھنے والے افراد کو ایسے لٹریچر کی طلب ہر دور میں رہی ہے لیکن دور جدید میں اسے جس طرح پر منفعت کاروبار کی شکل دے کر پھیلا دیا گیا ہے یہ صورت انتہائی افسوس ناک ہے۔ گندی کتابیں، عریاں تصاویر، بلیو فلمیں، عریاں ٹیبولائڈ، جن میں سکس، تشدد قتل خون خرابا، مار دھاڑ اور جرائم کی بے باک عکاسی پیش کر دی جاتی

ہے اب معاشرہ کے ہر طبقہ میں پوری طرح پھیل گئی ہیں۔ فحش نگاری کا یہ غلبہ صرف لٹریچر ہی میں نہیں بلکہ مصوری و سنگ تراشی کے شاہکاروں، رقص و موسیقی کی دُھنوں، ریڈیو ٹیلی وژن کے پروگراموں، ڈراموں اور فلموں، پاپولر پریس و تجارتی اشتہارات میں۔ غرض اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں بھی افراد کی قوت سامعہ و باصرہ کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ پوری طرح سرایت کر گیا ہے اور اب اس کی خطرناک ضوریزی سے مفر کا کوئی امکان نہیں۔

امریکا کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایم۔ وی۔ کامتھ لکھتے ہیں:

''آج امریکا کے تمام ذرائع ابلاغ پریس کی آزادی کی آڑ میں انتہائی نازیبا و مخرب اخلاق چیزوں کی نمائش دھڑلے سے کر رہے ہیں جنہیں دیکھ کر شدید ناگواری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ خواہ کتابیں ہوں یا اشتہارات، رقص و موسیقی کے پروگرام ہوں یا اسٹیج پر دکھائے جانے والے تماشے ہر جگہ سکس کا بے باکانہ مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکا کے دماغ پر سکس چھایا ہوا ہے۔

"America seems to be having sex on its brains."

کچھ عرصہ قبل ہم نے ڈنمارک میں پھیلی ہوئی جنسی آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کچھ ہی دنوں میں یہ نئی جنسی آزادی مغرب کے پورے سرمایہ دارانہ معاشرہ میں پھیل جائے گی اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈنمارک کے جنسی میلہ کے تمام ناگفتہ بہ اُمور نہ صرف امریکا میں پوری طرح پھیل گئے ہیں بلکہ انتہائی مقبول ہو رہے ہیں۔''

''نیویارک ٹائمس'' نے اپنی ایک تازہ اشاعت میں اس امر کا انکشاف کیا کہ منہتان (Manhattan) کے علاقہ میں واقع کئی کلبوں میں زندہ افراد کے درمیان جنسی فعل تک کی بے جھجک نمائش کی جا رہی ہے اور پورنوگرافی کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں یہ نئی جدت کافی پسند کی جا رہی ہے۔ پہلے صرف Skin Movies، Peep Shows اور فحش کتابوں کی نمائش متعدد بک اسٹورس پر ہوتی تھی، یہ زندہ شو (Live Show) لنچ ٹائم میں بڑے مقبول ہیں اور مڈل کلاس کے اوسط عمر کے افراد پانچ ڈالر کی سیٹ خرید کر ان سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔''(۱)

(۱) Radiance، دہلی۔ October 25, 1970

فحش کتابوں کی بکری کھلے بندوں خوب دھڑلے سے ہو رہی ہے۔ وانس پیکارڈ لکھتے ہیں:

"پہلے جن کتابوں کو خفیہ طریقے سے کاؤنٹر کے نیچے رکھ کر فروخت کیا جاتا تھا اب اُنکی نمائش بے باکی کے ساتھ شوکیس میں کی جاتی ہے اور سیکڑوں نیوز اسٹینڈ پر ایسی کتابیں جن کے ٹائٹل 'Lust Jungle' 'Lust Teen' قسم کے ہوتے ہیں دیکھنے میں نظر آتی ہیں۔ امریکا کے کثیر الاشاعت مقبول میگزین "پلے بوائے" نے ۱۹۶۰ء سے رندانہ طرز زندگی کا ترجمان بنتے ہوئے عیش پرستانہ زندگی کی زبردست تبلیغ کرنے کی مہم اُٹھائی۔ فلسفہ کے ایک پروفیسر نے پیکارڈ کو بتایا کہ میں سقراط سے لے کر ہیفنر Hefner تک کے فلسفہ کو پڑھاتا ہوں۔ (ہیفنر "پلے بوائے" کے پبلشر ہیں جنھوں نے متعدد مضامین عریانیت کے فلسفہ کی پرزور حمایت میں لکھے۔) پروفیسر موصوف نے بتایا کہ "پلے بوائے" اس وقت بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور چونکہ طلباء اُسے پڑھتے ہیں اس لئے میں بھی اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔"

"پلے بوائے" برابر ترقی پر ہے۔ ۱۹۸۷ء میں اس کا سرکولیشن ۴.۳ ملین تھا اور منافع گیارہ ملین ڈالر سے بھی زیادہ۔ ۱۹۹۰ء سے تائی وان سے بھی اس کا ایڈیشن شائع کیا گیا لیکن عریاں تصاویر کی وجہ سے چین کی حکومت نے اُس پر پابندی عائد کردی۔ چھ سال بعد اسے دوبارہ نکالا گیا لیکن حکومت کی پالیسی کے تحت نسوانی جسم کے مخصوص اعضاء کو ڈھک دیا گیا۔ اب اس کی ۵۰ ہزار کاپیاں وہاں سے شائع ہوتی ہیں۔ (۱)

ایک مقتدر امریکی رسالہ نے جس کی اشاعت لاکھوں میں ہے اپنے ایک شمارہ میں یہ سوال اُٹھایا کہ ماڈرن سوسائٹی میں کیا کیا چیزیں سکس سے منسوب ہیں؟ میگزین، بل بورڈ، فلمیں، ٹی وی، ہالی ووڈ، نائٹ کلب، جٹ سٹ، کالج کیمپس، ہپی، کاریں، کشتیاں، لباس، سگار، بیئر، کولڈ پلز، معدہ کی پلز، شیونگ کریم، ڈیوڈورنٹ، ماؤتھ واش، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ فہرست پوری ہوگئی؟ نہیں ابھی تو یہ شروع ہی ہوئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے سوال کو یوں پیش کریں: ماڈرن سوسائٹی میں کیا چیز سکس سے منسوب

(1) Times of India, 12-6-1996

نہیں ہے؟ اس کا جواب دینا زیادہ آسان ہے، کوئی شے بھی نہیں!

سکس آج بہت بڑا بزنس بن چکا ہے۔ کوئی بھی نہیں جو اس سے فائدہ نہ اُٹھانا چاہتا ہو، ہر میدان میں اس سے نفع کمانے کے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ پہلے کچھ منحرف مزاج رکھنے والے اگمراہ اشخاص ایسے لٹریچر کی مانگ کرتے تھے لیکن آج سوسائٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں پورنوگرافی کی جو پذیرائی ہو رہی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی! ہائی کلاس فیشن ایبل بک اسٹورس "اڈلٹ لٹریچر" کے سکشن میں ایسی گندی اور گھناؤنی کتابوں کی نمائش کرتے ہیں جنکا تصور بھی کچھ عرصہ قبل نہیں کیا جا سکتا تھا اور بعض بک اسٹورس تو صرف ایسی ہی کتابوں کا دھندا کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی رسالہ نے اپنی حال کی اشاعت میں لکھا کہ پورے ملک میں فحاشی کا غلبہ (Erotic Invasion) ہوگیا ہے جس نے پوری قوم کو شدید طور پر جنسی انہماک، عریانیت کی نمائش، اور فحش موسیقی کی دُھنوں میں لپیٹ لیا ہے۔ فحاشی کا یہ زبردست سیلاب پورے ملک کے لئے شرمناک ہے۔

کامکس (Comics):

کامکس کی کتابیں جو بچوں اور کم سن نوجوانوں کے لئے تیار کی جارہی ہیں ان میں بھی فرضی قصوں اور کہانیوں کو ہولناک منظروں کے ساتھ باتصویر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی کتابوں میں جنس، دہشت اور جرائم کا غلبہ ہوتا جارہا ہے۔ تقریباً دس کروڑ ہزلیات کی کتابیں ہر ماہ ریاستہائے متحدہ امریکا میں فروخت ہوتی ہیں جن میں سے تقریباً ۲۵ فیصدی میں بڑی جسارت و بیباکی کے ساتھ جنس، دہشت اور جرائم کی عکاسی کی جاتی ہے۔ عریانی و فحاشی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کی بارہ سو میگزینوں میں گیارہ سو محض لڑکیوں کے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے نکلتی ہیں یا جرائم کی نئی شکلیں بتانے کے لئے پروفیسر سوروکن لکھتے ہیں:

"ایسی تحریروں میں جنس کا بہت زیادہ غلبہ ہوگیا ہے اور اُس نے بڑی بدنما صورت اختیار کرلی ہے۔ ایسے Sham لٹریچر کی اشاعت کا مقصد ہی قارئین کے ادنیٰ جذبات کو برانگیختہ کرکے تجارتی فائدہ اٹھانا ہے۔ ان میں جنسی مواصلات، عصمت ریزی اور دوسری جنسی ضلالتوں کو وحشیانہ ڈرامائی انداز میں پیش کیا جاتا ہے جو

پڑھنے والوں کو غیر انسانی صفات سے متصف کر کے ان کے اخلاق کو برباد کر دیتا ہے۔ یہ فحش لٹریچر ناولوں، رسالوں، مزاحیہ کتابوں اور کہانیوں کی صورت میں کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہوتا رہتا ہے اور ہم میں سے ہر ایک متواتر اس کی خطرناک خونریزی سے متاثر ہو رہا ہے۔''(۱)

امریکہ کے تحفظ اطفال بورڈ کے چیئرمین نے کہا کہ یکے بعد دیگرے ہزلیات کی متعدد کتابیں پڑھنے کے بعد بچوں کے خیالات پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ ہزلیات کی یہ کتابیں انتہائی شرمناک ہوتی ہیں۔ ان میں ذہانت کی توہین ہوتی ہے اور یہ بچوں کا دھیان ایک ایسی فرضی دنیا کی طرف موڑ دیتی ہیں جس کے بعد وہ زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے سے کترانے لگتے ہیں۔ والدین اگر خود ایسے لٹریچر کا پہلے مطالعہ کر لیں تو وہ ہرگز اپنے بچوں کو اسے پڑھنے کی اجازت نہ دیں گے۔ قدرتی طور پر سب ہی والدین اپنے بچوں کے صحت مند دماغ کی نشوونما کی توقع کرتے ہیں اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کوئی ماہر نفسیات داں بننے کی ضرورت نہیں کہ ان کے بچوں کے لئے اس سے بہتر مواد موجود ہے بجائے اس کے کہ وہ اپنا وقت اس خرافات کے مطالعہ میں ضائع کریں جس میں قتل و غارت اور جنسی کجرویوں کو خوشنما بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور قانون نیز قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کی تضحیک کی جاتی ہے۔

امریکی سینٹ کے ایک سابق ممبر کا کہنا ہے کہ ''جرائم کے یہ کامکس ہر قسم کی برائی، Sadism اور تشدد سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایسی کتابوں کا کاروبار اسی کروڑ ڈالر کے ارد گرد رہتا ہے۔''

ہزلیات کی کتابوں کے علاوہ دیگر فحش کتابوں، رسالوں ٹیبولائڈ فلموں کا کاروبار (\$8 Billion) ۸۰۰ کروڑ ڈالر کے ہوش ربا اعداد تک پہنچ چکا ہے اور اگر X اور R قسم کی عریاں فلموں، ڈراموں اور عریاں لباس پیراکی وغیرہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو عریانیت کے اس عظیم کاروبار کی میزان کئی سو بلین ڈالر تک پہنچ جائے گی۔

امریکی سپریم کورٹ میں ایک بار نیویارک کے کتب فروشوں کے ہاں سے ننگی اور شہوت انگیز کتابوں اور تصویروں کو پیش کیا گیا تو جج نے انہیں دیکھ کر کہا کہ ''نیویارک تو

---

(۱) Sane Sex Order, P. Sorokin ص ۲۲

سدوم اور عمورہ بنتا جا رہا ہے۔'' ایک عدالت کے شیرف Sheriff نے کہا کہ ''پورنوگرافی ہمارے کلچر کا جز بن چکی ہے۔''

Pornography is part of our culture.

نیویارک کی ۴۲ ویں اسٹریٹ - ایک رستا ہوا ناسور

امت اگروال لکھتے ہیں کہ نیویارک سکس میں لت پت ہے۔ یہاں کی ۴۲ ویں اسٹریٹ پر چلتے ہوئے بہ مشکل آپ کو پانچ منٹ ہوں گے کہ کوئی نہ کوئی گتھم گتھا یا لڑائی جھگڑے کا منظر ضرور سامنے آ جائے گا جس میں بوتلیں فضا میں اڑتی ہوئی اور پولیس گاڑیوں کے سائرن سنائی دیں گے۔ تین ڈالر دے کر آپ چوبیس گھنٹوں میں چار بلیو فلمیں دیکھ سکتے ہیں اور پچیس سینٹ دیکر آپ ویڈیو پر ۶۰ سکنڈ کی بلیو فلم دیکھ سکتے ہیں۔ عریاں عورتوں اور مردوں کی تصاویر جن میں شرمناک حرکات کا اعادہ کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے آسانی سے مل جاتی ہیں۔ عریاں ماڈل بے جھجک ایسی تصاویر کھنچواتی ہیں جن میں نسوانی جسم کے نشیب و فراز کو پوری طرح دکھایا جاتا ہے اور ایسے رسالے و رنگین پوسٹ کارڈ بے پناہ مقبول ہیں جن میں دونوں صنف کے افراد کو جسمانی اتصال کے مختلف پوزز میں دکھایا جاتا ہے۔ ٹائمس اسکوائر کے علاقے میں ۴۰۰ پیپ شو مشینیں نصب ہیں جن میں رنگین عریاں فلموں میں جوڑوں کو جنسی ملاپ کے مختلف زاویوں سے دکھایا جاتا ہے۔ امریکی قوانین میں اس قسم کی عریانیت پر گرفت کا کوئی جواز نہیں اس لئے پولیس اپنے کو بالکل بے بس پاتی ہے۔(۱)

امریکا میں متعدد ایسی تنظیمیں ہیں جو اس نظریہ کی تشہیر کر رہی ہیں کہ کم سن بچوں سے بدفعلی ہرگز مذموم نہیں بلکہ ان کی مناسب تربیت اور نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ کیلیفورنیا میں ایک ایسی ہی تنظیم نے اپنے لیٹر پیڈ پر یہ سلوگن لکھوا رکھا ہے :

Sex Before Eight or its' too Late

ہاوسٹن کے ایک چھاپے میں ہزاروں کلر سلائڈ ایسی ملیں جن میں کم سن بچوں اور بچیوں کے ساتھ جنسی بدفعلی کی نمائش کی گئی تھی۔ چائلڈ پورنوگرافی کے خلاف متعدد رفاہی انجمنیں برابر آواز اٹھا رہی ہیں لیکن پریس کی زبردست لابی انہیں برابر ناکام کرنے کی

---

(۱) Times of India, Feb. 1988

کوشش کرتی رہتی ہے۔

برطانیہ میں پورنوگرافی کو فروغ

برطانیہ میں فحش کا یہ کاروبار پورے فروغ پر ہے۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والا امریکی میگزین ''پلے بوائے'' نے نسوانی جسم کی بھرپور نمائش کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ''پلے گرل'' اور وائیوا (Viva) کی اشاعت نے اس خیال کی تردید کردی ہے کہ عورتیں عریاں مردوں کو دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ یہ دونوں رسالے مردوں کے برہنہ فوٹو اپنے صفحات میں چھاپتے ہیں۔ ''پلے گرل'' جس کی ابتدا چھ لاکھ کاپیوں سے ہوئی صرف آٹھ ماہ میں ہی اُس کا سرکولیشن ۲۶ لاکھ تک پہنچ گیا اور اس طرح اس نے دنیا کے رسالوں میں سرکولیشن کا ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا۔

رائل کورٹ آف جسٹس کے سامنے ہی ایسے عریاں رسالوں، فوٹو کارڈس، اور فحش مضامین والے میگزین کی بکری جاری رہتی ہے۔ تقریباً بیس سے زائد ایسے رسائل ہیں جو عریانی وفحاشی کے اس کاروبار میں لاکھوں پاؤنڈ کا نفع کمارہے ہیں۔ انڈر گراؤنڈ پریس کے مٹیریل (Material) کی تقسیم کا کام لندن کی معروف فرم مور ہارنس (Moore Harness) کرتی ہے جو تقریباً ۷۰ ٹائٹل ہینڈل کرتی ہے اور جسکا سالانہ ٹرن اوور چھ لاکھ پاؤنڈ کے ارد گرد ہوتا ہے۔ مسٹر مور جو اخبار لے جانے والی ایک گاڑی کے ڈرائیور تھے جنھیں ۱۲ پاؤنڈ فی ہفتہ اُجرت ملتی تھی اب ۳۵۰۰ پاؤنڈ سالانہ کمارہے ہیں! سب سے کثیر الاشاعت ''فورم'' (Forum) ہے جو ڈھائی لاکھ پاؤنڈ سالانہ کا نفع کمارہا ہے۔ In Depth، Open اور Search میں ہر ایک کا سرکولیشن پانچ ماہ کے اندر ہی ۴۵ ہزار سے اوپر ہوگیا ہے۔ بڑے سائز کے میگزین Heat Curious اور New Direction رنگین عریاں تصاویر چھاپتے ہیں۔ ''پرائیویٹ آئی'' (Private Eye) کا سرکولیشن ۵۷ ہزار ہے۔ اس نے اپنے مضامین پر طبی ومعاشرتی معلومات کا پردہ ڈال رکھا ہے لیکن دراصل یہ بھی عریانیت کے فلسفہ کا علمبردار ہے۔

مساوات صنفین اور پرمیسیونس (Permissiveness) کے اس دور میں خواتین کے ذریعہ نکالے جانے والے متعدد رسائل بھی ایسی عریاں تصاویر سے بھرے

ہوتے ہیں اور کئی کثیر الاشاعت رسالوں کے مالکان کا کہنا ہے کہ Sex served with sauciness ہی کامیابی کا راز ہے۔ امریکی میگزین ''کاسموپالیٹن'' کا برطانوی ایڈیشن اور ''پنٹ ہاؤس Penthouse'' (سرکولیشن ۲۰ لاکھ) کے پبلشر کا کہنا ہے کہ ان رسالوں کی ۳۰ فیصدی خریدار عورتیں ہوتی ہیں جو لوگوں کے معیار جمال کا پتہ لگانے کے لئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کیسا جسم، گیسو، اور رنگ روپ رکھنے والی خواتین پسند کی جاتی ہیں ان رسالوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔''

برطانیہ کی کونگیٹ (Conegate) کمپنی جو متعدد عریاں رسالے شائع کرتی ہے اور جس کی سو سے زیادہ ''سکس شاپس'' پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، ہر سال دس ملین پاؤنڈ کا بزنس کرتی ہے۔ اس کمپنی کے علاوہ تقریباً سوا سو ایسی فرمیں ہیں جو ڈاک کے ذریعہ اپنا کاروبار کرتی ہیں اور لاکھوں افراد اُنکی میلنگ لسٹ میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون ملک کی کمپنیاں ۱۵ ملین پاؤنڈ کا سامان ہر سال برطانیہ کو اسپورٹ کرتی رہتی ہیں۔

برطانیہ کے ٹیبولائڈ اخبارات جن میں چھ روزنامے ہیں اور چھ ہفتہ وار جنسیات، جرائم اور کھیل کود کی خبریں شائع کرتے ہیں اور ان کا سرکولیشن سنجیدہ اخبارات مثلاً ٹائمز، گارجین اور ڈیلی ٹیلیگراف سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا رہتا ہے۔ ایسے ٹیبولائڈ اخبارات میں ایک مشہور اخبار ''اسٹار'' جس نے اب اپنے صفحات میں عریاں 'پن اپ' دوشیزاؤں کے فوٹو اور زیادہ بڑھادئے ہیں اور خود برطانیہ کے اہل صحافت اب یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ٹیبولائڈ جرنلزم کی حد سے نکل کر ''سافٹ پارنوگرافی'' کی طرف بڑھ گیا ہے۔ خود 'اسٹار' میں کام کرنے والے صحافیوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور سات صحافی تو احتجاجاً مستعفی ہوگئے۔ ''اسٹار'' کے نئے صحافی ایڈیٹر مائکل کیبرٹ کا کہنا ہے کہ وہ ٹیبولائڈ اخبارات کی خرید کرنے والی پبلک کو وہ دے رہے ہیں جسے وہ چاہتی ہے۔ اخبار کے نئے فارمیٹ کی وجہ سے اسکا سرکولیشن تین ہفتوں میں ستر ہزار بڑھ گیا۔

جنس اور جرائم کی آمیزش پر ہی آجکل کے کامیاب اخبارات ورسائل کا انحصار ہے، اور وہی اخبارات کثیر الاشاعت ہیں جن میں سنسنی خیز خبریں، شہوانی داستانیں، چٹ پٹے قصے وکہانیاں، فضیحتے نیز طلاق وتفریق کے واقعات نمایاں تصاویر کے ساتھ پیش کی جائیں۔ یہ عام رسائل کے مقابلہ میں پانچ چھ گنا زیادہ قیمت رکھنے کے باوجود کثیر تعداد

میں فروخت ہو جاتے ہیں اور پبلشر کثیر منافع کما لیتے ہیں۔ برطانیہ کے دو روزنامے ''ڈیلی مرر'' اور ''ڈیلی اسٹار'' زبردست مقابلے میں لگے ہیں اور ایسا مواد حاصل کرنے کے لئے ۵۷ سے ۹۵ ہزار پاؤنڈ تک دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ''ڈیلی مرر'' کا روزانہ کا سیل ۳٫۶۵ ملین اور ''سن'' کا ۳٫۸۵ ملین کاپیاں ہیں!

ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا مشہور عریاں وفحش ناول ''لیڈی چیٹرلیز لور'' Lady Chatterley's Lover جس کی اشاعت پر عرصہ دراز سے پابندی لگی ہوئی تھی، ۱۹۶۰ء میں ایک برطانوی پبلشر نے عمداً اسے چھاپ دیا کہ اشاعت کی اس پابندی کو برطرف کرانے کا موقعہ نکل آئے۔ عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی اور بالآخر بارہ افراد پر مشتمل جیوری نے یہ فیصلہ دیا کہ کتاب فحش نہیں ہے اور ایک مشہور و معروف مصنف کے قلم سے لکھی جانے کی وجہ سے اعلیٰ ادبی خوبیوں (High Literary Merit) کی حامل ہے۔ لہٰذا اسکی اشاعت کی اجازت ہونا چاہئے۔ عدالت کے اس فیصلہ کی خوب داد و تحسین دی گئی اور ایک سال کے اندر ہی اس کی تعداد اشاعت ۳۵ لاکھ تک پہنچ گئی۔ گویا مہذب دنیا میں بائبل کے بعد دوسرے نمبر پر اشاعت سب سے زیادہ اسی کتاب کی ہے۔

جاپان

جاپان میں ایسے فوٹو میگزین بڑی کثرت سے شائع ہوتے ہیں جن میں عریاں نسوانی تصاویر میں جسم کے نشیب وفراز کو خوب اُجاگر کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں وہاں فوکس (Focus) نام سے ایک نیا رسالہ نکلنا شروع ہوا جس نے انتہائی بے باکی کے ساتھ ننگی تصاویر، فضیحتوں اور چٹ پٹی داستانوں کو چھاپنا شروع کیا۔ اسکے بعد چار اور ایسے ہی رسالے شائع ہونے لگے۔ اب ایسے فوٹو میگزین کی بکری ہر ہفتہ پانچ ملین ڈالر سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان رسالوں میں اسٹرپ تیز رقص کی تصاویر، ٹوکیو کے Sadomasochism کلب کے قصے خوب چھاپے جاتے ہیں۔ ان رسالوں کے ایڈیٹر Public's Right to Know کا سہارا لے کر ان کی اشاعت بڑھانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں حالانکہ کچھ سنجیدہ صحافی اس بڑھتی ہوئی آزادی سے نالاں ہیں لیکن انکی کوئی سنتا ہی نہیں۔ (۱)

---

(۱) Tinmes of India, 18-12-86

ہنگری

۱۹۹۰ء میں ہنگری سے کمیونسٹ حکومت کے ختم ہوتے ہی وہاں جنسی آزادی کی باڑھ اتنی تیزی سے آئی کہ اب اسے مغرب کا بینگ کاک اور بلیو فلموں کا ہالی ووڈ کہا جانے لگا ہے۔ بوڈاپسٹ میں اچھے فلم ٹیکنیشین نسبتاً کم اجرت پر مل جاتے ہیں اور بڑی تعداد میں خوبصورت عورتیں ایسی فلموں میں کام کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہیں۔ وہاں خوبصورت قدرتی مناظر بھی کثرت سے ہیں، ان تمام اسباب کی وجہ سے یہ ''پارنو ورلڈ'' کا مرکز بن گیا ہے جہاں جگمگاتے ہوئے ہوٹل، نائٹ کلب، پیپ شو اور مساج پارلر بڑی تعداد میں کھل گئے ہیں اور تقریباً ۱۰۰ پورنو فلمیں ہر سال تیار کی جاتی ہیں۔ جنسی ٹورازم اور بیسوائی بوڈاپسٹ کی اقتصادیات کا لازمی جز بن گئی ہیں۔ ہنگری میں پورنو فلموں کے مشہور پروڈیوسر کا کہنا ہے کہ ''پورنو فلمیں بھی کنزیومر گڈس ہیں، آپ پسند کریں یا نہ کریں لوگ انہیں چاہتے ہیں۔'' صرف چائلڈ پارنوگرافی پر پابندی ہے، باقی ہر چیز کی کھلی چھوٹ ہے۔ ہنگری کی طرح فرانس بھی سو پورنو فلمیں ہر سال تیار کرتا ہے، تقریباً دو سو فلمیں اٹلی میں شوٹ کی جاتی ہیں اور اس کی پانچ گنی جرمنی میں بنائی جاتی ہیں۔ حالانکہ رومن کیتھولک چرچ اور کچھ دوسرے سنجیدہ افراد اس کاروبار پر روک لگانے کی موافقت میں ہیں لیکن ابھی تک کوئی قانون اس سلسلہ میں بنایا نہیں جا سکا۔ (۱)

جرمنی

جرمنی میں ویڈیو پارنو فلموں کا کاروبار خوب فروغ پر ہے۔ ایس۔ این۔ گھوش (سابق ایڈیٹر پائنیر) اپنے سفرنامہ جرمنی میں لکھتے ہیں کہ ''سکس شاپس اور سکس بازار جہاں ہر قسم کے فحش سامان (Weird Contraptions) اور پارنوگرافک لٹریچر کھلے عام مل جاتا ہے، جرمنی کے ہر بڑے شہر میں منظر عام پر نظر آ جاتے ہیں۔ نان اسٹاپ سکس شوز۔ جو ہر مشرقی کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ہر بڑے شہر کی رونق بنے ہوئے ہیں۔ نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے کو ان چیزوں نے تباہ کر دیا ہے۔''

---

(۱) Times of India, 6-5-1996

اٹلی

اٹلی کے بک اسٹالوں پر پرشہوت میگزینوں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ پولیس کی گرفت کے باوجود پورنوگرافی کی انڈسٹری پنپ رہی ہے۔ سستی قسم کی پورنوگرافی نے بانگ کانگ پر بھی دھاوا بول رکھا ہے۔ یہ لٹریچر کثرت سے اسکولی بچوں تک پہنچ رہا ہے اور ان کے اخلاق کو تباہ کر رہا ہے۔ لڑکے ولڑکیاں چاکلیٹ کی قیمت ساٹھ سینٹ میں اُنہیں خرید کر شوق سے پڑھتے ہیں اور پھر "اصل شے" کی تلاش میں قحبہ خانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

چین

چین میں تقریباً ۱۵ سکس شاپس اور ۴ ہزار اسٹور ہیں جہاں مانع حمل آلات نیز جنسی ہائی جین سے متعلق دوسرے سامان فروخت کیے جاتے ہیں لیکن اِن دوکانوں پر پس پردہ پورنوگرافی کا بزنس بھی کیا جا رہا ہے۔ عریاں ٹیبولائڈس فلمیں چین کے دیہاتی علاقوں تک میں اِنہیں شاپس کے ذریعہ پہنچ رہی ہیں۔ حالانکہ حکومت سختی سے پورنوگرافی کے خلاف کارروائی کرتی ہے لیکن دوسرے ملکوں سے ریکٹ یہ کام برابر کرتے رہتے ہیں اور ایسے کیسٹ وہاں چوری چھپے پہنچاتے رہتے ہیں۔

پورنوگرافی کے اس کاروبار نے بین الاقوامی صورت اختیار کر لی ہے اور اس میں زبردست نفع کو دیکھتے ہوئے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں تیار شدہ فلمیں، ویڈیو کیسٹ، پوسٹر اور کارڈس تیسری دنیا کے ملکوں کو خفیہ طور پر اکسپورٹ کیے جا رہے ہیں۔ کناڈا نے اپنے یہاں ایسے میٹریل کی درآمد سے پابندی ہٹا دی ہے۔ ہندوستان میں بھی صرف ملکی کاروبار بیس ملین روپے کے اردگرد ہو گیا ہے۔ کولمبو میں فحش کارڈس کا سیل کھلے بندوں کیا جا رہا ہے۔(۱)

مصوری وسنگ تراشی

جدید مصوری وسنگ تراشی میں بھی عریانیت وشہوت انگیزی کا عنصر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر سوروکن کا کہنا ہے کہ "سنجیدہ مغربی مصوری وفن سنگ تراشی بیسویں صدی کے قبل جنسی رجحانات سے تقریباً بالکل مبرا تھی لیکن جیسے جیسے ہم اپنے دور کی طرف

---

(۱) Times of India, 16-6-96

بڑھتے ہیں اتنا ہی تصویروں اور مجسموں میں جنسی رجحان کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اور مناظر زیادہ سے زیادہ فحش، عریاں اور شہوانی ہوتے جاتے ہیں۔" پروفیسر موصوف دو لاکھ تصویروں اور مجسموں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اٹھارویں صدی کے بعد کی تصاویر ومجسموں میں اس پہلو کی عکاسی بتدریج بڑھتی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ہم ایک ایسے ماحول میں رہ رہے ہیں جہاں فحش، عریانیت وشہوانیت کا زبردست غلبہ ہے۔"

پیرس میں خوبصورتی کے لئے جتنے بھی بت بنائے گئے ہیں اُن میں نوے فیصدی عورتوں کے ہیں اور اُن میں بھی ۹۵ فیصدی برہنہ عورتوں کے۔ عورت کے ایک ایک انگ کو انہوں نے اس طرح نمایاں کیا ہے کہ شرم وحیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اٹلی کے تاریخی شہر پامپئی میں دیوتا اور دیویاں جس عریانی وفحاشی کی حالت میں دکھائی گئی ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہوت رانی کے مجسمے ہیں۔ اٹلی میں ایک نئی وضع کے ٹائل تیار کیے گئے جنہیں جوڑ دینے پر عریاں دوشیزاؤں کی تصویریں بن جاتی ہیں۔ لوگ شوق سے اپنے باتھ روم کی زینت ان ٹائلز سے بڑھا رہے ہیں۔

فرانس میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی فلمی جشن میں ایک اطالوی مصور نے دنیا کی مشہور ترین ایکٹرسوں کی بالکل عریاں تصویروں کی نمائش کر کے ہلچل مچا دی۔ مصور کا کہنا تھا کہ میں نے اپنے تخیل میں ان کو برہنہ دیکھتے ہوئے یہ شاہکار تیار کیے۔ تصویروں پر خریدار ٹوٹے پڑ رہے تھے اور بعض کی قیمت ۴۰ ہزار روپے تک پہنچی!

لائٹ اور مارٹیمر اپنی کتاب "یو۔ایس۔اے کانفی ڈینشل" میں لکھتے ہیں کہ لاس اینجلس میں بہت سی لڑکیوں کا ذریعہ معاش ہی آرٹ کلاسوں میں جا کر برہنہ فوٹو کھنچوانا ہے۔ وہ اس مقصد کیلئے اخباروں میں اشتہارات بھی دیتی رہتی ہیں اور متعین مقامات پر ایسے برہنہ گروہ جمع بھی ہوتے ہیں۔ (ص ۱۶۴)

واشنگٹن کی یونیورسٹی آف میڈیسن میں متحرک کیمروں سے صنف اناث طالبات، فیکلٹی ممبران کی ازواج اور دوسرے والنٹیر کے فوٹو اُن کے انتہائی پرمسرت لمحات کے لئے جاتے ہیں۔ میونخ میں دوشیزاؤں کے عریاں فوٹو کی ایک نمائش منعقد ہوئی جسے دیکھنے کے لئے بڑی تعداد میں لوگ آئے اور 36 DM کی قیمت میں فروخت ہونے

والے البم گیارہ ہزار کی تعداد میں بک گئے۔ ایک روسی صحافی نے اپنے سفر امریکا کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک شام واشنگٹن کے ایک ایسے اسٹور میں داخل ہوئے جس پر ''صرف بالغوں کے لئے'' کا بورڈ آویزاں تھا وہاں جو کچھ دیکھا اسے دیکھنے کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوا گویا وہ کسی گندے چشمہ سے نکلے ہوں۔ یہ گندگی جنسی تعلیم کی آڑ میں یورپ سے آئی اور اب پورے امریکا پر حاوی ہو چکی ہے۔ اور اب یہ چشمہ بڑھ کر پورا مسی سپی دریا بن چکا ہے۔

"Love as it is commonly understood is being debased into sexual orgies by a section of Americans."

اشتہارات میں جنس کا غلبہ

موجودہ دور میں خبر رسانی اور رائے عامہ کو متاثر کرنے کے زبردست حربے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ہیں۔ ان میں دئے جانے والے اشتہارات لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ کنزیومر گڈس کو بھی فروغ دیتے ہیں حالانکہ اب الیکٹرانک میڈیا زیادہ وسیع ہو گیا ہے لیکن چھپے ہوئے اشتہارات کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور پرنٹ میڈیا میں اشتہارات پر خرچ کی جانے والی رقم اب بھی ریڈیو ٹی وی کے مقابلہ میں کئی گنا زائد ہوتی ہے۔ اوپنین ریسرچ کارپوریشن نے نیویارک میگزین پبلشرز ایسوسی ایشن کے لئے ایک سروے یہ معلوم کرنے کے لئے کیا کہ معلومات اور یوزایبل آئی ڈیاس (Usable Ideas) پر کس میڈیا کا زیادہ اثر پڑتا ہے تو یہ پتہ لگا کہ لوگوں کی معلومات بڑھانے اور یوزایبل آئی ڈیاس کے پھیلانے میں اب بھی میگزین موثر ثابت ہو رہے ہیں اور نوجوان، بہتر تعلیم یافتہ متول اشخاص اب بھی کنزیومر گڈس کی خریداری کے لئے میگزین کے اشتہارات سے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ آج دنیا ڈھائی سو بلین ڈالر ہر سال اشتہارات پر خرچ کرتی ہے۔ ہندوستان میں پندرہ سو کروڑ روپئے پریس کے اشتہارات پر ہر سال خرچ کئے جاتے ہیں اور دوردرشن نے ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۳۹۸٫۰۲ کروڑ روپئے اور آل انڈیا ریڈیو نے ۳۰٫۶۴ کروڑ روپئے اشتہارات سے حاصل کئے۔

صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں اشتہارات کا کتنا زور ہے اور یہ کس

طرح ان کی زندگی کے تانے بانے میں داخل ہو چکے ہیں اس کی تفصیل پروفیسر مجیب صاحب اپنے سفر امریکا کے تاثرات میں یوں بیان کرتے ہیں:

''شہروں کو روشن و رنگین اشتہاروں سے اس طرح سجایا جاتا ہے کہ گویا زندگی اور کاروبار کی آبرو اسی میں ہے۔ اخباروں اور رسالوں کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ اشتہار دئے جا سکیں۔ یورپ میں یہ عیب بہت نمایاں ہے۔ متحدہ ریاستوں (امریکا) میں یہ عیب ایک ذہنی بیماری کی حد تک پہنچ چکا ہے۔.........

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نامناسب اشتہاری تصویروں کی مخالفت کرنا آزادی اور جمہوریت کا گلا گھونٹنا ہے۔''

سرجی جراسیمو اپنے سفر امریکا کے تاثرات ''لٹریری گزٹ'' میں قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عریاں عورت کا جسم امریکی تجارت کا نشان یا قومی ٹریڈ مارک ہے۔ عورتوں کی تصاویر سے - عریاں یا نیم عریاں، لباس اتارتے ہوئے یا پہنتے ہوئے - نہ صرف یہ کہ فلمیں بھری رہتی ہیں بلکہ رسالوں کے صفحات، ہوٹل، ریفریجریٹر، چیونگ گم غرضکہ ہر وہ چیز جو تاجروں کے خیال میں امریکی باشندوں کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ امریکی اشتہاروں کی ناشائستگی ناقابل بیان ہے۔''

برطانیہ کے مشہور ماہر سماجیات ریورڈ پال کرین نے ''ورلڈ میگزین'' میں لکھا کہ ''برطانیہ کے ذہن پر جنس کا غلبہ ہے۔ اشتہارات اشیاء کی فروخت کے لئے ہمیشہ جنس کو بطور ایک آلہ کے استعمال کرتے ہیں۔ یہ متواتر ہیجان انگیزی برطانیہ میں جنس کو افسوس ناک حد تک پست کرنے کا باعث ہو رہی ہے۔'' موصوف نے اس موضوع کو اسکولوں میں مثبت طور پر پیش کئے جانے کی تائید کی تا کہ لوگ محبت اور ازدواج کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکیں اور یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ بس ہم جنس کے اس کاروباری تنزل سے عاجز آ گئے۔

"We've had enough of this Commercialised Degradation of sex."

مشہور ہوائی کمپنی بی۔او۔اے۔سی کے ایک تجارتی اشتہار میں ایک حسین

دوشیزہ کو ساحل سمندر پر بکنی پہنے غسل آفتابی لیتے ہوئے مسکرا کر Wish you were here کاش آپ یہاں ہوتے، کہتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ اشتہار اتنا عریاں تھا کہ معاملہ پارلیمنٹ میں اٹھایا گیا اور وزیر ہوابازی سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنے تجارتی اشتہارات کے اخلاقی معیار کو بہتر بنائیں۔ اسی طرح معروف روزنامہ ''لندن ٹائمز'' جو اشتہارات کے معاملہ میں کافی محتاط رویہ رکھتا ہے، نے بھی اپنی ایک اشاعت میں ایک عریاں دوشیزہ کی تصویر چھاپ دی جسے ایک ملائم فر کے سفید قالین پر بازو اٹھائے ہوئے آرام کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

موجودہ صارفی معاشرہ میں کنزیومر گڈس کی بکری کو فروغ دینے کے لئے اشتہاری کمپنیوں نے نسوانی جسم کو ہی مرکز توجہ بنا رکھا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک شخص ایک لیڈی ڈاکٹر سے بات چیت کر رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ ''ہاں میں گائناکولوجسٹ ضرور ہوں لیکن اگر آپ نسوانی جسم کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہیں تو آپ میرے شوہر سے بات کرلیں جو ایک اشتہاری ایجنسی کے سربراہ ہیں۔''

آزاد معاشرہ میں کاروبار کو فروغ دینے کے لئے ہر طریق کار اپنایا جاتا ہے۔ ہوٹل انڈسٹری نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ اپنے مسافروں کو کلوز ڈسرکویٹ ٹی وی پر پورنو فلمیں دکھائیں تو مسافروں کی تھکن بھی دور ہو جائے گی اور وہ منافع بھی کما سکیں گے۔ چنانچہ کیلیفورنیا کے کچھ ہوٹلوں نے اسکی ابتدا کی اور دھیرے دھیرے یہ سہولت امریکا کے تمام ہوٹلوں میں پھیل گئی۔ ایسے کمروں کا کرایہ زیادہ ہونے کے باوجود لوگ اسے شوق سے بک کراتے ہیں۔ کئی مغربی ملکوں میں ایک نئی جدت ہوٹلوں میں Dial-A-Porn کی سہولت ہے جس میں آپ تنہائی میں جنس کے موضوع پر صنف نازک سے آزاد و بیباک گفتگو، ہنسی مذاق (Dirty Jokes) کر سکتے ہیں۔ یہ کاروبار انتہائی نفع بخش ثابت ہو رہا ہے۔ کارلن کمیونی کیشن ہر ماہ ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر کا نفع کما رہا ہے اور ہر ماہ ۶۰-۷۰ لاکھ افراد اس سہولت کا استعمال کرتے ہیں۔ دوسری کمپنی Pacific Bell نے ایک لاکھ ۳۵ ہزار ڈالر کا منافع کمایا۔

انٹرنیٹ پر فحش پروگرام

انٹرنیٹ جیسی مفید ایجاد کا بھی استعمال فحش جنسی پروگراموں کے لئے کیا جا رہا ہے۔ امریکا کی متعدد کمپنیاں ڈیجیٹل سٹیلائٹ ٹیلی ویژن کے ذریعہ براہ راست گھروں میں کنکشن دیکر چینلوں اور فلموں کے ذریعہ ایسے پروگرام پیش کر کے دولت سمیٹ رہی ہیں۔ کیلیفورنیا کی ایک تجارتی کمپنی نے بتایا کہ فحش فلموں کے ویڈیو ٹیپ کی کرایہ کی دوکانوں سے ۱۹۹۵ء میں تین ارب ایک کروڑ ڈالر کی آمدنی ہوئی اور ڈاک کے ذریعہ ویڈیو کیسٹ کی فروخت سے ایک ارب ڈالر سے زائد آمدنی ہوئی۔ جرمنی میں ایسی ویڈیو فلموں سے ایک ارب ۸۰ کروڑ ڈالر حاصل ہوئے۔ وہاں کی ۱۹۰ بڑی کمپنیاں اس دھندے میں سرگرم عمل ہیں۔ بالغوں کی ایسی ''تفریحی فلموں'' سے ۱۵۰ سے ۱۷۵ ملین ڈالر کی رقم حاصل ہوئی ہے۔

امریکا کی دو بڑی کمپنیاں ''پلے بوائے'' اور Spice Entertainnent اس تجارت سے کروڑوں ڈالر کا نفع کمانے کے بعد اب ایشیا کا رخ کر رہے ہیں اور اگلے پانچ دس سالوں میں کل آمدنی کا نصف بیرون امریکا سے حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور Cybersex کے ذریعہ کثیر دولت کمانے کا منصوبہ ان کے پیش نظر ہے۔ Spice کے چیئرمین کا کہنا ہے کہ اگر انٹرنیٹ پر کسی چیز سے دولت کمائی جاسکتی ہے تو وہ جنس اور کھیل ہے۔ بوسٹن کی ایک کمپنی نے بتایا کہ ۱۹۹۶ء میں ''تفریح برائے بالغان'' انٹرنیٹ پر ۵۰ ملین ڈالر کا دھندا صرف امریکا میں ہوا۔ (۱)

امریکا میں پورنوگرافی کا یہ کاروبار آئین میں دئے گئے اظہار خیال کی آزادی (Free Speech Rights) کے حقوق کی آڑ لے کر خوب فروغ پر ہے۔ انتظامیہ جب ایسے لٹریچر یا تصاویر کے خلاف کوئی کارروائی کرتی ہے تو سپریم کورٹ آئین کی مذکورہ بالا دفعات کا فائدہ دیتے ہوئے ایسے مقدمات خارج کر دیتی ہے۔ حال میں ایک ایسے مقدمہ کو خارج کرتے ہوئے عدالت عالیہ نے کہا کہ ''اگر حکومت چاہے تو Anti Racketeering قوانین کے تحت پورنوگرافی کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔''

کرشن کمار اپنے مضمون "State Market & Sex" میں لکھتے ہیں:

''سافٹ پورن میگزین کے لئے اسکولی لڑکیوں کو نیو ماڈل کی حیثیت سے کام کرنے کیلئے مجبور کئے جانیکے کئی واقعات دہلی میں ہوئے۔ چھوٹے شہروں میں بلیو فلمیں

(۱) انٹرنیٹ: مثبت ایجاد منفی استعمال' زبیر احمد دعوت 4.3.97

بنانے کے لئے لڑکیوں کا استحصال اب کافی عام ہو چکا ہے۔ اسی خوفناک رجحان سے جڑے ہوئے کمسن لڑکیوں کے ریپ کے واقعات ہیں جو اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے شہروں میں کیسا بہیمانہ کلچر (Brutish Culture) پنپ رہا ہے۔ سول سوسائٹی اس کلچر کو نظر انداز کر رہی ہے۔ وہ صرف سنیما شوز کے ان اشتہارات پر نظر رکھتی ہے جو اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور جن کے بڑے بڑے عریاں پوسٹر اسکول کالجوں کی دیواروں پر جان بوجھ کر اسلئے چسپاں کئے جاتے ہیں کہ نوجوانوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو۔ کچھ دنوں قبل خواتین کی تنظیموں نے اسکے خلاف آواز اٹھائی تھی لیکن وہ بھی بالآخر شکست کھا کر بیٹھ گئیں۔ حکومت اس مسئلہ سے اتنا پہلو تہی کرتی آئی ہے کہ اب صورتحال انتہائی بھیانک ہو گئی ہے جو اس قسم کی وقتی تحریکوں سے دبنے والی نہیں۔

نئی اقتصادی پالیسیوں کو مقبول بنانے کے لئے ملک میں ایسا مزاج (Ethos) بنایا جا رہا ہے جس میں عورتوں کو صارفیت کے فروغ کیلئے جنسی کھلونا (Sex Object) کے بطور استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ملک کے اشتہارات جو ابتک کافی سنجیدہ تھے گلوبل سرمایہ داری کی زد میں اب عورتوں کو استعمالی صارفی اشیاء کی طرح پیش کرنے لگے ہیں۔ ملکی ٹیلی وژن پر باہری کمپنیوں کے حملہ نے اس رجحان کو تیزی سے بڑھانے میں شہ دی ہے اور حکومت بھی اس میں پوری طرح شریک لگتی ہے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ صارفی اشیاء کی خریداری کریں۔ اسٹیٹ اور پرائیویٹ سرمایہ دار اس جوکھم میں برابر کے شریک ہو گئے ہیں کہ لوگ جب کھائیں پئیں، لباس پہنیں، کار یا اسکوٹر پر سوار ہوں یا ٹیلی فون کریں تو ان کی تمثیلی توجہ عورتوں کی جانب ہی مبذول ہو۔" (۱)

ایروٹیک (Erotic) میٹریل کے نقصان دہ اثرات

ماہرین نفسیات اس پر متفق ہیں کہ اس قسم کے فحش لٹریچر کے مطالعہ سے اور ایسی عریاں فلمیں دیکھنے سے انسانی ذہن پر بڑے خراب اثرات رونما ہوتے ہیں، ان سے پیدا ہونے والے تاثرات تادیر قائم رہتے ہیں اور آگے چل کر ان کے برتاؤ کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ کم سن بچوں اور نوجوانوں کے متشددانہ اور مجرمانہ برتاؤ کے پس پشت بھی ایسے ہی پورنوگرافک مواد کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ امریکی اٹارنی جنرل ایڈون میس (Edwin

(۱) "State Market & Sex" : Krishna Kumar, TOI 24-5-95

Meese) کی صدارت میں جو کمیشن پورنوگرافی کی تحقیقات کیلئے مقرر کیا گیا تھا وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ "جنس سے متعلق ہونے والے جرائم کا بہت گہرا رشتہ ہارڈ کور پارنوگرافی سے ہے۔"

"Sex Crimes have a definite linkwith Hard Core Pornography".

پونٹیفکل کونسل فار سوشل کمیونی کیشن (ویٹیکن) نے ۱۳ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز جاری کی جس میں پورنوگرافی اور میڈیا میں عریانیت و تشدد کی بڑھتی ہوئی عکاسی کے خلاف زبردست آواز اٹھائی گئی۔ ویٹیکن کا کہنا ہے کہ آزادی رائے سے یہ نہ سمجھا جانا چاہئے کہ ایسا لٹریچر تصاویر یا فلمیں خواہ وہ نوجوانوں کیلئے کتنی ہی مخرب اخلاق ہوں، یا اخلاق عامہ کو کتنا ہی غارت کرنے والی ہوں ان کی بے دھڑک نمائش کی اجازت دی جانا چاہئے۔ ایسی چیزوں کے مشتہر کرنے میں اعلیٰ عیسائی قدروں اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود کے بہترین تصورات کو پس پشت نہ ڈال دینا چاہئے۔ پورنوگرافک اور سیڈسٹک تشدد صحت مند جنسی تصورات کو غارت کر دیتے ہیں، انسانی رشتوں میں باہمی الفت و یگانگت کے جذبات کو سرد کر دیتے ہیں، نوجوانوں اور خواتین کا استحصال کرتے ہوئے شادی اور خاندان کے مقدس اداروں کی تضحیک کرتے ہیں اور معاشرہ کے اخلاقی ڈھانچہ Moral Fibre کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ میڈیا تجارتی نفع کی خاطر عام بشری کمزوریوں کا استحصال کرتے ہوئے ایسے مناظر منظر عام پر پیش کر دیتے ہیں جو کسی طرح بھی اخلاقی نقطہ نظر سے روا نہیں کہے جا سکتے۔" (۱)

ایک موقر جریدہ نے ایسی بے راہ رویوں سے قوموں کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"جس قوم میں بے راہ روی ہی طرز زندگی بن جائے اور قوم کے بیشتر افراد اسی راہ پر گامزن ہو جائیں اس قوم کا زوال یقینی ہے، رکیک لٹریچر اور بے قید طرز زندگی اسلئے مذموم ہے کہ محبت کے بغیر جنسی اختلاط انتہائی وحشیانہ قسم کی خود غرضی ہے اسلئے پارنوگرافی پر بندش عائد کی جانی چاہئے۔ جو ایسا نہیں سوچتے انہیں روم، یونان، مصر اور خود ہندوستان کی اُن قدیم تہذیبوں کی طرف عبرت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے جنکا پہلے انحطاط ہوا اور بعد میں صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گئیں کیونکہ وہ ہر قسم کی ناروا جنسی حرکات و سکنات میں پوری طرح ملوث ہو گئی تھیں!"

(۱) TOI, 18-5-89

باب ۔۲

نمائش حسن، عریانیت و فیشن پرستی

انسان اپنے جمالیاتی ذوق کے تحت ہمیشہ سے حسن کا شیدائی رہا ہے لیکن حسن کو 'کروڑوں ڈالر کی انڈسٹری' بنا دینے کا سہرا جدید دور کے انسان کے سر ہے۔ موجودہ دور کے تجارتی رُجحان نے سنگار کی اشیاء اور حسن کو دوبالا کرنے والی جدید ترین تکنیکس کو اتنا مقبول عام بنا دیا ہے کہ ہر دوشیزہ فیشن کی گرویدہ ہوگئی ہے اور میک اپ کے بغیر اپنی شخصیت کو ادھوری محسوس کرتی ہے۔ کاسمٹک اشیاء کی صرف پبلسٹی پر کروڑوں ڈالر خرچ کئے جاتے ہیں اور فیشن ایبل لباس کی تیاری انہیں مزید جاذبِ نظر بنانے اور تراش خراش میں نئی جدتیں وضع کرنے میں لاکھوں فیشن ڈیزائنر اپنا بیش قیمتی وقت اور سرمایہ صرف کرتے رہتے ہیں اور اس ساری جدوجہد کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ کس طرح نسوانی جسم کے نشیب وفراز کو زیادہ سے زیادہ نمایاں اور عریاں کر کے پیش کیا جائے۔ دراصل لباس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی ایک مقصد پیشِ نظر رہتا ہے جیسا کہ چین کے فلسفی لن یوٹانگ نے کہا تھا کہ "عورتوں کے لباس کی وضع تراش میں تبدیلیاں اس اندرونی کشمکش کی جانب اشارہ کرتی ہیں جو عورتوں میں لباس پہننے کی تسلیم شدہ خواہش اور نہ پہننے کی غیر تسلیم شدہ خواہش کے درمیان ازل سے چلی آرہی ہے۔"

"All Women's Dresses Are Merely Varitions On The Eternal Struggle Between The Admitted Desire To Dress And The Unadmitted Desire To Undress" (Lin Yutang)

آج عریانیت ایک طرز زندگی بن گئی ہے۔ عریاں لباس، عریاں غسلِ آفتابی، عریاں حسن کے مقابلے، عریاں کالونیز، اسٹیج و پردہ سیمیں پر عریاں اور فحش مظاہرے آج انتہائی مقبول ہیں! اس نظریہ کی پُرزور تشہیر کی جارہی ہے کہ شرم وحیا دراصل کوئی فطری جذبہ

ہے ہی نہیں بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ سترِ عورت اور حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق وشائستگی سے نہیں بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کی داعیاتِ صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے، کہا جارہا ہے کہ عریانیت میں کوئی ناشائستگی نہیں بلکہ صحت کے لئے مفید ہونے کی بناء پر اس مسلک (Cult) کو زیادہ سے زیادہ اپنایا جانا چاہئے۔ بکنی جس نے شروع میں مردوں کو چکاچوند کر دیا تھا اب اتنی عام ہوگئی ہے کہ صرف بکنی میں مردوں کی آنکھوں کے لئے اب کوئی ندرت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

"Bikini By Itself Is No Longer Sufficient To Attract Male Eye"

میک اَپ

ایس۔ ایل۔ رائے (Roy) اپنی کتاب "War And Immorality" میں لکھتے ہیں کہ "۱۹۱۴ء سے قبل معزز خواتین صرف تھوڑا سا چہرہ کا پاؤڈر استعمال کرتی تھیں اور وہ بھی پبلک کے سامنے نہیں۔ لپ اسٹک اور رنگی ہوئی پلکیں بازاری عورتوں میں رائج تھیں۔ کوئی عورت اگر ایسے میک اَپ سے پبلک میں آجاتی تھی تو وہ بیسواہی سمجھی جاتی تھی لیکن جنگ شروع ہونے کے چند مہینوں کے اندر ہی مغربی یورپ کی خواتین نے اپنے چہرہ اور آنکھوں کو سجانے اور ہونٹوں کو رنگنے کے عجیب وغریب طریقے اختیار کرنا شروع کر دیئے۔ شروع شروع میں کچھ عورتوں نے نامناسب ہونے کی بناء پر اس پر اعتراض کیا لیکن آہستہ آہستہ سب ہی عورتوں نے یہ عادت اپنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شاہراہ عام پر، ڈرائنگ روم ریسٹورنٹ، کافی ہاؤس، ٹرام اور بسوں غرض کہ ہر جگہ اور ہر وقت اپنا وینٹی بیگ کھول کر پاؤڈر اور رنگ لگانے کی عادی ہوگئیں۔" ص ۷۷

اب شوق میک اپ اتنا عام ہوگیا ہے کہ شریف وبیسوا کے درمیان فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے، چنانچہ پروفیسر موریسن لکھتے ہیں کہ:

"آج کی نوجوان بن بیاہی خاتون نے مردوں کے رجھانے لبھانے کے فن میں درجۂ کمال حاصل کرلیا ہے۔ وہ رنگے ہوئے رُخسار، وہ رنگے ہوئے ہونٹ، وہ رنگے ہوئے ناخون جو ابھی پچیس ہی سال ادھر آبرو باختہ بیسواؤں کے ساتھ مخصوص تھے اب بڑی بڑی شریف زادیوں کی علامتیں قرار پاچکی ہیں۔"

وانس پیکارڈ اپنی کتاب (Sexual Wilderness) میں لکھتے ہیں کہ

''آرائش وزیبائش کی صنعت نے ہر نوجوان دوشیزہ کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ زندگی میں ان کی کامیابی صرف اس بات پر موقوف ہے کہ وہ کس حد تک مردوں کی نظروں میں پسندیدہ ثابت ہوسکیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ہر لڑکی میک اَپ سے سج دھج کر خوشبوؤں میں لت پت ہوکر ذوقِ نظارہ عام کرتی پھرے۔ امریکا میں یہ معیار اور بھی سخت ہے وہاں ہر لڑکی حسن کے ایک خاص معیار کو پہنچنے کے بعد ہی سوسائٹی میں مقبول ہو پاتی ہے۔''

پروفیسر سوروکن لکھتے ہیں کہ ''کاسمٹکس کی زبردست انڈسٹری اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا شامہ کا ماحول کتنا پُرشہوت ہوچکا ہے "Erotization Of Our Olfactory Envioronment" اس صنعت کی تیار کی گئی اشیاء، صابن، شیمپو، پاؤڈر، کریم، لوشن اور پالش کو کھل کر جسمانی رعنائی، گیسوؤں کی چمک اور جسم کے گداز پن میں اضافہ کرتے ہوئے جنسی خط کو بڑھانے والا بتاتے ہوئے تشہیر کی جاتی ہے۔''

وانس پیکارڈ لکھتے ہیں کہ جرمنی کی ایک خاتون تاجر نے کروڑوں ڈالر کا کاروبار شروع کیا اور اپنے سیکس سُپر مارکیٹ کی شاخیں پورے ملک میں پھیلادیں۔ اس کے کیٹلاگ میں ایسے آئیٹم ہیں: ٹرانکولائز، جو مردوں کو جنسی اعتبار سے سرد رکھیں گے۔ جب تک کہ ان کا پارٹنر بھی اُسی سطح پر نہ آجائے، قوت مردمی میں اضافہ کرنے والی ادویات جوکاک ٹیل، کینڈی یا خوشبوؤں میں ملائی جاسکتی ہیں، ایسی خوشبوئیں جو سوئمنگ پول میں ڈالنے سے جنس مخالف کو آپ کی طرف کھینچ لائیں گی۔ فاربس کا کہنا ہے کہ امریکی مرد بھی اشیائے سنگار کے اتنے ہی شائق ہوگئے ہیں جتنی کہ عورتیں اور وہ بھی ایسی خوشبوؤں کا کثرت سے استعمال کرنے لگے ہیں جن سے صنفِ نازک اُن کی طرف کشش محسوس کرنے لگیں۔ امریکی مردوں کے لئے گرومنگ (Grooming Aids) کی تیاری ۱۹۶۶ء میں 500 ملین ڈالر سے زائد تھی!

شوقِ میک اَپ اب اسقدر زیادہ بڑھ گیا ہے کہ امریکی اور یوروپی ملکوں کی خواتین اپنے شوہروں کی آمدنی کا خاصا بڑا حصہ ان اشیائے زیبائش کی خریداری پر صرف کرتی ہیں اور یہ ان کے فیملی بجٹ میں اُونچے نقطہ پر پہنچ گیا ہے۔ مینوفیکچررس نے بھی اس کا

پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اِن اشیاء کی قیمتوں میں خوب اضافہ کردیا اس لئے نہیں کہ اشیاء کی تیاری میں لاگت زیادہ آتی ہے بلکہ اس لئے کہ ہوشیار صنعت کاروں نے یہ اندازہ لگالیا کہ اس لائن میں قیمتی چیزیں ہی زیادہ شوق ورغبت سے خریدی جاتی ہیں۔ عورتیں اُن اشیاء پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں جو اُن کے حسن کو دوبالا کردے اور انہیں زیادہ پُرکشش بنادے وہ ''اُمید'' پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں اور جیسا کہ انڈسٹری کے ایک کیپٹن نے کہا:

آپ اُمید کو کم قیمت پر نہیں بیچ سکتے "You Cant Sell Hope At A Low Price"

اشیائے سنگار کی تیاری صرف امریکا میں ہر سال نصف بلین ڈالر کی ہوتی ہے صرف چہرہ کی آرائش کے لئے 930 مختلف آئیٹم تیار کئے جاتے ہیں اور اکیس لاکھ ڈالر سے زیادہ عورتوں کے ناخون رنگنے ہاتھوں کو نرم اور پُرکشش بنانے میں صرف کے جاتے ہیں۔ ہیرے جواہرات کا استعمال بھی امریکا میں سب سے زیادہ ہے۔ ۱۹۸۶ء میں امریکیوں نے سترہ بلین ڈالر ڈائمنڈ جیویلری کے زیورات کی خرید پر دس بلین ڈالر خرچ کئے جبکہ پوری دُنیا میں ڈائمنڈ جیویلری کا کاروبار 21.6 بلین ڈالر کا رہا!

انگلستان میں 15 سال سے لے کر 85 سال تک کی خواتین کا حسن میک اَپ کا مرہونِ منت ہوتا ہے، بقول اقبال:

چہروں پہ جو سُرخی نظر آتی ہے سرِشام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

یہاں خوبصورتی کو برقرار رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کے اخراجات میں سرفہرست بالوں کی مد ہوتی ہے، بالوں کی سیٹنگ اور میک اَپ کے اخراجات کے بعد خوبصورتی کو برقرار اور دلفریبی میں اضافہ کرنے کے لئے زیر جامہ کی باری آتی ہے۔ ولایت میں زینت کے مقامات کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لئے اپ لفٹ اور 'ہُدن ٹریژ' ایسے دلچسپ ناموں والے لوازمات تیار کئے جاتے ہیں اور اس ٹھنڈے ملک کے ٹھنڈے مزاج مردوں کی جنسی آگ کو گرم رکھنے کے لئے ان لوازمات کو سیاہ، گلابی اور دوسرے دلفریب رنگوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ ایک سروے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ۱۹۶۰ء میں وہاں پچاس کروڑ روپے کا میک اَپ کا سامان تیار ہوا تھا جس کا ایک چوتھائی دوسرے

ملکوں کو برآمد کیا گیا بقیہ انگریز خواتین نے استعمال کیا۔ مغربی جرمنی میں 2,500 ملین مارکس کا کاسمٹکس سامان تیار کیا گیا فی کس خرچ 65 مارکس رہا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں ابھی کاسمٹکس پر خرچ بہت کم ہے لیکن یہاں مارکیٹ کے وسیع ہونے کے زبردست امکانات ہیں۔ اس وقت ہمارے یہاں کاسمٹکس کا فی کس سالانہ خرچ صرف 23 روپے ہے حالانکہ کوریا میں 1282، تائی وان میں 1235 اور انڈونیشیا میں 403 روپے ہے جبکہ ہندوستان کا مڈل کلاس 200 ملین کا ہے جبکہ کوریا کا صرف 31 ملین، تائی وان کا 17 ملین اور انڈونیشیا کا 65 ملین ہے۔ 900 ملین آبادی رکھنے والے اس ملک میں کاسمٹکس اشیاء کی کھپت کے امکانات بہت روشن ہیں۔ چنانچہ ایک مشہور کاسمٹک کمپنی نے 245 ملین روپے اس کاروبار میں لگا دیئے اور تین سال کی مدت میں وہ 250 ملین روپے کے ٹرن اوور کی اُمید رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک جرمن کمپنی Benckiser نے اعلیٰ درجہ کا سامان آرائش تیار کرنے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا اور صرف میڈیا و اشتہارات پر 200 ملین روپے خرچ کئے۔ یہ کمپنی اپر مڈل کلاس کے افراد کے لئے انٹرنیشنل کوالٹی کا سامان آرائش تیار کرے گی۔ کمپنی کے ریسرچ سینٹر کا کہنا ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں کی ضروریات اور آب وہوا کو مدِنظر رکھتے ہوئے سامان تیار کرے گی۔ ہندوستان کے بیوٹی مارکیٹ کا اندازہ 12 بلین روپے کا لگایا گیا ہے لہٰذا متعدد ملٹی نیشنل کمپنیاں Revlon Benckiser, Oriflame یہاں اپنا مارکیٹ پھیلانے کے لئے کوشاں ہیں کیونکہ منافع کے وسیع امکانات ہیں، مثال کے طور پر Revlon کمپنی کی لپ اسٹک کی قیمت 100 روپے نیل انامل کی قیمت 65 روپے ہے جبکہ مقامی Lakme کی تیار کردہ انہیں اشیاء کی قیمت بالترتیب 42 اور 30 روپے ہے۔

ایک رُوسی اخبار نے مصنوعی آرائش کو غیر فطری بتاتے ہوئے لکھا: ''تمہارے رنگے ہوئے گیسو، مصنوعی مژگاں اور چہرہ پر جمی ہوئی غازہ کی تہ اور اس میں رنگے ہوئے ہونٹ...... یہ تمہارا اصل چہرہ نہیں ہے، یہ تو صرف بناوٹی رُوپ ہے...... تمہاری اسکرٹ اتنی اُونچی ہوگئی ہیں کہ بیٹھنے پر رانیں کھلی دکھائی دیتی ہیں، کیا یہ کوئی اچھا نظارہ ہوتا ہے؟ نہیں بلکہ یہ تمہیں عامیانہ بنا دیتا ہے۔ تم اپنے کو اس سے بہتر کاموں میں لگا سکتی ہو بجائے اس کے کہ اپنا وقت سر پر احرام مصری بنانے اور اپنے کو رنگنے میں ضائع کرو۔''

ایک تخمینہ میں بتایا گیا کہ اگر ہر روز نصف گھنٹہ 'میک اپ' کرنے میں خرچ کیا جائے تو ۲۰ اور ۳۵ سال کی درمیانی عمر والیوں کی عمر کے 5,675 دن اسی میں صرف ہوجائیں گے!

امریکی مردوں میں بھی آرائش وزیبائش کا شوق روزافزوں ہے وہ اپنے جسم پر پچاسوں قسم کی خوشبوئیں، سینٹ اور ڈیوڈورنٹ ملتے ہیں۔ طرح طرح کے ڈیزائن کے شوخ رنگین سوٹ زیب تن کرتے ہیں، گلے میں موتیوں کے ہار، لمبے Pendants چمکدار بلٹ، پیروں میں خوشنما چمکیلے جوتے۔ غرض خوب سج دھج کر چھیلا بن کر نکلتے ہیں۔ نئے عطریات اور خوشبوئیں اس تشہیر کے ساتھ مارکیٹ میں لائی جاتی ہیں کہ وہ جنس مخالف کو آپ کی طرف کھینچیں گی اور بعض خوشبوؤں کے بارے میں تو یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ قوت مردانگی میں اضافہ کرتی ہیں۔ مثلاً کوئی ایک فرم نے Andron نام کی ایک خوشبو اسی دعویٰ کے ساتھ پیش کی جس کی پہلے سال کی فروخت ہی 80 ملین ڈالر سے زیادہ رہی!

جسم کو چھریرا (SLIM) بنانے کا شوق مغربی عورتوں میں جنون کی حد تک بڑھ چکا ہے اس کے لئے وہ مخصوص ورزش کرتی ہیں، خاص غذائیں استعمال کرتی ہیں تاکہ اُن کا وزن کم ہوجائے اور وہ ہلکی پھلکی گڑیا بن کر رہیں اور جسم پر ضرورت سے زیادہ ایک آونس گوشت بھی نہ رہے۔ وہاں ایسی مشینیں کثرت سے فروخت ہوتی ہیں جن کے ذریعہ برقی لہر دیکر جسم کو دُبلا کیا جاتا ہے۔ پچاس سے لیکر 200 سو ڈالر تک بکنے والی یہ مشینیں ''فیگر ٹون''، ''فیگر میجک'' جیسے ناموں سے بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ حالانکہ ڈاکٹر اور واشنگٹن کا محکمہ غذا وادویات (FDA) اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان مشینوں کے مینوفیکچررس کے جھوٹے اور غلط رہنمائی کرنے والے اشتہارات کے خلاف عدالتی کارروائی بھی کی جارہی ہے، پھر بھی خواتین ان مشینوں کو بڑے شوق ورغبت سے خرید رہی ہیں اور متعدد سیلون ان کو اپنے یہاں نصب کرا رہے ہیں تاکہ جو خواتین خرید نہ سکیں وہ اُن کے سیلون میں استعمال کرسکیں۔

پلاسٹک سرجری کی مدد سے ناک نقشہ درست کرانے کا کاروبار بھی وسیع پیمانے پر رائج ہے۔ چہرے اور جسم کی جھریوں کو درست کرانا، آنکھوں کو گول یا بیضاوی بنوانا، بالوں کو گھونگھر دار بنوانا، پستانوں کو چھوٹا یا بڑا کرانا، غرض نسوانی ناک نقشہ کو خوبصورتی کے

جدید معیار پر لانے کی ہر ممکن کوشش اِن کاسمٹک سرجری کلنکس میں کی جاتی ہے۔ جاپان کے سرجن اس کام میں کافی مہارت رکھتے ہیں لہٰذا ہر سال لاکھوں افراد دوسرے ملکوں سے سرجری کے لئے یہاں آتے ہیں۔ عورتیں اپنے چہروں کی جاذبیت اور کشش بڑھوانے نیز نوک پلک درست کرانے کے لئے آتی ہیں۔ بہت سے لوگ فلم ایکٹرسوں کے فوٹو ساتھ لاتے ہیں کہ ان کی شکل ویسی ہی بنادی جائے۔ ٹوکیو میں ایسے Charm School بھی ہیں جہاں مردوں کو سڈول جسم اور خوبصورت چہرے بنانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

نسوانی حسن کے مقابلے

نمائش حسن کا یہ جنون بالآخر مقابلۂ حسن کے جشنوں کی صورت میں ظاہر ہوکر رہا۔ ۱۹۵۰ء کے دہے سے دُنیا کی حسین ترین لڑکیوں کے انتخاب کے یہ مقابلے کاسمٹک انڈسٹری، ہوائی کمپنیوں، فلمی اسٹوڈیوز اور دیگر کمرشیل اداروں کے تعاون سے ''مس ورلڈ'' اور ''مس یونیورس'' کے خطابات سے نوازنے کے لئے منعقد کئے جانے لگے۔ خطابات کو جیتنے والیوں کو نقد انعام، قیمتی زیورات، مرصع تاج، موٹر کار، نفیس لباس اور فلموں کے لئے کنٹریکٹ وغیرہ سے نوازا جاتا ہے۔ ان مقابلوں میں پہلے ملکی انتخابات ہوتے ہیں اور پھر ہر ملک سے چنی ہوئی حسین لڑکیاں عالمی ٹائٹل کے لئے شریک مقابلہ ہوتی ہیں، جہاں وہ ججوں کے سامنے اپنے ملکی لباس، پھر لباس پیراکی اور بعد میں شام کے گون میں ملبوس ہوکر پریڈ کرتی ہیں۔ جج صاحبان اُن کے قدوقامت، رنگ رُوپ، ملاحت وصباحت رعنائی ودلکشی، موزونی حرکات وسکنات، سڈول اعضاء، جسم کا نمایاں اُتار چڑھاؤ، دلآویز پیچ وخم وغیرہ دیکھ کر دُنیا کی حسین ترین لڑکی کا انتخاب کرتے ہیں۔ مس ورلڈ کے چیئرمین Eric Morley کا کہنا ہے کہ وہ لڑکی کی پرسنالٹی اور پوائز، اس کے اندازِ گفتگو اور ذہانت کو بھی دیکھتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کی شخصیت میں واقعی کتنی جاذبیت وکشش ہے۔ وہ امریکا کے ''مس یونیورس'' کے انتخاب کے اس پہلو سے متفق نہیں ہیں جس میں جج صاحبان شریک مقابلہ دوشیزاؤں کے ساتھ شب باشی کرتے ہیں۔

ان عالمی انتخابوں کے علاوہ مقامی طور پر کاسمٹک فرمیں، خواتین کے میگزین، فوٹوگرافی کلب، اسی قسم کے جشن مس نیمینا، مس فوٹوجینک، مس بیوٹی فل اسکن، مس بیوٹی

فل آئی وغیرہ منعقد کئے جانے لگے جس میں انعامات کی لالچ میں لڑکیاں جوق در جوق شریک ہونے لگیں اور حسن کے قدردانوں کو آزادانہ ذواقی کے مواقع فراہم ہوگئے۔

۱۹۹۶ء کا 'مس ورلڈ' مقابلہ ہندوستان کے شہر بنگلور میں ABCL کی طرف سے منعقد ہوا جس کے لئے صرف گودریج نے ساڑھے چار کروڑ روپے فراہم کئے اور جیتنے والی یونان کی مس ارین شکلوا کو 65 ہزار ڈالر کا انعام دیا گیا۔ ڈھائی بلین افراد نے ٹی وی پر اس مقابلہ کو دیکھا۔

برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن (BBC) نے اِن حسن کے مقابلوں میں دلچسپی لینا ترک کردیا ہے، اس کے ڈائرکٹر مائکل گریڈ نے ایک سرکاری نوٹ میں اِسے عورتوں کے لئے توہین آمیز Degrading To Women بتاتے ہوئے کئی سال قبل ہی بی بی سی کے اسکرین پر اسے دکھانا بند کردیا تھا۔

عالمی مقابلۂ حسن کے یہ انتخابات جو ۱۹۵۱ء سے شروع ہوئے، پہلے تو لندن، کیلیفورنیا وغیرہ میں منعقد ہوتے رہے، پھر یہ سلسلہ افریقہ، ایشیاء اور روس تک پھیل گیا اور نومبر ۱۹۹۶ء میں ہمارے ملک ہندوستان کے شہر بنگلور میں بھی منعقد ہوچکا ہے۔ ان انتخابات کے بانی ارک مارلے نے بتایا کہ اب دُنیا کے بیاسی ملکوں کے 1.44 بلین افراد اِسے ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ ''مس ورلڈ'' کا یہ انتخاب ۳۸ سال تک لندن میں منعقد ہوتا رہا اور ۱۹۹۲ء سے جنوبی افریقہ میں ہورہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا تھیم (Theme) Beauty With A Purpose ہے اور ہم شریک ہونے والیوں کی صلاحیت، شخصیت اور عام معلومات کی پرکھ کرتے ہیں۔ دبئی کی ایمریٹ ایئر لائنز نے بھی اس مقابلہ کی سرپرستی کا اعلان کیا جس میں بیش قیمتی تحفے تحائف کے علاوہ نقد ۲ لاکھ ڈالر کا انعام جیتنے والی کو دیا جاتا ہے اور مرصع تاج پہنایا جاتا ہے۔

اسٹائلش لیکن عریاں لباس

اُنیسویں صدی کے وسط تک یورپ کی اُن اقوام میں جہاں مسیحی اثر غالب تھا شرم وحیا کا معیار کافی بلند تھا خصوصاً عورتوں کے لباس کے بارہ میں بلکہ عہدِ وکٹوریہ میں عورتوں کا لباس ستر پوشی کے اعتبار سے ایسے معیار پر پہنچ گیا تھا کہ عورتوں کے لئے اُسے

پہننا باعث تکلیف ہوگیا تھا، اس کا ردِّعمل ہوا اور قطع و بُرید کا سلسلہ شروع ہوا اور ترقی معکوس میں وہ اتنا مختصر ہوگیا کہ بہ قول ایک مزاح نگار کے ''آجکل مرد کے گلے کی ٹائی سے عورت کی ستر پوشی ہوجاتی ہے۔''

مغربی عورتوں کے لباس میں انقلاب پیدا ہونے کی بڑی وجہ صنعتی انقلاب کے وہ تصورات تھے جن کے تحت عورتوں نے معاشی آزادی حاصل کرکے مرد کے مقابلہ میں مساوات حاصل کرلی تھی۔ مغربی اقوام کی دولت مندی میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا اُن میں عیش پرستی اور تعیشانہ زندگی بسر کرنے کا خیال بھی پیدا ہونے لگا۔ مرد کے ہوا و ہوس اور عورت کے جذبۂ آزادی نے حسن و آرٹ کی قربان گاہ پر عوت کی بھینٹ چڑھائی اور اس کے جذبۂ آرائش و حسن کو اتنا اُبھارا کہ وہ عام زندگی میں نیم عریاں اور رقص و سرود کی محفلوں اور اسٹیج پر تو پوری طرح عریاں ہوگئی۔''

عریانیت کے اس رُجحان کے تحت لاشعور میں پائے جانے والے اسباب کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے پنڈت بی۔ این۔ شرما لکھتے ہیں:

''عورت کو عریاں دیکھنے کی خواہش مرد خصوصاً شہوت پرست مرد میں ہمیشہ رہی ہے لیکن خاتون نے زبردستی اور کبھی کبھی طاقت استعمال کرکے مزاحمت کی جس سے اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ عورت کی عفت مآبی کے مقابلہ میں مرد کو عموماً شکست ہی کھانی پڑی، یہی سبب ہے کہ جب بل سے خواہش پوری نہ ہوسکی تو اُس نے چھل سے کام لینا چاہا اور آخر میں خود اُسی کی مرضی سے اُسے عریاں کرکے چھین لیا۔ پہناوے کے لباسوں کا ایسا چلن نکلا کہ عورت اُس پر لٹو ہوگئی اور پھر اس پر فیشن کا ایسا ملمع چڑھایا کہ وہ اپنے کو اس سے الگ نہ کہہ سکی۔ وہ لباس زیب تن کرکے بھی عریاں رہ گئی اور اُسے اپنی کمزوری کا علم بھی نہ ہو پایا۔ مرد اپنی اس کامیابی پر منہ پھیر کر مسکرانے اور فخر کرنے لگا۔''

پروفیسر سارنسین اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

''جدید عورت کا لباس بجائے خود محرک نفس لباس ہے کہنا یہ چاہئے کہ آج عورت کی دلکشی زنانہ لباس ہی کی دلکشی ہے، لباس کا مقصد ہی غالباً تحریک جذبات تھا اور اب یہ مقصد صدیوں کے بعد پوری طرح حاصل ہوچکا ہے۔''

خواتین کے جدید لباس میں عریانیت روز افزوں ہے۔ لباس کا مقصد اب جسم ڈھانپنا نہیں بلکہ جسم نسوانی کے نشیب و فراز کو زیادہ سے زیادہ نمایاں اور عریاں کرکے پیش کرنا ہے۔ پروفیسر پٹریم سوروکن اپنی تصنیف "Sane Sex Order" میں لکھتے ہیں:

''ہمارے فیشن ایبل لباس کی تراش و خراش بالخصوص صنفی میلانات پر مبنی ہوتی ہے، اس کا مقصد ہی جنس مخالف کے جذبات کو اُکسانا ہوتا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ڈیزائنر جسم کے اچھے خاصے حصے کو عریاں کردیتے ہیں اور بسا اوقات یہ عریانیت ''اسٹرپ ٹیز'' کی حد تک پہنچ جاتی ہے...... وقتی تغیرات کے باوجود جنسیات کی بڑھتی ہوئی لہر نے رفتہ رفتہ جنس نسوانی کو زیادہ سے زیادہ عریاں کردیا ہے۔ خواہ بکنی ہو یا سوئمنگ سوٹ، ضابطہ کا لباس ہو یا گھریلو لباس، آج کی وضع و تراش نے جسم نسوانی کے بہت بڑے حصے کو اس حد تک عریاں کردیا ہے کہ یہ کچھ عرصہ قبل بالکل ہی ناقابل قبول ہوتا اور ہمارے بزرگوں کے نزدیک افسوسناک حد تک نازیبا قرار پاتا ہے۔''

امریکا اور یورپ کے خوشحال ملکوں میں گارمنٹس انڈسٹری نے بڑا فروغ پایا اور لباس کی وضع و تراش بڑی جاذب نظر ہوگئی اور لباس پر مصارف بھی بہت زیادہ بڑھ گئے، صرف امریکا میں کنزیومرس ہر سال 50 ہزار ملین ڈالر لباس پر خرچ کرتے ہیں جس میں 32 ہزار ملین ڈالر عورتوں اور بچوں کے لباس پر اور 18 ہزار ملین ڈالر مردوں کے کپڑوں پر خرچ کیے جاتے ہیں لیکن لباس کی وضع و تراش نے جسم نسوانی کو زیادہ سے زیادہ عریاں ہی کردیا ہے۔

اس صدی کی ابتدا تک اسکرٹس کافی دراز اور گھیر دار ہوتے تھے صرف ساق کا کچھ حصہ کھلا رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ فیشن کی نئی روش نے اُسے مختصر کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ اب انتہائی چُست اور اُونچے اسکرٹ فیشن میں داخل ہوگئے جو منی اسکرٹس کہلائے، یہ ایسے سائے ہوتے ہیں جن میں Hemline گھٹنوں سے اُوپر ہوتی ہے اور رانیں پوری کھلی رہتی ہیں، سینہ اور پیٹھ بھی خاصی حد تک عریاں اور آستینیں بالکل غائب! والس پیکارڈ لکھتے ہیں کہ:

''ماڈرن ٹکنالوجی کی ایک اور دین اسٹرچ پینٹ ہے اور ۱۹۶۰ء کے آخر تک

ہزاروں کی تعداد میں خواتین سماجی تقریبات میں اسی میں ملبوس ہوکر شرکت کرنے لگیں، سلیکس اتنے مختصر ہوگئے کہ ناف تک کا بڑا حصہ کھلا دکھائی دینے لگا۔ کچھ لڑکیاں کالجوں میں بھی پینٹ پہن کر جانے لگیں، جب کچھ کالجوں کے حکام نے اس پر اعتراض کیا تو لڑکیوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ تو ہم کو اولڈ فیشنڈ ہی بنا دینا چاہتے ہیں، اُونچے مختصر اسکرٹ ہی ماڈرن ہیں یہ لوگ یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ہم اپنی حسین ٹانگیں پبلک کو دکھا سکیں۔

لندن کی ایک ماہر فیشن سینڈی شا نے کہا کہ عنقریب اسٹائلش خواتین صرف دو بڑے ہی مختصر دہلکے ٹکڑوں پر مشتمل لباس پہنا کریں گی، اُنکا اشارہ محرم (Bra) اور زیر جامہ (Panties) کی طرف تھا۔ موصوفہ کا کہنا ہے کہ لڑکیاں اب بھی بہت باریک قسم کے موزے استعمال کررہی ہیں جوان کی جلد کے رنگ سے ملتے ہوئے ہوتے ہیں...... یہ سب کچھ اس کے باوجود کہ مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر الکو نڈر بائنڈ نے آگاہ کیا ہے کہ جو خواتین سرد موسم میں بھی ہلکے موزے اور کاغذ کی طرح پتلے زیر جامے استعمال کرتی ہیں وہ بڑا خطرہ مول لیتی ہیں۔ انہیں بھاری موزے استعمال کرنا چاہئے تا کہ ان کے پیروں میں سوجن ہوکر بھداپن نہ پیدا ہوجائے۔

۱۹۵۰ء کے دہے کے اختتام پر نیویارک کے ایک فیشن ڈیزائنر نے اعلان کیا کہ آنے والے موسم میں ہم خواتین کے لئے ایک ایسا لباس تیار کریں گے جس میں محرم کیلئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ عورت آج اپنے جسم کی جتنی نمائش کررہی ہے اسے اس سے زیادہ نمائش کا حق حاصل ہے اور اس نئے لباس میں عورت کو اپنی زنانہ دلکشی کے اظہار کا موقعہ ملے گا اور بالآخر ''ٹاپ لیس'' (Top Less) کے نام سے یہ لباس مارکٹ میں آیا اور خوب مقبول ہوا۔ اس کے ڈیزائنر روڈی گریرچ تھے جنہوں نے بعد میں جھرجھرے محرم Transparent Bra کی بھی اختراع کی تھیں۔ فرانس کے ایک ڈیزائنر پیرے کارڈن نے سینہ کی عریاں نمائش کرتا ہوا ایک ایوننگ گون اختراع کیا جس میں ریشمی ڈوری کے سہارے یہ گون جسم پر لٹکا رہتا ہے۔ پیرے کاڈن کا کہنا ہے کہ عریانیت کا تعلق دراصل اس حلقہ سے ہے جس میں آپ رہتے ہیں۔ اگر آپ گداز سینہ رکھتی ہیں تو کیوں نہ اس کی نمائش کریں۔ جدید گون ماڈرن دوشیزاؤں کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔

بکنی کی اختراع

۱۹۴۶ء میں پیرس کے ایک سوئمنگ پول کے فیشن شو میں ایک نوجوان کیبرے ڈانسر دو ٹکڑوں پر مشتمل ایک لباس پہن کر نمودار ہوئی۔ ایک ٹکڑے سے سینہ کا کچھ حصہ ڈھکا تھا اور دوسرے سے سُرین کا تھوڑا حصہ۔ اس لباس کو دیکھ کر حاضرین ششدر رہ گئے، یہ لباس اتنا مختصر تھا کہ ایک انگوٹھی کے اندر سے نکل سکتا تھا۔ یہ ایک بم شل کی طرح نمودار ہوا لیکن جلد ہی کئی یوروپی ملکوں نے اس پر پابندی عائد کردی اور خواتین کے کئی گروپس کے دباؤ سے ہالی وڈ میں بھی اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ اُن ہی دنوں میں امریکا نے عالمی جنگ کے بعد اپنا پہلا ایٹمی تجربہ جنوبی بحرالکاہل کے جزیرہ مارشل کے مقام Bikini پر کیا تھا اس طرح اس لباس کا نام بھی بکنی رکھا گیا۔ فرانس کے فیشن ڈیزائنر لوئس ریرڈ (Louis Reard) نے عورتوں میں اس کے مقبول ہونے کے زبردست امکانات کا اندازہ لگاتے ہوئے The Smallest Bathing Suit in the World کا ٹریڈ مارک سلوگن دیتے ہوئے اسے پیٹنٹ کرالیا اور مارکٹ میں پیش کردیا لیکن اس وقت کی دنیا ابھی اتنی عریانی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ The world was simply not yet ready for so much naked flesh لہٰذا جن عورتوں نے اُسے خریدا بھی انہوں نے اپنے وارڈ روب کی نیچے کی دراز میں ڈال دیا اور فی الحال پہلے والا نسبتاً بڑا سوئمنگ سوٹ ہی رائج رہا۔ صرف چند ایکٹرسوں نے اُسے پہن کر کچھ فلموں میں کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سے بکنی زیادہ مقبول ہونے لگی اور فرانس کی مشہور فلمی اداکارہ برگی برڈوٹ نے جب ۱۹۵۶ء میں فلم ''And God Created Woman'' میں اسے پہن کر کردار ادا کیا تو اُسے اس لباس میں دیکھنے کے بعد لاکھوں فرانسیسی عورتوں نے اس کی خریداری شروع کردی۔ ۱۹۶۰ء تک بکنی کا رواج عام ہوگیا اور Ursula Andrees اور Raquel Welch نے بھی فلموں میں اسے پہننا شروع کردیا۔ اس وقت کی ماڈل بھی اسے اتنا غیر شائستہ لباس سمجھتی تھیں کہ اسے پہن کر نمائش کے لئے بھی تیار نہ ہوتی تھیں۔ بالآخر Reard نے برہنہ رقص کرنے والی ایک رقاصہ کو آمادہ کیا تب اُسے ماڈل بنا کر پیش کیا گیا۔ بعد میں بکنی کے اور بھی مختصر نمونے سامنے آئے اور G. String لگا کر بالائی حصہ بھی

غائب کردیا گیا۔

فیشن ڈیزائنر بھی خواتین کے موڈ کو بھانپ لیتے ہیں۔ ڈلاس کے ایک اسٹور میں پہلے "ٹاپ لیس، بیدنگ سوٹ" کی نمائش کی گئی تھی تو اس کی شدید مخالفت ہوئی تھی اور ایکٹرس Gina Lollo Bringida نے اسے نسوانیت کے لئے باعث شرم "Attack on Feminity" قرار دیا تھا لیکن اب امریکا کو بھول جایئے جہاں اس وقت ایسے لباسوں کی مخالفت ہوئی تھی۔ اب تو ہندوستان جیسے روایت پسند ملک میں بھی بکنی مقبول ہوتی جارہی ہے۔

مشہور فیشن ڈیزائنر رُڈی گرن ویچ نے موجودہ زنانہ فیشن میں ہونے والی تبدیلیوں کے لئے مرد اور عورتوں کے تعلقات اور اُن کے ایک دوسرے سے توقعات (Aspirations) کو ذمہ دار قرار دیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ "بیس سال قبل" ایک نوجوان دوشیزہ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ معصوم اور بھولی بھالی دکھائی دے لیکن اب یہ معیار بدل گیا ہے، آج کی لڑکی سے سترہ سال کی عمر کو پہنچنے تک باشعور طور پر جنسی کشش اور بے باکانہ انداز اختیار کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔

"Cultivate Wild, Conciously Sexy Look"

موقر روزنامہ پائنیر نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا "مغربی ملکوں میں تیزی سے پھیلنے والی تحریک نسواں کا واحد مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ لباس سے کامل طور پر چھٹکارا حاصل ہوجائے۔ منی، مِڈی اور میکسی سے متعلق تمام بحث ومباحثہ فیشن کی نئی اختراع 'ہاٹ پینٹ' کے آنے سے ختم ہوگیا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہوگیا ہے کہ کہاں فیشن ختم ہوتا ہی اور کہاں ناشائستگی شروع ہوتی ہے۔ لبریشن کی تحریک اتنے زوروں پر ہے کہ کچھ ہی دنوں میں ہاٹ پینٹ بھی متروک ہوجائیں گے۔

فیشن ڈیزائنرس نے عورتوں کے لباس میں اتنی تبدیلیاں کی ہیں کہ بقول ایک اطالوی ڈیزائنر کے "عورتوں کو سوائے لطیف مسکراہٹ کے کچھ نہ پہننا چاہئے۔"

"Women Should Wear Little Besides Their Smiles, Bare Bosoms, Abdomen And Legs Flashed To The Forefront Slit Skirts. Galitzine, A Subtle Designer Also Favoured Exposing The Breasts Behind A See Through Chiffon."

اپنے سینہ وشکم کو عریاں رکھنا چاہئے اور خوبصورت ٹانگوں کو اسکرٹ سے باہر دکھانا چاہئے۔ گلیلیٹزئن جو ایک معتدل رائے رکھنے والے ڈیزائنر ہیں اُن کا بھی خیال یہ ہے کہ سینہ کو شفاف چلمن (تنزیب) سے ڈھکنا ہی کافی ہے۔

مشہور نفسیات داں جے۔ سی۔ فلوگل اپنی کتاب (Psychology of Clothes) میں لکھتے ہیں کہ "فیشن قدرت کی یک رُخی سے کبھی قانع نہیں رہتا بلکہ وہ نسوانی جسم کے کسی نہ کسی عضو کی طرف زیادہ رُجحان پیدا کردیتا ہے اور پھر وہی عضو صنفی کشش کا مرکز قرار پاجاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں ایک ایسا دور بھی گذر چکا ہے جب عورت کا سینہ غیر نمایاں ہوگیا تھا اور اُس کا شکمی حصہ مرکز توجہ بن گیا تھا۔"

جیمس لیور کا کہنا ہے کہ گذشتہ صدی میں عورت کی جنسی کشش کا مرکز، سینہ، ٹخنے، ناف، گردن سے لے کر بغل تک برابر بدلتا رہا ہے۔ ایک ایسا عہد بھی گذر چکا ہے جب عورتوں کی ٹانگیں جنسی دلچسپی کا مرکز تھیں اور لوگ منتظر رہتے تھے کہ وہ اپنے گھیر دار سائے سمیٹیں تو اُن کے ٹخنوں کی جھلک دیکھ سکیں۔

۱۹۶۷ء کے آس پاس عورتوں کی ساق دلچسپی کا مرکز ہوگئیں اور منی و مائکرو اسکرٹس مقبول ہوگئیں جن میں Hemline اتنے اُونچے ہوگئے جتنے کہ مہذب دور میں شاید پہلے کبھی نہ رہے ہوں گے اور اس کے بعد چُست پینٹ پہنے جانے لگے جن کے لئے Vogue (۱) نے لکھا ہے کہ "اب زنانہ پیر فیشن کی مرکز توجہ ہیں۔"

"The Leg is the Big Fashion Focus of the Moment"

ماڈرن خواتین کی توجہ جہاں تک اپنی زیبائش کا تعلق ہے اسی پر مرکوز ہے کہ چھاتی کے اُبھار کو کس طرح زیادہ سے زیادہ نمایاں کرکے پیش کیا جائے۔ ہیلن لارنس اپنے مضمون Rise & Fall of American Bosom میں لکھتی ہیں:

نفسیاتی اعتبار سے امریکا میں نسوانی چھاتیوں کا زبردست شعور پیدا ہوگیا ہے جس نے صنعت محرم سازی کو زبردست فروغ دیا، اس خوبصورتی کے خبط کو صنعت نے اشتہاروں کے ذریعہ مشتہر کرکے خوب نفع کمایا۔ پلاسٹک سرجری، گولیاں اور انجکشن سے لے کر مصنوعی پیڈ یا فوم، ربر کی مصنوعی چھاتیاں تک خوب فروخت

(۱) ایک فیشن میگزین

ہوئیں، یہاں تک کہ لباس شب خوابی میں بھی مصنوعی پیڈ لگائے جانے لگے۔ اشتہارات اُسے مشروبات سے لے کر کار تک کی فروخت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ فلم انڈسٹری اُسے صلاحیت کے مرادف قرار دیتی ہے۔ عام افراد کے ذہن میں نسوانی پیکر کا یہ تصور خوب سرایت کر گیا ہے۔ مصنوعی چھاتیوں والے محرم کا استعمال ایک فریب ہے جو امریکی عورتوں پر نادانستہ طور پر بڑے پستانوں کا خبط پیدا کر کے عائد کر دیا گیا ہے۔ جن کے ہوتی ہیں وہ اُنہیں دکھاتی ہیں اور جن کے نہیں ہوتیں وہ بازار جا کر خرید لاتی ہیں!

مضمون کے اختتام پر موصوفہ لکھتی ہیں:

''آئندہ تاریخ کا مبصر اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا زمانہ تھا جب ایک غیر پختہ مذاق کی قوم کے افراد نفسیاتی طور پر ''ماں سے وابستگی'' Mother Fixation کے جذبہ سے مغلوب ہو کر ایک عجیب و غریب رواج کے ماتحت پیڈ لگے ہوئے محرم پہناتے تھے اور ہمارے اس دور کا نام False Bosom Decade بھی قرار پا سکتا ہے۔''

برازیل میں منی اسکرٹس پہنے ہوئے ایک لڑکی بس میں سفر کر رہی تھی کہ اُس کی عریاں رانوں کو پاس بیٹھے ایک شخص نے کاٹ لیا۔ عدالت میں اُس شخص نے اپنے بچاؤ میں کہا کہ لڑکی کی عریاں رانیں دیکھ کر وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے پائنیر نے اپنے اداریہ میں لکھا:

ایک لڑکی کا سب سے اچھا رفیق جواہرات نہیں بلکہ مناسب لباس ہے۔ ستر کو مناسب حد تک ڈھکے رکھنا شرافت و شائستگی کی نشانی ہے، اور اپنے کو مردوں کی ہوسناکی سے بچانے کے لئے محفوظ ترین شیلڈ ہے۔ اس واقعہ سے تمام لڑکیوں کو عبرت حاصل کرنا چاہئے جو یہ سمجھتی ہیں کہ اُن کا جسم ایک شاپ ونڈو ہے اور اُنہیں سب کچھ دکھاتے رہنا چاہئے۔ انہیں اُس بھیڑیے ہوشیار بنا چاہئے جس نے اُس لڑکی کے کان میں چپکے سے کہا تھا کہ ''تم کتنی اچھی لگتی ہو جی چاہتا ہے کہ تم کو کھا جاؤں'' آج کے گھومتے ہوئے بھیڑیے بھی جب لڑکیوں کو اپنے جسم کے مختلف اعضاء کی عریاں نمائش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اُن کے جذبات بھی

برانگیختہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنی عفت کے تحفظ کی خاطر انہیں اپنے ستر کو مناسب حد تک ڈھکے رہنا چاہئے۔''

غسلِ آفتابی

ایمرے کیلن لکھتے ہیں کہ ''سویڈن میں ساحل سمندر پر عریاں غسل کرنے کا رواج کافی عرصہ سے چلا آرہا ہے۔ میں نے ۱۹۳۴ء میں سویڈن کے مغربی ساحل پر کئی ایسی عورتوں کو ننگے غسل کرتے دیکھا تھا لیکن یہ اتنی دوری پر ہوتا تھا کہ بغیر دوربین لگائے اُنہیں صاف دیکھنا ممکن نہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں عریاں کالونیز کا فیشن نکلا۔ مجھے یاد ہے کہ اُن دنوں ایک جرمن اخبار میں ایک ڈرائنگ نکلی تھی جس میں عریاں مرد و عورت کو سورج کی تیز روشنی میں کھڑے بات چیت کرتے دکھایا گیا تھا۔ مرد کو دکھایا گیا تھا کہ وہ مارے شرم کے اپنا ہیٹ اُتار کر اپنی برہنگی کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، اُس پر وہ عورت نرمی سے کہتی ہے ''ارے مہربان اطمینان رکھئے اپنے سر کو ڈھانک لیجئے!''

"Oh Please, Do Be Comfortable Cover Your Head"

وائز بڈن فیڈرل ری پبلک جرمنی کا پہلا شہر ہے جہاں سے ۱۹۷۲ء میں پبلک مقامات پر برہنہ غسل کرنے کا رواج شروع ہوا۔ شروع میں حکام کو فضیحتے کا اندیشہ تھا لیکن سب امن وسکون سے گذر گیا۔ ان پبلک حمام خانوں میں داخلہ کے ٹکٹ کے لئے زبردست بھیڑ رہی اور ایک خاص بات یہ دیکھی گئی کہ لائن میں نوجوانوں سے زیادہ ادھیڑ عمر کے لوگ تھے۔ فرانس میں اتنے کم لباس پہنے ہوئے غسل کرتی ہوئی عورتیں پہلے سینٹ ٹروپیز میں دکھائی دیں بعد میں نائس کے علاقہ میں۔ اب تو پیرس کے علاقہ میں بھی بغیر محرم پہنے عورتیں پبلک مقامات پر غسل کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ویک اینڈ پر چمکتے سورج کی روشنی میں ڈیلنگوئی سوئمنگ پول پر جو نیشنل اسمبلی سے چند گز کے فاصلہ پر واقع ہے عورتیں اپنے محرم اُتارے آزادی سے غسل کرتے دکھائی دیتی ہیں اور یہی نظارہ پیرس کے مغربی فیشن ایبل علاقہ Molitor میں دکھائی دیتا ہے۔

عریاں غسل آفتابی کیلیفورنیا کے وسیع ساحل پر ہمیشہ سے مقبول رہا ہے لیکن پہلے یہ پرائیوٹ طور پر ہوتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے آغاز سے گرمیوں کے ویک اینڈ پر سیکڑوں

کی تعداد میں یہ عریاں لوگ Pirate`s Cove تک آ جاتے تھے اور کبھی اُن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ۔ بڑی تعداد میں ایسے خاندان کے افراد آنے لگے جن کے ساتھ بچے بھی ہوتے تھے اور وہ چمکیلی سفید ریت پر کھیلتے رہتے تھے۔ایک نوجوان نے کہا کہ ننگے بدن پر جب سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ جب گھومتے پھرتے کسی دوشیزہ سے ملاقات ہوجاتی ہے تو آپ اُس سے دلچسپ گفتگو کا لطف اُٹھاتے ہیں چونکہ دونوں ننگے ہوتے ہیں اسلئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ So You Make Nothing Of It

ادھر کچھ دنوں سے جیسے باٹم لیس ڈانسنگ مقبول ہوگئی ہے اُسی طرح یہ عریاں غسل آفتابی والے بھی پبلک بیچ پر آنے لگے ہیں۔ لاس اینجلز کاونٹی محفوظ ترین مقام ہے جہاں پبلک مقامات پر عریاں غسل کیا جاسکتا ہے۔کاونٹی کا وہ قانون جس میں شاہ راہِ عام پر غسل کرنے کو مخربِ اخلاق بتایا گیا تھا عدالت نے خارج کردیا، اب نہ کوئی شکایت کرتا ہے اور نہ کوئی گرفتاری عمل میں آتی ہے۔

عریاں کیمپس والے ساحل سمندر پر عریاں غسل کرنے والوں کو رشک کی نظروں سے دیکھتے ہیں کیونکہ اُن کے کیمپس اندر کی طرف واقع ہوتے ہیں اور ساحل سمندر کے کھلے علاقہ میں غسل کرنے کی خواہش ہر فرد میں ہوتی ہے، اسی لئے ورلڈ کانگریس آف انٹرنیشنل نیچرلسٹس فیڈریشن نے بھی یہ طے کیا کہ وہ بھی اپنی دو میٹر اونچی چار دیواری سے باہر آجائیں تاکہ دوسرے لوگ دیکھ سکیں کہ اُن کے نیچر کیمپس میں کیا ہوتا ہے۔ کانگریس مذکور نے کھلی ہوا میں ایک سروس کرائی جس میں ایک بشپ نے شرکت کی جو خود تو پورا لباس پہنے تھے لیکن اُن کے سامعین سب کے سب برہنہ تھے۔ یہ برہنہ افراد جو یسے تو اپنی برہنگی سے بالکل غیر متعلق رہتے تھے لیکن فوٹو لئے جانے کے خیال سے قدرے فکر مند ہوئے۔ وکار نے اتنے کثیر برہنہ مجمع میں اپنی سروس بغیر جھجک کے انجام دی۔ کانگریس کے برہنہ اجلاس میں شرکت کے لئے ساری دُنیا کے ملکوں سے ڈیلی گیٹس (Delegates) آئے ہوئے تھے۔ایک ترجمان نے تردید کی کہ عریانیت اور سیکس میں کوئی تعلق ہے۔

A Spokesman Denied That There Was Any

Link Between Nudism And Sex

اٹلی میں برہنگی کے خلاف قوانین ۱۹۷۱ء تک بہت سخت تھے جب Paria میں

سو برہنہ جمع ہوئے اور انہوں نے اٹیلین لیگ فار لیگلائیزیشن آف نیوڈزم۔ Italian League For Legalisation Of Nudism کی بنیاد ڈالی۔ اس لیگ کے صدر ایک انجینئر تھے جنہوں نے کہا کہ تندرستی کے اس مسلک۔ نیچرازم اور نیوڈزم کو اٹلی میں بھی قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہئے جیسا کہ دُنیا کے دوسرے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ برہنگی میں کوئی ناشائستگی نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اٹلی میں اس مسلک پر عمل کرنے والے 30 ہزار افراد ہیں جن میں سات ہزار نیشنل اسوسی ایشن کے ممبر ہیں۔

وہائٹ روز نیوڈسٹ کلب (انگلینڈ) کے منتظمین نے بتایا کہ ایک پادری نے بھی ممبر شپ کی درخواست دی ہے لیکن وہ اُسے ممبر اس لئے نہیں بنا سکتے کہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ کلب صرف شادی شدہ افراد کو اور اُن کے خاندان والوں کو ممبر بناتا ہے ہاں وہ اُسے اعزازی چیپلین بنا سکتے ہیں۔

امریکا کا سب سے قدیم غسل آفتابی کا مرکز شکاگو سے ۶۴ کیلو میٹر دور واقع ہے جس کا نام ہی Naked City ہے یہ ۱۹۳۳ء میں زیرو نیچر پارک کے نام سے قائم کیا گیا تھا اور یہ صرف شادی شدہ جوڑوں اور اُن کے خاندان والوں کو ممبر بناتا ہے۔ اس کے مالک Dick Drost نے پہلا مس نیوڈ امریکا، کا مقابلہ منعقد کیا تھا جس میں ریاستہائے متحدہ امریکا کی ۵۰ ریاستوں سے ہر ریاست کے نمائندہ نے شرکت کی تھی۔ ڈراسٹ کا کہنا ہے کہ ”دراصل مقابلۂ حسن برہنہ ہی ہونا چاہئے جیسا کہ قدیم یونان اور روم میں ہوتے تھے۔ بیدنگ سوٹ کے سُپر اسٹرکچر میں صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ واقعی عورت کے حسن میں کتنی دلکشی ہے؟ اس مقابلہ میں جیتنے والیوں کو زیورات، نقد ڈالر کے بانڈ، وارڈ روب اور سنگار کی بیشمار اشیاء دی گئیں۔

سوئزرلینڈ اپنی قدامت پسندی کے لئے مشہور تھا۔ جینوا جو Calvinism کی پیدائش کا مقام ہے وہاں کا اخلاقی معیار اتنا بلند تھا کہ بیلڈ گانے والوں کو پھانسی کی سزا کا اندیشہ رہتا تھا اور برن Berne رواجی طور پر Staid شہر رہا ہے وہاں بھی ۱۹۷۸ء کے بعد سے پبلک سوئمنگ پولس پر ٹاپ لیس بیدنگ کی اجازت سرکاری طور پر دے دی گئی ہے جس میں جینوا اور برن کے Pools بھی شامل ہیں۔

عریانیت ایک طرزِ زندگی

ایمسٹرڈم میں عریاں فوٹوگرافس کی ایک نمائش ۱۹۸۷ء میں ہوئی تھی جس میں ۱۸۴۰ء سے لے کر اب تک دُنیا کے مختلف ملکوں میں کھینچے گئے عریاں فوٹو دکھائے گئے تھے۔ اس نمائش کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ فوٹوگرافک کیمرہ کی ایجاد جو ۱۸۳۹ء میں ہوئی تھی اس وقت سے ہی عریاں فوٹو لینے کا رواج چل پڑا تھا۔

"Explicit Sex Scenes Were Photographed Almost As Soon As Photography As A Workable Medium Was Invented In 1839"

اور اب تو امریکا اور یورپ میں عریانیت ایک طرزِ زندگی ہوگئی ہے۔ بہ مشکل ہی کوئی ایسی فلم یا رسالہ نظر آئے گا جس میں کسی نہ کسی عریاں دوشیزہ یا اداکارہ کا فوٹو نہ ہو۔ معروف ایکٹرس Ursula Andrees کے اتنے عریاں فوٹو چھپے کہ اُسے "Ursula Undress" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

Sandpipe نامی فلم میں الزبتھ ٹیلر کے متعدد فوٹو اس ہیئت سے لئے گئے ہیں جس میں اُسے اپنی چھاتی کو صرف ہاتھ سے ڈھکے ہوئے دکھایا گیا اور اُس کا عریاں سُرخ چوبی مجسمہ ساری فلم میں متعدد بار دکھایا گیا ہے۔ لندن میں ہیٹ فروخت کرنے والی ایک فرم کے شوکیس میں چھ برہنہ لڑکیوں کو سر پر ہیٹ پہنے دکھایا گیا جو جسم پر کچھ بھی نہیں پہنے تھیں۔ سسلی میں قانون کے کلاس میں دروازہ پر دستک ہوئی، پروفیسر نے اندر آنے کی اجازت دے دی، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خوبصورت حسینہ بالکل برہنہ صرف پیروں میں سینڈل پہنے کلاس میں داخل ہوگئی۔ پروفیسر موصوف نے چلا کر کہا 'کوئی اسے ڈھک دو' اتنے میں ایک کوٹ ہوا میں لہراتا ہوا آکر اُس حسینہ کے شانے پر ٹنگ گیا۔ بعد میں طلباء کے درمیان گرما گرم مباحثہ ہوا کہ کیا کلاس روم میں برہنگی کی حالت میں آنے کی اجازت ہونا چاہئے؟

ملبورن میں ایک شارع عام پر پانچ لڑکیوں نے ٹاپ لیس ہوکر ٹریفک کو روک دیا وہ اسٹرپ ٹیز ڈانسرز کے خلاف کمیونٹی کے رویہ پر احتجاج کر رہی تھیں۔

اسپین میں پُرانے زمانے سے عورتوں کے بکنی پہن کر نہانے پر پابندی چلی آ رہی تھی۔ عورتوں نے اس پابندی کو ختم کرانے کا ایک نیا طریقہ اپنایا، وہ گون پہن کر سوئمنگ پول کے اندر گئیں اور اُسے اُتار کر بکنی پہنے غسل کرنے لگیں، جب پولیس نے مزاحمت کی تو انہوں نے اپنے زیر جامے اُتار پھینکے، شرم کے مارے پولیس پیچھے ہٹ گئی اور بالآخر یہ پابندی ختم ہوگئی! ہیمبرگ کے ایک اجلاس میں ایک طالبہ ملزمہ مجسٹریٹ کے سامنے کمر تک برہنہ ہوگئی، سارے اجلاس میں افراتفری پھیل گئی۔ کھیلوں میں بھی برہنگی کے مظاہرے روز افزوں ہیں۔ سان فرانسکو میں عریاں گولف کھیلا جاتا ہے اور میکسیکو میں عریاں برف پر پھسلنے کا کھیل نہایت گرمجوشی سے کھیلا جاتا ہے۔ سان فرانسکو میں ایک کالج کی خاتون ٹیچر کو برہنگی کی حالت میں شاعری پڑھانے پر جرمانہ عائد کیا گیا، انہوں نے احتجاج کے طور پر اپنی بکنی کا بالائی حصہ اُتار پھینکا اور ٹاپ لیس ہوکر شارع عام پر آکر اس کارروائی کے خلاف احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں عورتوں کے اس حق کی موافقت میں یہ مظاہرہ کر رہی ہوں کہ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ ''اگر وہ چاہے تو اپنا محرم اُتار کر گھوم سکتی ہے۔ میں بکنی میں پیدا نہیں ہوئی تھی مجھے یہ حق ہے کہ میں جیسا لباس چاہوں پہنوں۔'' کناڈا میں ایک بیس سالہ دوشیزہ کامل طور پر برہنہ صرف پیر میں سینڈل پہنے وزیر اعظم کے دفتر کی گیلری میں نکل آئی اور پھر سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے چلی گئی اور سیکوریٹی حکام دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے!

لندن میں ایک ادھیڑ سن بیوہ مقامی امدادی فنڈ میں چندہ جمع کرتے ہوئے ایک شخص کے دروازہ پر پہنچیں تو وہ بالکل برہنہ دروازہ پر آ گیا، موصوفہ اس معاملہ کو عدالت میں لے گئیں اور وہاں کہا کہ اس شخص کو برہنہ دیکھ کر انہیں اتنا زبردست دھچکا لگا کہ اُسے دور کرنے کے لئے انہیں ایک گلاس برانڈی پینا پڑی۔ پارکنگ کی عدالت نے اپنے فیصلہ میں کہا:

''انگلش قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں جس کے تحت ننگوں کو اپنے گھروں کے اندر اپنے مسلک پر عمل کرنے سے روکا جاسکے!''

سڈنی کے فیشن ایبل علاقہ کے ایک کافی ہاؤس میں چھ لڑکیاں داخل ہوئیں وہ ساحلی لباس پہنے تھیں لیکن بیرے کو آرڈر دینے کے بعد انہوں نے اوپر کا لباس اُتار کر رکھ

دیا اور صرف پیراکی کا لباس جسم پر رہ گیا، گاہکوں نے اعتراض کیا کیفے کے منیجر نے آ کر لڑکیوں سے کہا کہ آپ لباس پہن لیں یا باہر چلی جائیں، انہیں لباس پہننا گوارا نہ ہوا اور وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں! جاتے وقت ایک لڑکی نے کیفے میں رکھے ہوئے مجسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم اُن عریاں و نیم عریاں مجسموں سے کہیں بہتر ہیں!

اٹلی کے شہر میلان کی ایک پُر ہجوم شاہراہ پر ایک ۲۲ سالہ جوان لڑکی نہایت مختصر زیر جامہ اور محرم پہنے گھومتی پائی گئی، پولیس نے اُسے ناکافی لباس پہننے کے الزام میں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا لیکن ٹرائیبونل نے ایک عجیب و غریب فیصلہ دیتے ہوئے اُسے رہا کر دیا، فیصلہ میں کہا گیا کہ ''جہاں تک پبلک اعضائے نسوانی کو آزادانہ عریاں دیکھنے کی عادی ہوگئی ہے قانون کو بھی رائے عامہ سے پیچھے رہنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نمائش صرف جمالیاتی اسباب کی بنا، پر قابل قبول ہو سکتی ہے۔ جبکہ ایک نوجوان عورت جس میں حسن و دلکشی پائی جاتی ہو ہمیشہ ہمیشہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے چیز ہے ایک حسین شخص (خواہ مرد ہو یا عورت) کو ناکافی لباس میں دیکھنے سے تنفر پیدا ہوتا ہے لہٰذا یہ جمالیاتی اور قانونی دونوں نقطہ ہائے نظر سے قابل اعتراض ہے کیونکہ اُس کے دیکھنے سے ایسا ردِ عمل ممکن ہے جو نقص امن کا باعث ہو سکتا ہے!''

ان برہنہ کلب میں شادیوں کی رسم بھی برہنہ حالت میں منعقد ہوتی ہیں۔ فلوریڈا کے ایک برہنہ کلب کے ڈائرکٹر کی دختر کی شادی بالکل برہنہ تقریب کے ساتھ انجام پائی۔ حسین بھورے بالوں والی دلہن صرف ایک نقاب اور اُونچی ایڑی کی چپلیں پہنے تھی، اس کے علاوہ اُس کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ دولہا کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا۔ تقریب میں شرکت کرنے والے اخباری نمائندے بھی برہنہ تھے، تحفہ پیش کرنے والی انگوٹھیاں وغیرہ اپنے ہاتھ میں لے گئے کیونکہ جیب کسی کے تھی ہی نہیں۔ ساری محفل میں صرف ایک شخص لباس پہنے تھا اور وہ تھا ایک مقامی وکیل جس نے رسم شادی ادا کرائی تھی!

جاپان کے ایک جوڑے نے دُنیا کی پہلی عریاں بڈ ان وڈنگ Bed-in-Wedding شادی کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا! یہ شادی ایک اسٹیک بار میں پاپ میوزک کی دُھنوں میں انجام پائی۔ یہ جوڑہ کامل طور پر برہنہ تھا، صرف دل کی شکل کے سفید کاغذ کے دو ٹکڑوں سے شرمگاہ کو ڈھکا گیا تھا۔ جوڑے نے ایک انسان کے

مجسمہ کے سامنے ایک دوسرے کو بغلگیر کیا، بوسہ لیا اور دولہا دلہن کو گود میں لے کر پاس کے کمرہ میں چلا گیا جہاں ڈبل بیڈ پر اُسے لٹا دیا 135 اخباری نمائندے اور کیمرہ مین اُن کے پیچھے گئے اور اسنیپ شاٹ لئے دولہا نے کہا کہ ''ہماری شادی شفاف محبت پر مبنی ہے۔ ہم نے برہنہ شادی کرنا اس لئے طے کیا تا کہ ہم کسی سے کچھ چھپا نہ سکیں۔''

جیکسن وِلے میں ایک کار دھونے کی کمپنی نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے پانچ برہنہ عورتوں کو اس کام پر معمور کیا، پولیس کو خبر ہوئی تو اُس نے گیرج کے منیجر کو Felony کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ منیجر نے تسلیم کیا کہ وہ برہنہ لڑکیوں کو لگائے ہوئے ہیں لیکن ان کا گیرج عام راستے سے ہٹ کر اندر کی طرف واقع ہے جہاں عام لوگوں کی نظریں نہیں پڑتیں۔ مغربی جرمنی کے دو نوجوان برہنہ سائیکل کی سواری کرتے ہوئے اٹلی پہنچے جہاں پولیس نے انہیں پبلک مقام پر ناشائستہ حرکت کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ وہ اپنے شہر سے اسی طرح سواری کرنے چھٹی منانے نکلے ہیں اور اب جبکہ ان کی منزل صرف ۲۵ کلومیٹر دور رہ گئی ہے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

انٹرنیشنل نیچرسٹ فیڈریشن کی اکیسویں کانگریس یوگوسلاویہ میں ستمبر ۱۹۸۸ء میں منعقد ہوئی، جس میں ۲۱ ملکوں سے پانچ سو برہنوں نے شرکت کی۔ امریکا، کناڈا اور یوگوسلاویہ کے علاوہ ۱۸ یوروپی ملکوں سے بھی نمائندے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ برٹش ایرویز نے بھی نیوڈازم کے اس کاروبار میں شرکت کر لی، وہ چھٹیاں منانے والے نیچرلسٹ کو یورپ کے مختلف بیچ پر اور بحر روم کے علاقے میں پہنچاتے ہیں اور اُن کی فلائٹ کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں۔ یورپ میں ۱۴۳۸ ایسی نیوڈسٹ بیچ ہیں اور انگلینڈ میں آٹھ۔ برطانیہ کے مشہور شہر ناٹنگھم میں عریاں لباس پہنے خوبصورت لڑکیوں کے مختلف گروہ سڑکوں پر اتنی بے باکی سے گھومتی پھرتی رہتی ہیں کہ وہاں کار ڈرائیور کو خبردار کرنے کے لئے سڑکوں پر ایسی تختیاں لگی ہوتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے:

"Danger! Girls in Sexy Dresses Ahead Keep Your Eyes On The Road"

برہنگی کامل کا نیا فیشن اسٹریکنگ (Streaking) کے نام سے ۱۹۷۴ء میں امریکا کے دانش کدوں ہارورڈ یونیورسٹی اور بعض دوسری یونیورسٹیوں سے شروع ہوا اور بعد میں ایک فیڈ

(Fad) کی طرح یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیل گیا۔ برہنگی کے اس مظاہرہ میں طلبہ وطالبات دونوں اس طرح حصہ لیتے ہیں کہ کسی بڑی سڑک یا ہاسٹل، تعلیم گاہ یا پبلک مقام پر بغیر اطلاع کے یکا یک بالکل برہنہ ہو کر دوڑنا (Dashing) شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی اس کا مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ عمارتوں کی بالائی منزل پر لڑکیاں اور لڑکے بالکل برہنہ حالت میں اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں کہ سڑکوں پر گزرنے والوں کی نظر اُن پر پڑ کر رہے۔ ایسے موقع پر پریس رپورٹر بھی پہنچ جاتے ہیں اور ٹیلی ویژن کیمرہ سے فوٹو بھی لئے جاتے ہیں۔ بسا اوقات یہ طلباء لڑکیوں کے ہاسٹل میں ٹیلیفون کر دیتے ہیں کہ وہ اس مقصد سے آ رہے ہیں اور پھر تھوڑی دیر میں گروپ میں برآمد ہو کر اپنا یہ دلچسپ مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔

اٹلانٹک کو پار کر کے اب یہ 'فیڈ' برطانیہ میں بھی پہنچ گیا ہے جہاں کئی کالجوں کے طلبہ وطالبات نے اسے اپنا لیا ہے لیکن وہاں یہ بہت 'گراں' ثابت ہو رہا ہے۔ برکن ہیڈ میں دو طلبہ کو 115 ڈالر اور ایک طالبہ کو ناشائستہ برہنگی کے الزام میں دس پاؤنڈ جرمانہ عائد کیا گیا۔

اس نئے فیڈ کی ابتدا لڑکوں نے کی، پھر دھیرے دھیرے لڑکیوں نے بھی اسے اپنا لیا۔ ٹے نی سی (Tennese) برکلے، میمفس سے ہوتے ہوئے یہ تقریباً سب ہی امریکی یونیورسٹیوں میں پھیل گیا۔ ایک کلاس کے ختم ہوتے ہی ایک نوجوان مادرزاد برہنہ ایک پاس کھڑی ہوئی کار پر چڑھ گیا بعد میں تین چار نوجوان لڑکیوں کی ڈارمیٹری میں اسی حالت میں گھس گئے۔ کچھ لڑکے ایک کلاس کے اندر ایسے ہی برہنہ حالت میں داخل ہوگئے۔ لکچرر حیرت انگیز! چیختے ہی رہے۔ مینوٹا میں اسٹیج پر شیکسپیئر کا ڈرامہ دکھایا جا رہا تھا۔ ایک نوجوان طالبہ برہنہ اسٹیج پر آ گئیں، یہ اسٹریکنگ انہیں گراں پڑی کیونکہ انکے بوائے فرینڈ نے ناراض ہو کر انہیں چھوڑ دیا۔

آسٹریا کی ایک لباس تیار کرنے والی کمپنی نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ اسکیم چلائی کہ جو گاہک بالکل عریاں حالت میں اس کے تیار کردہ لباس کو خریدنے کے لئے دوکان پر آئے گا اُسے 385 ڈالر کی مالیت کے کپڑے مفت انعام میں دئے جائیں گے! ملک میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو اس کے لئے تیار ہو کر جوق در جوق پہنچنے لگے، لہٰذا کمپنی موصوف کو اپنا یہ مقابلہ چالیس اسٹورس پر آنے والے پہلے پانچ افراد پر محدود کرنا پڑا۔ (Toi 25.2.2002)

باب ۳

مے نوشی ومنشیات

شراب نوشی اور ڈرگس کا ناروا استعمال آج متمدن دُنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ مے نوشی تو دُنیا میں صدیوں سے رائج ہے لیکن پہلے اس کا استعمال معاشرہ کے اعلیٰ طبقوں تک محدود تھا لیکن اب "سوشل ڈرنکنگ" کو متمدن طرز رہائش کا جز لاینفک سمجھا جانے لگا ہے اور معاشرہ کے ہر طبقہ میں یہ عام طور پر رائج ہوگئی ہے۔ اس سے بھی مہلک وخطرناک لت نشیلی ادویات کا استعمال ہے جس کا بین الاقوامی کاروبار صرف اس ربع صدی میں بڑھ کر 300 ارب (300 Billion) ڈالر تک پہنچ گیا ہے جو اسلحہ جات کی تجارت کے بعد سب سے بڑا کاروبار ہوگیا ہے۔ انٹرنیشنل آرگنائزیشن آف گڈ ٹمپلرس (IOGT) کے چیئر مین کا کہنا ہے کہ "ڈرگس کسی بھی ملک کی ترقی کو روک دیتی ہیں اور معاشرتی قدروں کو بُری طرح پامال کر دیتی ہیں۔"

Drugs Hampered Country's Progress And Eroded Values

انہوں نے کہا کہ الکحل کے کثرت استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل آج بیشتر ترقی یافتہ ملکوں کا دردسر بن گئے ہیں۔ امریکا میں دو تہائی جرائم کا ارتکاب اُن اشخاص کے ذریعہ کیا جاتا ہے جو شراب کے نشے میں ہوتے ہیں۔ سوئیڈن جیسے خوشحال ملک میں اسپتالوں میں بھرتی 25 فیصدی افراد کثرت مے نوشی سے پیدا ہونے والے امراض کا علاج کرا رہے ہیں اور وہاں کی حکومت ہر سال 100 ارب (100 Billion) سوئیڈش کرونز (چالیس ارب روپے) ہر سال شراب کے ناروا استعمال کو روکنے میں خرچ کرتی ہے۔

ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ (1994) میں بتایا گیا کہ امریکی باشندے نارکوٹکس پر اتنی ترقی پذیر ملکوں کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ 70 فیصدی بالغ

امریکی کثرت سے شراب پیتے ہیں جس پر لاکھوں ملین ڈالر کے مصارف ہوتے ہیں۔ کثرت مے نوشی سے پیدا ہونے والے امراض کے دوا علاج نیز دیگر اقتصادی خسارہ سے ملک کو ہر سال 117 ارب ڈالر ($117 Billion) کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اتنی رقم سے روانڈا یا ایتھوپیا جیسے ملکوں کی پوری آبادی کو کھانا کھلایا جاسکتا ہے۔ کثرت مے نوشی کے باعث ملک کے اندرونی تشدد سے نپٹنے کے لئے امریکا نے ۱۹۹۲ء میں 425 ارب ڈالر ($425 Billion) خرچ کئے پھر بھی پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ امریکا میں ہر سال ایک لاکھ افراد مے نوشی سے متعلق امراض میں مبتلا ہو کر فوت ہو جاتے ہیں! ڈرگس سے متعلق جرائم کے لئے ریاستہائے متحدہ امریکا میں ۱۹۸۳ء میں 58 ہزار افراد ماخوذ تھے۔ ۱۹۹۳ء میں یہ تعداد بڑھ کر تین لاکھ پچاس ہزار ہو گئی!

الکحل کا بڑھتا ہوا کاروبار

دُنیا کے بیشتر ملکوں میں الکحل کی تیاری میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔ دو تہائی اضافہ یورپ اور شمالی امریکا کے ملکوں میں ہوا۔ جبکہ ان ملکوں میں آبادی کے اضافہ کی در کم رہی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ الکحل کا استعمال تیسری دُنیا کے ملکوں میں بڑھ رہا ہے جو ان ترقی یافتہ ملکوں سے تیار کردہ شراب کی درآمد کرتے ہیں۔ دُنیا میں انگور کی شراب کی تیاری 298.5 ملین ہیکٹو لیٹر تک پہنچ گئی۔ فرانس کی مشہور شراب شیمپین کے سالانہ سیل میں گذشتہ تیس سال میں تین گنا اضافہ ہوا ہے اور اب اس کی (200 ملین) بیس کروڑ بوتلیں شائقین تک پہنچتی ہیں! امریکا کا بیئر مارکیٹ 37 ارب ڈالر ($37 Billion) کا ہے جو اقوام متحدہ کے بہت سے ممبر ملکوں کے جی این پی سے بھی زیادہ ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء کی درمیانی مدت میں دُنیا میں شراب کی تیاری میں 19 فیصدی، بیئر میں 68 فیصدی اور اسپرٹس میں 61 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کی درمیانی مدت میں دُنیا کے تمام ملکوں میں شراب کی تیاری میں زبردست اضافہ رہا جو آبادی کے اضافہ سے بھی زیادہ رہا۔ یہ اضافہ شراب میں 40 فیصدی اور بیئر میں 124 فیصدی رہا۔ ایشیا میں بیئر کی تیاری میں 500 فیصدی، افریقہ میں 400 فیصدی اور لاطینی امریکا میں 200 فیصدی اضافہ اس 20

سال کی مدت میں رہا۔ اس نے سپلائی اور مانگ کے قانون کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے، اب سپلائی مانگ پیدا کر رہی ہے جبکہ پہلے صورتحال اس کے برعکس تھی!

فرانس میں شراب سازی کی صنعت میں دس لاکھ افراد لگے ہوئے ہیں اور انگور کی کاشت میں سوا دو لاکھ افراد کام کرتے ہیں اور ہوٹلوں نیز بار میں شراب کے بیئرر کی حیثیت سے تقریباً چار لاکھ ۱۰ ہزار افراد برسرروزگار ہیں۔ ملک کے خزانے میں سب سے زیادہ آمدنی 25 ارب فرانک شراب کے ٹیکس سے ہوتی ہے۔ پولینڈ میں شراب کی تیاری کرنے والا کارخانہ Polomos ملک کا سب سے زیادہ دولت کمانے والا کارخانہ ہے۔ ملکی خزانے کو اس سے چار ارب ڈالر ($4 Billion) سالانہ سے بھی زیادہ آمدنی ہوتی ہے جو ملک کی دوسری بڑی صنعت پیٹروکیمکلس سے دُگنی ہے۔ دُنیا میں سب سے زیادہ شراب تیار کرنے والے دس ملکوں میں میکسکو ایک ہے وہاں بیئر کی روزانہ تیاری 2665 ملین لیٹر تھی، اس طرح بیئر کی صنعت موٹر کار اور فولاد سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ مصر میں شراب سازی کی صنعت فروغ پر ہے اور حکومت کے ذریعہ چلائے جانے والے کارخانے بھاری منافع کما رہے ہیں۔ ہندوستان میں ہر سال تقریباً 6.75 کروڑ لیٹر شراب قانونی طور پر تیار کی جاتی ہے۔ ملک کی الکحل کی صنعت کا تخمینہ 1200 کروڑ روپے لگایا گیا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ملک میں 6.900 لاکھ لیٹر الکحل تیار کیا گیا جو صنعتی ضرورتوں اور مے سازی میں استعمال کیا گیا۔ ملک میں الکحل کی پیاس برابر بڑھتی جارہی ہے۔ ۱۹۸۷-۸۸ء میں 340.00 ملین لیٹر شراب پی گئی۔

شراب سازی کی صنعت میں لگے ہوئے سرمایہ دار اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے ہزاروں ملین ڈالر شراب کے اشتہارات پر خرچ کرتے ہیں اور اُن کا نشانہ نوجوان ہوتے ہیں۔ اشتہارات کے ذریعہ یہ پیغام پہنچایا جاتا ہے کہ 'قوی مرد' پیتے ہیں نوجوانوں کے ذہن پر یہ ثبت کر دیا جاتا ہے کہ شراب آزادانہ رُومانی زندگی گزارنے میں معین ہوتی ہے اور شراب خریدتے وقت وہ یہ تصور رکھیں کہ وہ بے پایاں مسرتیں، شادمانی اور رُومانی لمحاتِ زندگی بسر کرنے کا سامان خرید رہے ہیں۔ برطانیہ میں کرسمس کے موقع پر پچاس ملین پاؤنڈ شراب کے اشتہارات پر خرچ کئے گئے۔

شراب میں ڈوبی ہوئی دُنیا

متعدد سائنسی تجربات وتحقیقات سے شراب کے دماغی وجسمانی اثرات واضح ہونے کے باوجود مغربی ملکوں میں شراب بے دریغ استعمال کی جاتی ہے۔

امریکا: امریکا کا پسندیدہ مشغلہ ہی سوشل ڈرنکنگ ہے، یہاں ہر سال دس ہزار ملین ڈالر سے زیادہ صرف بادہ نوشی پر صرف کئے جاتے ہیں۔ یہاں کم از کم بارہ کروڑ افراد مے نوشی کا شغل رکھتے ہیں، اُن میں اسّی لاکھ افراد تو اس کے عادی ہو چکے ہیں اور پندرہ لاکھ تو کثرت مے نوشی کی وجہ سے اپنی جسمانی ودماغی صلاحیتوں کو بُری طرح مجروح کر چکے ہیں۔ یہاں ۱۴ سال کی عمر سے ہی بچے شراب نوشی شروع کر دیتے ہیں۔ بیشتر امریکی شہروں میں ۸۵ فیصدی بچے شراب پیتے ہیں۔ محتاط تخمینہ کے بموجب امریکا کے ۷۵ فیصدی مرد اور ۶۶ فیصدی عورتیں عادی مے نوشی ہیں۔ اس وقت امریکا میں دس ملین عادی میخوار ہیں جن میں 3.3 ملین اٹھارہ سال سے کم عمر کے نوجوان ہیں۔ یہاں ہر تین عورتوں میں ایک عادی مے نوش ہوتی ہے اور یہ تعداد برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ کثرت مے نوشی کے باعث عورتیں جن جسمانی اور دماغی پریشانیوں سے دوچار ہوتی ہیں وہ کہیں زیادہ پیچیدہ اور سنگین ہوتی ہیں۔ بہ مقابلہ ان پریشانیوں کے جن کا سامنا مردوں کو کرنا پڑتا ہے۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۳ء کے درمیان امریکا میں پیدا ہونے والے بچوں میں فیٹل امراض (Foetal Diseaese) میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد میں چھ گنا اضافہ ہوا ہے اور اس کا ایک اہم سبب یہ رہا ہے کہ اُن کی مائیں کثرت مے نوشی کا شکار رہی ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں ہر دس ہزار پیدائشوں میں ایسے امراض سے متاثر ہونے والے بچوں کا تناسب 6.7 تھا جبکہ ۱۹۷۹ء میں یہ صرف ایک تھا۔ کثرت مے نوشی مردوں سے زیادہ عورتوں کے دل کو خراب کر دیتی ہے۔ تجربات میں یہ پایا گیا کہ Cardiomyopathy کی شکایت (جس میں دل کے پٹھے خراب ہو جاتے ہیں) مردوں سے دوگنا عورتوں کو ہو جاتی ہے۔

ایک معتبر ادارہ نے اُن نقصانات کا تخمینہ لگایا ہے جو امریکا کو اپنے مے نوشوں کی اس لت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہر سال اُٹھانا پڑتا ہے، اس خسارہ کی تفصیل یہ ہے:

۱)	اسپتالوں میں دوا علاج	1 ارب 66 کروڑ 20 لاکھ ڈالر
۲)	جیلوں میں اُن کے رہنے کے مصارف	1 ارب 65 کروڑ 50 لاکھ ڈالر

۳)	مے نوشوں کو ملنے والی اُجرت کا نقصان	37 کروڑ 60 لاکھ ڈالر
۴)	حادثات سے نقصان	17 کروڑ 80 لاکھ ڈالر
	میزان:	3 ارب 86 کروڑ 60 لاکھ ڈالر

اسی لئے امریکا کے نیشنل ہائی ویز پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے: اگر آپ نشہ کرتے ہیں تو گاڑی نہ چلائیں، اگر آپ گاڑی چلاتے ہیں تو نشہ نہ کریں۔

(ریڈینس ۹-۱۵ ستمبر ۱۹۹۰ء)

یورپ

یورپ کے ملکوں میں فی کس الکحل کے استعمال میں نمبر ایک پر جرمنی ہے جہاں ۱۹۹۴ء میں 170 لیٹر الکحل فی کس استعمال کی گئی۔ آسٹریا، ڈنمارک، بلجیم اور آئرلینڈ میں فی کس استعمال 130 لیٹر رہا۔ جنوبی یورپ کے ممالک اسپین، پرتگال اور یونان میں بیئر کا استعمال روز افزوں ہے۔ آئرلینڈ اور جرمن باشندے دُنیا کے سب سے زیادہ بیئر پینے والے ہیں جہاں فی کس بیئر کا استعمال 137 لیٹر رہا، اس کے بعد برطانیہ 101 لیٹر، نیوزی لینڈ 98 لیٹر اور آسٹریلیا 95 لیٹر کا نمبر رہا۔ سافٹ ڈرنک کاربونیٹس کا فی کس استعمال امریکا میں 183 لیٹر، ایکوڈوریا میں 177 لیٹر اور نیوزیلینڈ میں 129 لیٹر رہا۔ کچھ دوسرے ملکوں میں کاربونیٹس کا سیل:

امریکا 68,271 ملین ڈالر	برازیل 7760 ملین ڈالر
چلی 9520 ملین ڈالر	بھارت 7266 ملین ڈالر
جاپان 8593 ملین ڈالر	

دُنیا کے کچھ ملکوں میں خالص الکحل کا فی کس استعمال ذیل کے نقشہ میں پیش ہے:

فرانس	13.9 لیٹر	اٹلی	13.0 لیٹر
مشرقی جرمنی	13.4 لیٹر	ہنگری	12.3 لیٹر
پرتگال	13.1 لیٹر	پولینڈ	6.7 لیٹر
اسپین	12.7 لیٹر	روس	5.7 لیٹر
برطانیہ	7.1 لیٹر	ناروے	4.1 لیٹر

انگور کی شراب کا استعمال کرنے والوں میں اٹلی کا نمبر سب سے آگے ہے جہاں فی کس سالانہ اوسط ۹۱ لیٹر ہے، اس کے بعد فرانس، پرتگال اور ارجنٹائنا کا نمبر آتا ہے۔ بیئر کا استعمال کرنے والوں میں مشرقی جرمنی سب سے آگے ہے جہاں کا فی کس سالانہ اوسط 148 لیٹر ہے، اس کے بعد زیکوسلواکیا، مغربی جرمنی اور بلجیم کا نمبر آتا ہے۔ اسپرٹس (جس میں 40% تک الکحل شامل ہو) کا سب سے زیادہ استعمال کرنے والے بھی مشرقی جرمنی کے باشندے ہیں جہاں کا سالانہ اوسط 12.2 لیٹر ہے۔ اس کے بعد ہنگری، پولینڈ اور زیکوسلواکیا کے باشندوں کا نمبر آتا ہے۔

برطانیہ

برطانیہ کے نوجوانوں میں شراب نوشی خاصی بڑی حد تک پھیل گئی ہے، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو بچے کمسنی میں ہی شراب پینے کے عادی ہو جاتے ہیں اُن کی ڈرنک کی مقدار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ الکحلیت کا علاج کرانے والوں میں تقریباً 25 فیصدی نوجوان ۱۹ سال سے کم عمر کے ہوتے ہیں۔ ہر سال تقریباً 30 ملین پاؤنڈ شراب کے سیل کو فروغ دینے کے لئے خرچ کئے جاتے ہیں۔ برطانیہ کے باشندے اپنے کھانے کے بجٹ میں شراب کی مد پر سب سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، یہ بجٹ کا 18 فیصدی ہوتا ہے جو فرانس ڈنمارک اور سویڈن کے باشندوں کے خرچ سے دوگنا ہے۔ برطانیہ کے طلباء جتنی رقم کتابوں پر خرچ کرتے ہیں اُس کی ڈگنی شراب نوشی پر خرچ کرتے ہیں۔ برطانیہ میں انگور کی شراب (Wine) کا استعمال گذشتہ سات سال کے عرصہ میں ڈگنا ہو گیا۔ ۱۹۸۴ء میں اُس کی فروخت 425 ملین لیٹر تک پہنچ گئی اور اس کے پینے والوں کی تعداد 27 ملین تک پہنچ گئی جو پہلی بار بیئر پینے والوں کے برابر ہو گئی۔

بیئر انگریز کا قومی مشروب ہے اور وہ اُسے شراب نہیں بلکہ پانی سمجھ کر پیتا ہے، بیئر کے علاوہ وہسکی، برانڈی، جن، رم وائن اور شیمپین کی بھی خوب کھپت ہے۔ اسکاٹ لینڈ اپنی اسکاچ وہسکی کے لئے ساری دُنیا میں معروف ہے۔ ۱۹۷۸ء میں اسکاچ وہسکی کی برآمد نو کروڑ ۹۹ لاکھ پروف گیلن رہی جس کی مالیت 598 ملین پاؤنڈ تھی۔ ۲۰۰۱ء میں اسکاچ وہسکی کے 84 Million Cases ساری دُنیا میں فروخت کئے گئے۔

اسکاٹش کاؤنسل آف الکحل ازم کا کہنا ہے کہ مے نوش مریضوں کی تعداد میں چھ گنا اضافہ ہو گیا اور مے نوشی کے اثر سے تشدد و جرائم کے واقعات میں بھی خاصہ اضافہ ہو رہا ہے۔ مے نوشی کی وجہ سے برطانیہ میں ہر سال 25 ملین کام کے دِنوں کا نقصان ہوتا ہے جس سے ملک کو ہر سال تقریباً 210 ملین پونڈ کا خسارہ ہوتا ہے۔ ایوان خاص کے ایک مباحثہ میں مے نوشی کو امراض قلب، کینسر اور تپ دق کے بعد چوتھے نمبر کا ہلاکت کا سبب بتایا گیا۔ تقریباً چار لاکھ باشندے اس لت میں بُری طرح مبتلا ہیں۔ جگر کا ورم جو کثرت مے نوشی کا ایک لازمی سبب ہے، میں گذشتہ دس سال میں 40 فیصدی کا اضافہ ہوا۔

برطانوی عورتوں میں بھی مے نوشی کی عادت بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ تین سال کی مدت میں مے نوش خواتین کی تعداد دُگنی ہو گئی۔ ۱۹۶۵ء میں ہر سات عورتوں میں ایک مے نوشی ہوتی تھی، اب ہر تین میں ایک عورت مے نوش ہے اور اُن کی مجموعی تعداد ۲۰ لاکھ سے متجاوز ہے، اس اضافہ کے اہم اسباب عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی، تنہائی کا احساس اور سرعت سے ٹوٹتے ہوئے ازدواجی رشتے ہیں۔ چونکہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ الکحل اپنے خون میں جذب کر لیتی ہیں، اس لئے شراب پینے کے بعد اُن میں سرور کی کیفیت جلدی پیدا ہو جاتی ہے۔

جرمنی

جرمن ایسوسی ایشن اگینٹ دی ڈینجر آف اڈکشن کے ڈائرکٹر رالف ہیلنگھر وسٹ کا کہنا ہے کہ جرمن دُنیا کے سب سے زبردست میخوار ہیں، یہاں کی ۸۲ ملین آبادی میں خالص الکحل کا فی کس استعمال دُنیا میں سب سے زیادہ ۱۲ لیٹر سالانہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں شراب پینا نارمل اور نہ پینا ایب نارمل ہے۔ یہاں سافٹ ڈرنک مشین میں بھی منرل واٹر اور کولا کے ساتھ ہی بیئر بھی نکلتا ہے۔ ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ ۱۲ سے ۲۴ سال کی عمر کے 54 فیصدی نوجوان روزانہ شراب پینے کے عادی ہیں، کم عمر بچوں میں مینوشی بڑھ رہی ہے۔ دس سال کی عمر کے بچے اپنے پینے کے لئے شراب اسکول کے بستہ میں رکھ کر لے جاتے دیکھے گئے۔ تیز قسم کی شراب پینے کی عادت پختہ ہوتی جارہی ہے۔ مینوشی کی لت معاشرہ کے ہر طبقہ میں سرایت کر گئی ہے۔ فیکٹری ورکرس سے لے کر

دفتروں کے اعلیٰ حکام تک سب اس کے عادی ہوگئے ہیں۔ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ تقریباً 30 لاکھ جرمن کام پر بھی پیتے ہیں، اسی لئے 50 فیصدی ورکرس شراب سے متعلق بیماریوں میں مبتلا پائے گئے۔شراب کے ساتھ ہی ڈرگس کی لت میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔

رُوس

سویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد رُوس میں شراب نوشی پھر اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔الکزنڈر نیمشو نے لکھا کہ اب رُوس دنیا کا سب سے زیادہ شراب پینے والا ملک ہوگیا ہے۔یہاں ہر سال اوسطاً 14.5 لیٹر خالص الکحل فی کس استعمال کیا جاتا ہے۔ایک رُوسی ہفتہ وار میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا گیا کہ کثرت مینوشی کو ایک مرض سمجھنا چاہئے نہ کہ زار کے وقت سے چلا آرہا ایک سماجی ہینگ اُور! نوجوانوں اور عورتوں میں بھی مینوشی تیزی سے پھیل رہی ہے۔یہاں وڈکا یا بیئر کے خلاف کوئی مذہبی یا سماجی امتناع (Taboo) نہیں ہے۔شراب کا استعمال سماجی موقعوں پر بے دھڑک کیا جاتا ہے۔گربچوف کے زمانے کی امتناع مینوشی کی تحریک اب بالکل فراموش کی جاچکی ہے۔

پروفیسر یوری تھکر یو نے پرودا میں لکھا تھا کہ ''پچاس فیصدی حادثات اور چالیس فیصدی ازدواجی رشتوں کے ٹوٹنے کے واقعات مینوشی کے سبب سے ہوتے ہیں۔تشددانہ زدوکوب کے 85 فیصدی اور ڈوبنے کے 63 فیصدی واقعات اُسی حالت میں واقع ہوتے ہیں، جب لوگ نشہ کی حالت میں ہوتے ہیں اور قتل کے 98 فیصدی واقعات کا ارتکاب ایسے بدمعاشوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے جن کے ہواس درست نہیں ہوتے اور نشہ کی حالت میں وہ ایسا کر گزرتے ہیں۔

شراب نوشی سے براہِ راست موت پانے والوں کی تعداد ۱۹۹۳ء میں ایک ہزار پانچ سو تک پہنچ گئی، اُسی سال ساڑھے پانچ لاکھ افراد کو اسپتال میں داخل کرایا گیا اور دوسرے سات لاکھ افراد نے آؤٹ ڈور مریضوں کی طرح اپنا علاج کرایا۔ڈاکٹر Karpov نے بتایا کہ اس وقت رُوس میں 30 لاکھ سے زائد افراد کثرت مینوشی سے پیدا ہونے والے امراض میں مبتلا ہیں۔ڈاکٹر موصوف کا کہنا ہے کہ ''شراب نوشی کے علاج پر

لاکھوں رُوبل خرچ کرنا ویسا ہی ہے جیسے ریت میں پیسہ پھینک دینا۔جب تک معاشرہ شراب کے متعلق اپنی قدروں کو نہیں بدلتا اس مسئلہ کا معقول حل ممکن نہیں۔''

فرانس

فرانسیسیوں کا شمار دُنیا کے زبردست میخواروں میں کیا جاتا ہے اور یہ اُن کی لائف اسٹائل کا لازمی جُز ہوگیا ہے۔فرانس کے مشہور شہر Bordeaux میں شراب نوش، شراب سازی کی صنعت میں لگے ہوئے بڑے بڑے سوداگر اور شراب کی خوبیوں کا قصیدہ کہنے والے شاعر و مصنف ہر سال مارچ میں جمع ہوکر شراب کا جشن بڑے دھوم دھام سے مناتے ہیں۔اس علاقہ میں ۲ لاکھ پچاس ہزار ایکٹر زمین پر اعلیٰ درجہ کے انگور کی کاشت ۱۳ ہزار کاشتکاروں کے ذریعہ کی جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کی شراب کی 660 Million بوتلیں ہر سال تیار کی جاتی ہیں!

فرانس میں پانی نایاب چیز ہے، اُسے صرف بیمار لوگ پیتے ہیں۔انگوری شراب کی قیمت پانی سے آدھی ہے۔فرانس والے شراب پر اس سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔جتنا کپڑے، گوشت یا کیاوی مصنوعات پر۔یہاں جتنا روپیہ شراب پر ہر سال خرچ کیا جاتا ہے اُس سے پانچ لاکھ عالیشان مکانوں کی تعمیر ہوسکتی ہے۔پچاس لاکھ فرانسیسی باشندے چھ پنٹ خالص الکحل ہر ہفتہ استعمال کرتے ہیں اور اس طرح کثرت مینوشی سے پیدا ہونے والے دو امراض دماغی سرسام اور جگر کی خرابی سے چالیس ہزار افراد ہر سال فوت ہوجاتے ہیں اور انکے علاوہ ۲۵ ہزار افراد پھیپھڑے، حلق اور منہ کے کینسر سے وفات پاجاتے ہیں۔ہر سال ۲۱ ہزار سے زیادہ اشخاص مینوشی کے باعث سڑکوں پر حادثات میں ہلاک ہوجاتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ''شراب پئے ہوئے ڈرائیور سب سے طاقتور قاتل ہوتے ہیں۔''

"A Drunk Driver Is A Powerful Assassin"

فرانس کے اسپتالوں میں بھرتی کل مریضوں میں ایک تہائی شراب سے متعلق پیدا ہونے والے امراض کے لئے زیر علاج رہتے ہیں۔یہاں فی کس الکحل کی سالانہ کھپت 13.2 لیٹر ہے۔فرانسیسی مینوشی میں اتنا غرق ہیں کہ ترک مینوشی کی بات تو الگ رہی اس میں تخفیف کی بات کرنا بھی بے سود ہے۔اتنے بڑے مالی خسارہ کو دیکھتے ہوئے

فرانسیسی حکومت نے Sans Alcohol کے نام سے ایک تحریک چلائی تھی تا کہ لوگوں کو مینوشی سے ہٹا کر جوس وغیرہ کی طرف راغب کیا جائے۔ حکومت نے تحریک کو مؤثر بنانے کے لئے ٹیلیویژن پر اشتہارات دئے اور کثرت مینوشی کے طبّی نقصانات سے پبلک کو آگاہ کیا گیا لیکن اتنی جدوجہد کے بعد بہت ہلکا سا اثر دکھائی پڑا۔ شیمپئن اور اعلیٰ قسم کی شراب کی فروخت میں کوئی فرق نہیں ہوا لیکن ٹیبل کی شراب اور الکحل سے تیار ہونے والے دوسرے مشروبات کے سیل میں کچھ کمی ہوئی۔

ناروے، سویڈن

اسکنڈی نیویا کے ملکوں ناروے سویڈن اور فن لینڈ میں کثرت مینوشی کی لت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب ان ملکوں میں سماجی بحث کا موضوع نیوکلیر خطرے کے بجائے بڑھتی ہوئی میخواری ہوگیا ہے۔ ایک نفسیاتی مطالعہ سے معلوم ہوا کہ سویڈن کے ہر پانچ باشندوں میں ایک کو اپنی عمر کے دوران مینوشی کی عادت کے باعث پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا اور دس میں ایک کو سنگین خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں موت کا ایک بڑا سبب کثرت مینوشی ہے اور کینسر وامراض قلب کے بعد سب سے زیادہ موتیں اسی سبب سے ہوتی ہیں۔ یہاں کی عورتوں میں بھی مینوشی کی عادت زیادہ پھیل چکی ہے۔ ملک میں کم ازکم ساٹھ ہزار مینوش خواتین پیچیدہ مسائل میں اُلجھی ہوئی ہیں، یہ تعداد اور بھی زیادہ ہوسکتی ہے کیونکہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں اپنی مینوشی کو چھپانے میں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔

جاپان

پہلے جاپانی چاول کی شراب (Sake) ہاکا سُرور حاصل کرنے کیلئے پیتے تھے لیکن اب وقت بدل چکا ہے، آج کے نوجوان بالخصوص عورتیں وہسکی، بیئر اور شوشو نشہ حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے کمیونی کیشن کو تیز کرنے کے لئے پیتے ہیں، اب جاپان نے وہسکی کے فی کس استعمال میں امریکا اور برطانیہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ صرف ایک سرما کے موسم میں 1.7 ملین کلولیٹر شراب پی ڈالی یعنی ملک کے 83 ملین بالغوں میں ہر فرد کے لئے بیئر کی بڑی 32 بوتلیں! جاپانی عورتیں بھی شراب کی خوگر ہوتی جارہی ہیں، اب تقریباً ہر

نوجوان لڑکی شراب کا شغل کرتی ہے جبکہ چار سال قبل کے ایک سروے میں صرف 70 فیصدی عورتوں نے مینوش ہونا تسلیم کیا تھا، اب وہ بھی تیز قسم کی شرابیں وائن، وہسکی اور بیئر شوق سے پینے لگی ہیں۔

آسٹریلیا

انگریزی بولنے والی دُنیا میں سب سے زیادہ شراب پینے والے آسٹریلیا کے باشندے ہیں، شراب کا فی کس استعمال کرنے والے ملکوں میں آسٹریلیا کا بارہواں نمبر ہے حالانکہ یہاں بیئر کا استعمال زیادہ ہوتا ہے لیکن یہاں کی بیئر دوسرے ملکوں کی بیئر کے مقابلہ میں زیادہ تیز اور نشہ آور ہوتی ہے۔ ایک تشویشناک پہلو یہ ہے کہ پینے والوں میں بچوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ گیارہ سال سے کم عمر کے چار فیصدی بچے کم ازکم چھ پگ شراب روز پیتے ہیں اور اسی عمر کے ۱۰ فیصدی بچے ہر روز پینے کے عادی ہیں۔

بلغاریہ

بلغاریہ میں مینوشی ایک سنگین سماجی مسئلہ بن گیا ہے، ہر تین شہریوں میں ایک کثرت مینوشی کا شکار ہے۔ کرانک میخواروں کی تعداد 30 لاکھ سے بھی زائد ہے۔ تقریباً بیس ہزار جوڑے ہر سال طلاق حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ کوئی ایک فریق بُری طرح شراب کا خوگر ہے۔ مینوش خواتین کی تعداد میں گذشتہ دس سال میں چار گنا اضافہ ہوا۔ یونیورسٹی کے طلبا، نوجوان عہدہ داران اور آرٹسٹ میں مینوشی کافی پھیلی ہوئی ہے۔ جرائم کے اعداد وشمار میں بتایا گیا کہ 53 فیصدی قتل عمد، 40 فیصدی ڈکیتیاں اور 72 فیصدی غنڈہ گردی کے واقعات نشے کی حالت میں ہی واقع ہوتے ہیں۔

ہنگری

ہنگری میں مینوشی میں اتنا زیادہ اضافہ ہوگیا ہے کہ حکومت اس بڑھتی ہوئی لت کو روکنے کے لئے سخت تدابیر کررہی ہے۔ مینوشوں کا کم ازکم تخمینہ چھ لاکھ لگایا گیا ہے۔ پولینڈ میں عادی مینوش تیس لاکھ سے زیادہ ہیں جو فیملی کے کھانے کے بجٹ کا 30 فیصدی شراب کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں اور خالص الکحل کا فی کس سالانہ اوسط 7.5 لیٹر رہتا ہے۔ پُرتگال میں عورتوں میں مینوشی بڑھ رہی ہے، اب ہر پانچ پینے والوں میں چار

عورتیں ہوتی ہیں اور ایک مرد، جبکہ کچھ عرصہ قبل یہ تناسب ۲۰:۱ کا تھا۔

ہندوستان

شراب نوشی پر پہلے جو سماجی کلنک (Stigma) تھا وہ اب ختم ہوتا جارہا ہے اور اب اسے اعلیٰ معیارِ زندگی کی نشانی مانا جاتا ہے۔ شراب نوشی جو پہلے صرف سماج کے نچلے طبقہ میں رائج تھی اب متوسط الحال گھرانوں کے ڈرائنگ روم میں شوقیہ استعمال کی جاتی ہے۔ طالب علموں کی اکثریت نے شراب اور ڈرگس کا شوق اپنالیا ہے اور اس میں عمر جنس یا معاشرتی طبقہ کی کوئی تفریق باقی نہیں رہ گئی ہے۔

کونسل آف سوشل ڈیولپمنٹ کے ذریعہ دہلی کے کالجوں میں کئے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ مخلوط کالجوں کی 21.2 فیصدی طالبات شراب پینے کی عادی ہیں اور نشہ آور دواؤں کا استعمال بھی اُن میں خاصی بڑی حد تک سرایت کر چکا ہے۔ مطالعہ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ”بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات شراب اور ڈرگس کے خوگر ہو چکے ہیں۔“

بنگلور کا شہر بیئر میں نہایا ہوا ہے۔ اکتالیس لاکھ آبادی والے اس شہر میں کم از کم سو Pubs ہیں بار اور شراب کی دوکانیں ان کے علاوہ ہیں۔ ان Pubs میں 70 فیصدی مقامی باشندے اور 30 فیصدی سیاح ہوتے ہیں۔ طلباء بڑی تعداد میں آکر یہاں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پورے ملک میں الکحل کی پیاس بڑھتی جارہی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں 6.75 کروڑ لیٹر شراب قانونی طریقے سے تیار کی گئی اور غیر قانونی طور پر تیار کی جانے والی شراب اس کے علاوہ ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ملک میں 340 ملین لیٹر شراب کی کھپت ہوئی۔ ملک میں الکحل کی صنعت کا تخمینہ 18,000 کروڑ روپے کا لگایا گیا ہے۔ ملک کی نئی اقتصادی پالیسی کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے شراب کی فوج نے ملک پر دھاوا بول دیا ہے۔ شیمپین انڈیا لمیٹڈ نام کی کمپنی نے اپنے فرانسیسی شریک کاروبار کے ساتھ مل کر انگور کی سفید شراب کی پیشکش کردی اور اس چمکیلی شراب کو فرانس، امریکا وغیرہ کو ایکسپورٹ بھی کررہی ہے۔ ملک میں تیار کی جانے والی شراب کا ٹرن اور 24,500 کروڑ روپے ہے اور الکحل کی سالانہ کھپت 10,500 لاکھ لیٹر تک پہنچ گئی ہے۔

نشیلی اَدویات

۱۹۶۰ء کی دہے میں مغربی ملکوں میں ”پاپ“ اور ”بیٹل“ کلچر چھایا ہوا تھا اور اسی کلچر نے نشیلی ادویات کو مقبول کرانے میں اہم رول ادا کیا تھا اور اب یہی ”ڈرگ کلچر“ مغربی کرۂ ارض سے پھیل کر مشرقی ملکوں کے لئے بھی دردِ سر بن گیا ہے اور اسے سماج کا ناسور قرار دیا جاسکتا ہے۔ انٹرنیشنل نارکوٹکس کنٹرول بورڈ (INCB) نے اپنی حال کی رپورٹ میں کہا کہ ”ساری دُنیا میں ڈرگس کی تسکری کا پھیلا ہوا جال اب جغرافیائی، معاشرتی اور جرائم کی حدوں کو پار کرکے بین الاقوامی پیمانے پر ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں کو متاثر کرنے لگا ہے اور بیشتر ملکوں پر یہ ڈرگ کارٹلز (Cartels) ہی حکمرانی کرتے ہیں“۔

افیون کا استعمال تو دُنیا میں ہزاروں سال سے ہوتا آرہا ہے، اگر ہم چین میں افیون کے استعمال کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں تو یہ واضح ہوجائے گا کہ نشیلی ادویات کا بے تحاشا استعمال کس طرح افراد کی قوت کارکردگی کو زائل کرکے پوری قوم کو غفلت اور پسماندگی کا شکار بنادیتی ہے۔ ۱۸۰۶ء میں افیون سے مارفین نکالی گئی اور درد میں راحت پہنچانے کے اوصاف کی وجہ سے اسے کھانسی کے علاوہ سرجری میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ ۱۸۷۴ء میں مارفین سے ہیروئن نکالی گئی اور ایک جرمن دواساز کمپنی نے اسے کھانسی کی دوا کے طور پر ہیروئن کے ٹریڈ نام سے رائج کردیا یہ مارفین سے آٹھ گنی موثر ثابت ہوئی، کون جانتا تھا کہ سو سال کے اندر اس کے رسیا دُنیا میں کروڑوں کی تعداد میں پہنچ جائیں گے۔ اسی طرح کینابس کے پودے سے گانجا، بھنگ، چرس، مری جوانا اور حشیش نکالی جاتی ہے۔ ہپیوں نے ان چیزوں کا استعمال بڑے شوق سے کیا اور اب کالجوں کے طلبا بڑی رغبت سے ان کا استعمال کرتے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں جب جرمن فارمیسٹ نے کوکا (Coca) پودے سے خالص کوکین کو الگ کیا تب سے اس کا استعمال ماڈرن سرجری اور میڈیسن میں کیا جانے لگا۔ خالص کوکین سن کرنے کے لئے Anaesthesia کے طور پر استعمال کیا جانے لگا اور سو سال کے بعد اسی کوکین کا استعمال نشیلی دوا کے طور پر حظ کے لئے کیا جانے

لگا اور اس کی ناجائز تجارت اور اسمگلنگ ساری دُنیا میں پھیل گئی۔

اسمگلنگ انتہائی منظم طریقے سے ساری دُنیا میں لاکھوں تربیت یافتہ افراد کے ذریعہ بڑے شاطرانہ طریقہ سے کی جارہی ہے اور امریکا جیسے طاقتور ملک کے حکام ٹکنالوجی کی اس جنگ میں اسمگلرس کے گروہوں سے شکست کھا رہے ہیں۔ ڈرگس کے اس کاروبار میں کروڑوں کا وارا نیارا ہوتا ہے۔ بڑے سوداگر ارب پتی، اوسط درجے کے تاجر کروڑ پتی اور چھوٹے پیمانے پر بھی کام کرنے والے کچھ ہی دنوں میں لکھ پتی بن جاتے ہیں۔ کوکین کی تیاری کرنے والے صرف ایک ملک بولیویا نے ۱۹۸۴ء میں 1½ بلین امریکی ڈالر کا نفع ڈرگس کی تسکری میں کمایا، اُس سال ملک کا جی۔ این۔ پی 2½ بلین امریکی ڈالر تھا جس میں نصف سے زیادہ صرف ڈرگس کی فروخت سے حاصل ہوا۔ نشیلی ادویات کے مضر اثرات سے سب بخوبی واقف ہیں لیکن اس پُر منفعت کاروبار کو کیسے چھوڑیں؟ یہ انسانیت کے دشمن کروڑوں نوجوانوں کو اپنی تیار کردہ دواؤں کا گرویدہ بنا کر انہیں موت کے منھ میں پہنچا رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ترقی پذیر ملکوں کے نوجوان بھی عادی ہوجانے کے بعد کسی نہ کسی طرح اُن کے خریدنے کے لئے پیسہ اکٹھا کرہی لیں گے، بھلے ہی اس کے لئے انہیں چوری یا دوسرے جرائم کا ارتکاب کرنا پڑے، لیکن یہ حکومتیں اور ڈرگ بیرن ناجائز طریقہ سے حاصل ہوئی اس کثیر دولت سے خوش ہیں اور قانون کا نفاذ کرنے والی ایجنسیوں کو حقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے کام میں ناکام ہورہی ہیں۔

نشیلی ادویات کا استعمال

دُنیا کے کروڑوں نوجوان اس خوفناک لت میں مبتلا ہیں۔ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں سے شروع ہوکر اب یہ وبا ترقی پذیر ملکوں میں بھی پوری طرح پھیل گئی ہے۔ ہیروئن، کوکین، مری جوانا اور حشیش اور دوسری سائکوٹراپک ڈرگس کا استعمال گذشتہ پچاس سال میں بے انتہا بڑھ گیا ہے۔ اب کمپیوٹر کی مدد سے ایسے سالمہ Molecules بنائے جاسکتے ہیں جو در اصل ڈرگ نہ ہوں گے لیکن اثرات ویسے ہی پیدا کردیں گے جیسے کہ ڈرگس کرتے ہیں، یہ ڈزائنر ڈرگس Designer Drugs کہلاتی ہیں۔ کیمیائی طریقوں سے یہ مختلف اشیاء سے تیار کی جاسکتی ہیں۔ 3-Methyl Fentanyl ایسی ہی ایک ڈزائنر ڈرگ ہے جو

لیبوریٹری میں تیار کی جاسکتی ہے اور یہ ہیروئن سے ایک ہزار گنا زیادہ اثر رکھنے والی ہوتی ہے، یہ دوائیں زیادہ تیز اثر رکھنے کی وجہ سے بسا اوقات مہلک ثابت ہوتی ہیں اور ان کے استعمال سے اکثر لوگ مفلوج ہوجاتے ہیں۔ ایسی ڈرگس کی دریافت نے ڈرگس کا مستقبل اور بھی اندوہناک بنادیا ہے۔

تازہ ترین تخمینہ کے مطابق دُنیا میں تین کھرب ڈالر کی مالیت کی نشیلی ادویات ہر سال استعمال کی جارہی ہیں یعنی اتنی دولت ڈرگ بیرنس (Barons) کی تجوریوں میں جارہی ہے! اس رقم کا ایک تہائی صرف امریکا میں خرچ کیا جاتا ہے۔

امریکا

نشیلی ادویات کا استعمال امریکا میں صحت عامہ کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ وہاں کے نیشنل ڈرگ کنٹرول پالیسی کے مرکز کے صدر لی براؤن (Lee Brown) نے بتایا کہ اس مسئلہ نے وہاں انتہائی سنگین صورتحال اختیار کرلی ہے۔ یہاں 77 ملین افراد ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور کسی نہ کسی نشیلی دوا کا استعمال کیا ہے۔ ملک میں 11.4 ملین شہری لگاتار پابندی سے ان ادویات کا استعمال کرتے ہیں۔ 2.7 ملین افراد بُری طرح ڈرگس کے عادی ہیں جن میں چھ لاکھ ہیروئن کے اور اکیس لاکھ کوکین کے عادی ہیں۔ مسٹر براؤن نے یہ بھی بتایا کہ ہر سال امریکی باشندے 50 ملین ڈالر ڈرگس پر خرچ کرتے ہیں اور امریکی حکومت فیڈرل اور ریاستی سطح پر 25 ملین ڈالر سالانہ اس لعنت کو روکنے کے سلسلہ میں خرچ کرتی ہے۔

نشیلی ادویات کا استعمال ملک کے ہر خطہ میں اور معاشرہ کے ہر طبقہ میں پھیل گیا ہے۔ بیس سے چوبیس سال کی عمر کے نوجوان ان ادویات کے سب سے زیادہ خوگر ہیں۔ اس عمر کے سات کروڑ 60 لاکھ نوجوانوں میں بیس لاکھ تو اتنے عادی ہوچکے ہیں کہ کثرت استعمال سے اُن کی صحت انتہائی خراب ہوچکی ہے۔ 36 فیصدی اسکولی طلباء ان دواؤں کے خوگر ہوگئے ہیں امریکی کانگریس کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ "غیر قانونی ڈرگس کی سالانہ بکری دس ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے اور پانچ ہزار نئے امریکن ہر روز کوکین کا استعمال شروع کردیتے ہیں۔ مری جوانا کا استعمال بھی خاصی بڑی حد تک پھیل گیا ہے اور بعض بائی

اسکولوں میں ۹۰ فیصدی تک طلبا، اس لت میں مبتلا پائے گئے۔"

امریکی نوجوانوں کی تازہ ترین لت Oxy Contin Addiction ہے جس کا خاص جُز Oxycodone ہے جو ایک Synthetic Opiate ہے جسے جرمنی کی لیبوریٹری میں ۱۹۱۶ء میں تیار کیا گیا تھا۔ پہلے اسے Pain Killer کی طرح استعمال کیا جاتا تھا بعد میں اس کی Kick کی خوبیوں کے پیش نظر اسے نوجوان لذت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنے لگے۔ اسکی فروخت ۱۹۹۶ء میں 55 Million ڈالر تھی جو ۲۰۰۰ء میں بڑھ کر 1.14 Billion ڈالر ہوگئی۔ ۱۲ فیصدی امریکی نوجوان Ecstasy کے عادی ہوگئے ہیں۔

کوکین گراں ہونے کی وجہ سے اونچے طبقہ کے نوجوانوں میں ہی رائج ہے جو اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے تین ہزار ڈالر ہر ہفتہ خرچ کردیتے ہیں۔ چونکہ کوکین کا استعمال جنسی بھوک کو بڑھا دیتا ہے لہٰذا اس تشنگی کو پورا کرنے کے لئے عجیب وغریب طریقے (Pervert Practices) اپنائی جاتی ہیں جن سے معاشرہ میں متعدد جنسی پیچیدگیاں پیدا ہورہی ہیں۔

نشہ آور ادویات اور گولیوں کے غلط استعمال (Pill Popping) نے بھی امریکا کو گہری تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ خانگی کشیدگی میں مبتلا افراد، اعصابی تناؤ محسوس کرنے والے حکام اور ہیجان (Thrill) کی تلاش میں نوجوان سب ایسے مسکنات اور خواب آور گولیوں کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ امریکا میں ڈرگ کلچر پوری طرح پنپ رہا ہے۔ شروع میں اسے تفریحاً وقتی خط حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا گیا بعد میں لوگ عادی بن گئے، چونکہ کوکین کا منہ سے استعمال بھوک پیاس کو مٹا دیتا ہے، معدہ سن کردیتا ہے لہٰذا لاکھوں افراد کی صحت تباہ ہوگئی اور ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے!

برطانیہ

برطانیہ میں نشلی ادویات کا استعمال وبائی امراض کی طرح پھیل گیا ہے۔ دو لاکھ سے زائد افراد ہیروئن کا مستقل طور پر استعمال کرتے ہیں جس پر تین ارب 65 کروڑ پونڈ کا سالانہ کا خرچ ہوتا ہے، اس کے علاوہ کوکین، کینابس، باربی ٹوئیس وغیرہ کا خرچ الگ ہوتا ہے۔ ٹونی بلیر گاسڈن نے ضبط کی گئی نشلی ادویات کی بنیاد پر ایک تخمینہ لگایا ہے کہ ہیروئن،

ہربل کینابس اور کینابس ریزن پر تقریباً چار بلین پاؤنڈ ہر سال خرچ کیا جاتا ہے! یہاں کے باشندے مسکنات کے بھی گرویدہ ہوگئے ہیں اور ڈاکٹروں کے نسخوں کا غلط استعمال کرکے اس لت کو پورا کیا جاتا ہے۔ مسکنات کی صنعت میں 40 ملین پاؤنڈ لگے ہیں اور چار ارب سے زیادہ صرف خواب آور گولیاں بنائی جاتی ہیں۔ شروع میں یہ ٹرانکولائزر اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ لوگ اُس کے عادی بن جاتے ہیں اور ڈاکٹروں کو دے لے کر یہ دوائیں اپنے لئے تجویز کراتے رہتے ہیں۔ غرض ہر شخص غارت گری کے اس دھندھے میں مگن ہے۔

مغربی جرمنی

ہیروئن کی لہر مغربی جرمنی میں پہلے سے آچکی ہے اور اب یہ کوکین کی لہر کی زد میں ہے۔ نشلی ادویات کا استعمال کرنے والے نوجوانوں کی تعداد روز افزوں ہے اور ان میں بچے بھی شامل ہورہے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں نوجوان موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ زندگی کی پریشانیوں اور مشکلات پر عبور نہ پاسکنے اور تخیلات کی ایک بہتر دنیا میں چلے جانے کے تصور میں یہ نوجوان ان مضر ادویات کے مضر اثرات جانتے ہوئے بھی اس طرف غفلت برتتے ہیں اور تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر اس لت میں مبتلا ہورہے ہیں۔

کناڈا

کناڈا کی آبادی امریکا کی $\frac{1}{10}$ ہے، پھر بھی یہاں کے لوگ تقریباً ۱۰ بلین کنیڈین ڈالر ڈرگس پر خرچ کرتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں کئے گئے ایک تخمینہ میں وہاں ہیروئن کے خوگر 22 ہزار، کوکین کے دو لاکھ 60 ہزار اور مری جوانا کے 15 لاکھ بتائے گئے۔

یوروپین اکنامک کمیونٹی

اس میں فرانس، بلجیم، نزرڈرلینڈ لکزمبرگ فیڈرل پبلک آف جرمنی اور اٹلی وغیرہ بارہ ملک شامل ہیں جن کی مجموعی آبادی 32 کروڑ ہے! ٹونی بلیر گاسڈن لکھتے ہیں کہ یہاں کے باشندے بھی ڈرگس پر تقریباً اتنا ہی خرچ کرتے ہوں گے جتنا کہ امریکا والے اس علاقہ میں ہیروئن کے عادی افراد پندرہ لاکھ سے زائد ہیں اور خرچ کا تخمینہ 27 ارب 37

کروڑ 50 لاکھ کا لگایا گیا ہے!

پولینڈ

یہاں کی آبادی 4 کروڑ ہے لیکن ڈرگس کی لت میں مبتلا ہونے والوں سے حکومت فکرمند ہے۔ ملک میں افیون اور بھنگ کی کاشت ہوتی ہے۔ افیون کے ڈنٹھل اور پتیوں سے رس نکال کر مارفین ملا کر جوش دے کر بھی پی لیا جاتا ہے۔ مقامی طور پر افیون کے پودے سے تیار شدہ دوائیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

اسپین

یہاں کے تقریباً ۱۰ فیصدی باشندے ڈرگس یا اسٹومولینٹس کا استعمال کرتے ہیں مختلف ادویات استعمال کرنے والوں کا تخمینہ یہ بتایا گیا:

حشیش سے تیار کی جانے والی ادویات	18 لاکھ
ایمفٹامائن (Amphetamine)	۹ لاکھ ۱۳ ہزار
گلیو اسنفنگ	۷ لاکھ ۶۰ ہزار
کوکین	۳ لاکھ ۸۰ ہزار
ہیروئن	۱ لاکھ ۱۴ ہزار

پولیس کا کہنا ہے کہ 70 فیصدی جرائم کا ارتکاب ڈرگس کا استعمال کرنے والے نوجوانوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ دارالسلطنت میڈرڈ میں عورتوں نے ڈرگس کی تجارت کے خلاف زبردست احتجاج کیا کہ ان کے بچے اور بچیاں اس لت میں مبتلا ہو کر جرائم میں ملوث ہوتے جا رہے ہیں۔

رُوس

رُوس اور مشرقی بلاک کے ملکوں میں بھی ڈرگ نوشی پھیل رہی ہے۔ رُوس سیاہ جب افغانستان میں جنگ پر گئے تو وہاں سے ہیروئن کا شوق لے کر واپس آئے۔ ۱۹۸۷ء میں ملک میں 46 ہزار رجسٹرڈ ڈرگ نوش بتائے گئے تھے۔ ماسکو یونیورسٹی میں ایسے آلات برآمد ہوئے جس سے ہیروئن تیار کی جاتی تھی۔

جاپان

جاپان کی نوجوان لڑکیاں اور گھر گرہست خواتین بھی نشیلی ادویات کی خوگر ہوتی جارہی ہیں۔ سال گذشتہ کے مقابلہ میں نوجوان لڑکیوں میں گیارہ فیصدی اور خواتین میں تین فیصدی کا اضافہ رہا۔ خواتین اپنا وزن کم کرنے یا سخت کندھوں کو نرم بنانے کے لئے ان کا استعمال کرتی ہیں لیکن لڑکیاں وقتی لطف اٹھانے کے لئے انہیں استعمال کرتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اُن کی عادی ہو جاتی ہیں۔

آسٹریلیا و نیوزی لینڈ

جنوبی مشرقی ایشیا سے قریب ہونے کی وجہ سے ہیروئن آسانی سے یہاں پہنچائی جاتی ہے اور یہاں کے ایک کروڑ 60 لاکھ باشندے جن کا معیار زندگی کافی بلند ہے، ان ادویات کے خوگر ہوتے جا رہے ہیں۔ محتاط تخمینہ کے مطابق یہاں صرف ہیروئن کا استعمال کرنے والوں کی تعداد 60 ہزار سے زیادہ ہے جو تین ارب آسٹریلوی ڈالر اس شوق پر خرچ کرتے ہیں۔ مری جوانا کی کاشت نیوزی لینڈ کے دور دراز علاقوں میں کافی ہوتی ہے لہٰذا اس کا استعمال بھی بڑھ رہا ہے۔ امریکا، یورپ اور کناڈا سے کوکین اسمگل کر کے یہاں پہنچائی جاتی ہے جسے ۲۹، ۳۰ ہزار افراد استعمال کرتے ہیں اور تقریباً دس کروڑ امریکی ڈالر اس پر خرچ کرتے ہیں۔

تھائی لینڈ

گولڈن ٹرائنگل کے علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ سے یہاں نشیلی ادویات کی تسکری بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اور یہاں کے نوجوان ان ادویات کے زیادہ خوگر ہیں۔ 80 فیصدی نوجوان ہیروئن کا شوق کرتے ہیں کیونکہ ملک کے بڑے رقبہ پر افیون کی کاشت کی جاتی ہے، یہاں کے جنگلات میں متعدد لیبوریٹریاں ہیں، خفیہ طریقے سے ہیروئن تیار کی جاتی ہے اور اسمگلنگ بھی بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔

انڈونیشیا میں ایک لاکھ 28 ہزار افراد نشیلی دواؤں کے عادی ہیں جن میں 90 فیصدی نوجوان ہیں۔ ملائشیا میں پانچ لاکھ افراد عادی ڈرگ نوش ہیں جن میں 73 فیصدی ہیروئن کے عادی ہیں۔ سنگاپور میں گلو اسنفنگ بہت پھیلی ہوئی ہے جس سے حکومت کو بڑی تشویش

ہے کیونکہ اس لت میں مبتلا 80 فیصدی نوجوان 26 سال سے کم عمر کے ہیں۔

پاکستان

پاکستان میں ہیروئن کا استعمال بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، ملک میں نشلی ادویات کا استعمال کرنے والوں کی مجموعی تعداد بیس لاکھ سے بھی زیادہ ہوگئی ہے جس میں نصف ہیروئن کا شوق کرتے ہیں جو بالغ آبادی کا 2.3 فیصد ہے۔ کراچی کی 70 لاکھ آبادی میں ہر نو افراد میں ایک ہیروئن کا عادی ہے اور پورے ملک میں صورت حال بڑی سنگین ہے۔ ہیروئن کا مقامی مارکیٹ تقریباً 1.2 بلین ڈالر کا ہے۔ اگر ایکسپورٹ نہ بھی کیا جائے تو اس کی کھپت مقامی مارکیٹ میں ہوجائے کیونکہ ملک کے اندر ہی 15 لاکھ ہیروئن کے عادی افراد موجود ہیں۔

ڈرگس کی تسکری اور ایکسپورٹ کرنے والے اس کاروبار میں زبردست نفع کمارہے ہیں، اس کاروبار میں لگے اسمگلرس کو 2.7 بلین ڈالر سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے جس میں تقریباً نصف رقم ایکسپورٹ سے حاصل ہوتی ہے۔

بنگلہ دیش

بنگلہ دیش میں ہیروئن پینے والے دس ہزار، مری جوانا پینے والے 25 لاکھ افراد سیڈیو ہپناٹکس (Sedative Hypnotics) کا استعمال کرنیوالے دس لاکھ افراد ہیں۔

برما

گولڈن ٹرائنگل کے علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ سے ہندوستان سے اسمگلنگ کے راستہ میں یہ اہم ٹرانزٹ پوائنٹ ہے، حالانکہ ۱۹۷۰ء میں یہاں افیون کی کاشت کو روکنے اور غیر قانونی لیبوریٹریاں بند کرنے کی سخت کارروائی کی گئی تھی لیکن خفیہ طور پہ کاروبار اب بھی جاری ہے۔

ہندوستان

یہاں نشلی ادویات کا استعمال روز افزوں ہے، یہ لت شروع میں خوشحال طبقہ کے نوجوانوں میں رائج ہوئی اور اسے تمول کی نشانی سمجھا گیا لیکن اب یہ غریب اور ان پڑھ

لوگوں میں بھی وبا کی طرح پھیل گئی اور کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء بھی اس کے شائق ہوگئے ہیں۔ پاکستان کے بعد ہیروئن کی خریداری اور استعمال میں ہندوستان کا دوسرا نمبر ہے۔ ملک میں عادی ڈرگ نوشوں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہے اور ڈرگس کی تجارت چار ہزار کروڑ روپے کی ہے۔ ہیروئن اور حشیش کی تسکری میں ہندوستان اہم مرکز ہے۔ ڈرگس مافیا کے کئی گروہ بین الاقوامی رابطہ قائم کرکے اِس تجارت کو خوب فروغ دے رہے ہیں۔

اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے چونکہ ہندوستان گولڈن ٹرائنگل اور گولڈن کریسنٹ کے درمیان واقع ہے لہٰذا ڈرگ ٹریفکنگ کا اہم ٹرانزٹ پوائنٹ بن گیا ہے۔ یہاں کینابس اور افیون کی کاشت کی قانونی طور پر اجازت ہے جس سے مختلف الکلاڈس تیار کئے جاتے ہیں جو دواؤں میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور غیر ملکی زرمبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا تسکری خفیہ طریقے سے بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ خود ہندوستان میں ہیروئن کا استعمال تشویشناک حد تک بڑھ گیا ہے اور بڑے شہروں کے علاوہ مضافات اور دیہاتی علاقوں میں بھی پھیل گیا ہے۔ بڑے شہروں کے کالجوں کے 25 فیصدی طلباء کسی نہ کسی ڈرگ کے شائق ہیں۔ دہلی کا ہر ستر واں شخص ڈرگ کا خوگر ہے اور بڑی تعداد ۱۲ سے ۳۰ سال کی عمر کے نوجوانوں کی ہے! لاکھوں نوجوان ہیجان (Thrill) کی تلاش میں نشلی ادویات کے خوگر بنتے جارہے ہیں اور صحت کو پہنچنے والے نقصان سے بالکل غافل ہیں۔

شراب اور ڈرگس کا استعمال فرد کی صحت، خاندان کی بقا، معاشرہ کے استحکام اور ملکی اقتصادیات کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، انکا مسلسل استعمال فرد میں مختلف جسمانی و دماغی امراض پیدا کردیتا ہے، ان کی قوت کارکردگی اور صلاحیتوں کو معطل کردیتا ہے اور عمر کا وہ اہم حصہ جس میں وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے اس لت میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے غارت ہوجاتا ہے۔ خاندان معاشی بحران میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ چوری عصمت فروشی اور دوسرے جرائم بڑھ جاتے ہیں۔ اسمگلنگ کی وجہ سے ملکی اقتصادیات غارت ہوجاتی ہے۔ اسی لئے بین الاقوامی سطح پر بھی اور متعدد ملکوں کے قوانین میں بھی نشلی ادویات کی خرید وفروخت اور تسکری روکنے کے لئے کاغذ پر بڑے سخت قوانین بنائے گئے ہیں لیکن ڈرگ بیرن کی پُرقوت تسکری کا جال ساری دُنیا میں ایسا پھیلا ہوا ہے کہ بمشکل ہی اس کاروبار کو روکا جاسکا ہے۔

باب۔۴

اسٹیج و اسکرین پر برہنگی کے مظاہرے

گذشتہ چند دہوں میں ذرائع ابلاغ میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا، ریڈیو اور ٹی وی نے تفریحی پروگراموں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ کمپیوٹر جیسی مفید ایجاد کو بھی منفی پہلو سے لیا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر فحش پروگراموں کے تلخ تجربے سے مغربی معاشرے کافی پریشان بھی ہیں اور اس موضوع پر شدومد سے بحث جاری ہے کہ ایسے فحش پیغامات کو روکنے کے لئے قانون وضع کئے جائیں اور مناسب عملی اقدامات کئے جائیں لیکن سرمایہ داروں کی زبردست لابی کی وجہ سے ایسا قانون وضع کرنے میں ابھی کامیابی نہیں ہوئی! ریکریشن آج سب سے زیادہ فروغ پائی ہوئی انڈسٹری ہوگئی ہے۔ آزادی کے اس دور میں ہر چیز کو کھلی چھوٹ ہے جس کے نتیجہ میں پورنوگرافک فلمیں، وڈیوز، ڈسکو میوزک پر رقص اور نیوڈ کلنگ (Kicking) پارٹیز آج کے نوجوانوں کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ ایک خلائی انجینئر نے کہا کہ:

"باذوق افراد کے لئے عریاں عورتوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھنے سے معاشرے کے تانے بانے کو برقرار رکھنے میں مدد ملتی ہے"۔

"For Appreciative Men To See Naked Women Dancing Is Helpful In Preserving The Fibre Of Society".

بیشتر تفریحی پروگراموں میں غیر صحت مند عناصر پوری طرح سرایت کر گئے ہیں۔ فلمیں اب زیادہ تر ایسی بنائی جانے لگی ہیں جن میں انتہائی عریاں و فحش مناظر بڑی

بے باکی سے پیش کر دیئے جاتے ہیں، نیز تشدد و جرائم کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اسٹیج پر عریاں بلکہ برہنہ مناظر پیش کر دینے میں اب کوئی امر مانع نہیں رہ گیا ہے۔ رقص اور کیبرے انتہائی ہیجان خیز اور شہوت انگیز ہوتے جا رہے ہیں۔ موسیقی اور آرکسٹرا، ٹی وی کے پروگرام بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ معروف ماہر سماجیات پروفیسر سوروکن اعتراف کرتے ہیں کہ "جدید تہذیب پر جنس کا اتنا غلبہ ہوگیا ہے کہ وہ اس کے ہر بن و مو سے ٹپکنے لگی ہے۔"

امریکا کے شہرہ آفاق ہفتہ وار "ٹائم" نے اپنے ملک کے حال زار کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا:

"بے شمار سینمائی پردوں اور تھیٹری اسٹیجوں سے، اشتہاروں اور چھپے ہوئے ورقوں سے، جنس و شہوت کی تصویریں قد آدم سے بھی بڑی بڑی ہر دم اپنی چمک دکھاتی رہتی ہیں، ان گنت الماریوں اور ان کے تختوں سے وہ کتابیں جھلکتی رہتی ہیں جن کا شمار آج سے چند ہی سال قبل فحش نگاری کے تحت میں ہوتا۔ بے حساب لاؤڈ اسپیکروں سے شہوانی دھنوں میں راگ گانے چھیڑے جاتے رہتے ہیں۔ پڑھے لکھوں کے کان میں فضا سے ہر وقت یہ آوازیں آتی رہتی ہیں کہ نجات آزادی اور شہوت رانی میں ہی ہے۔"

امریکا کے سابق صدر آنجہانی آئزن ہاور نے تفریحات میں فحش، رکیک اور شہوانیت کے اس بڑھتے ہوئے رجحان کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"ہمارے حسن، شائستگی اور اخلاق کے تصورات کو آخر کیا ہوگیا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ہم نے ترقی بھی کی ہے؟ ٹوئسٹ رقص کا ذکر کرتے ہوئے نیز آرٹ اور فلموں کے اس رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ "یقیناً یہ ہمارے معیار میں کافی تبدیلی ہو جانے کی نشاندہی کرتا ہے"۔

ٹی۔وی کی بہتات (Boom) کا ذکر کرتے ہوئے بھاسکر گوش لکھتے ہیں کہ "ٹی وی براڈ کاسٹرس کی نئی پود صرف پیسہ میں دلچسپی رکھتی ہے نہ کہ ٹیسٹ (Taste) میں! ٹی. ایس. ایلیٹ نے بہت پہلے کہا تھا کہ:

"Where Is The Wisdom We Have Lost In Knowledge"

اب ہمیں اس پر افسوس کرنا چاہئے کہ "Where Is The Knowledge We Have Lost In Information".

رُوس کے مشہور ماہر عضویات پاولو (Pavlov) نے کہا تھا کہ Learning Is Conditioning Of Mind پندرھویں صدی میں جرمنی میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد کتابوں نے اس کنڈیشنگ کا فریضہ انجام دیا اب Audio اور Audio Visual میڈیا نے اس رُول کو لے لیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ قدروں میں کسی قدر انحطاط ہو رہا ہے۔

وانس پیکارڈ لکھتے ہیں کہ ''انسان کی قوت سامعہ و باصرہ پر زبردست بمباری کی جارہی ہے۔ (Bombardment Of Sensual Stimuli) تقریباً پچیس سال قبل ٹی وی ایک مقبول ذریعہ تفریح کے طور پر موجود نہ تھا۔ آج کا بچہ جوان ہونے تک پندرہ ہزار گھنٹہ ٹی وی دیکھ چکا ہوتا ہے۔ کمیونی کیشن کے ذرائع میں جدید تبدیلیاں ایک ایسا اَن دیکھا ماحول پیدا کرتی جارہی ہیں جس کے نتائج سوسائٹی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہوتے جارہے ہیں اور نسلوں کے مابین تفاوت کو بڑھاتے جارہے ہیں۔''

ڈاکٹر ناگیندر سنگھ (جج انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس۔ ہیگ) نے اسکرین اور ٹی وی پر تشدد کی بڑھتی ہوئی منظر کشی پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''ہماری زندگی میں تشدد کا بڑھتا ہوا رجحان اور اُس کی اتنی عام منظر کشی انسانیت کی بقا کے لئے سخت خطرہ ہے۔ کلچر کو ٹکنالوجی کی رہنمائی کرنا چاہئے ورنہ ٹکنالوجی کلچر کو غارت کردے گی''۔ جرمنی کے وزیر انصاف فران ڈوبپ نے کہا کہ ''ذرائع ابلاغ میں تشدد کی بڑھتی ہوئی منظر کشی بچوں میں مجرمانہ ذہنیت کو پنپنے کا موقع دیتی ہے۔ ویڈیو فلمیں بنانے والے بڑی حد تک اس کے لئے ذمہ دار ہیں لیکن قانون اس میں بے بس ثابت ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ویڈیو کیسٹ بھی سنسر کئے جائیں''۔

فلمیں

فلمیں فرد کے دماغ پر بہت گہرے نقوش ثبت کرتی ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں کے ذہن پر یہ نقوش اور بھی زیادہ دیرپا ہوتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ایک واحد فلم کے دیکھنے سے فرد کے دماغ پر اتنے ہی گہرے نقوش ثبت ہوتے ہیں جتنے کہ دس ہزار

الفاظ کے پڑھنے سے۔ حالانکہ ٹی وی اور ویڈیو بھی اب خوب رائج ہوگئے ہیں لیکن فلموں کی مقبولیت اب بھی برقرار ہے۔ آج بھی ہر ہفتہ فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد دُنیا کی $\frac{1}{10}$ آبادی کے برابر ہوتی ہے۔ سنیما نہ صرف یورپ و امریکا میں تفریح کا مقبول ترین ذریعہ ہے بلکہ براعظم افریقہ اور پالی نیشیا جیسے چھوٹے جزیرہ میں بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ یوروپین یونین کے سنیما گھروں کے لئے ۱۹۹۵ء گذشتہ دس سال میں بہترین سال ثابت ہوا۔ یونین کی ۱۵ ممبر ریاستوں میں سنیما دیکھنے والوں کی تعداد میں سال گذشتہ سے 7.3 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں کل 706 ملین افراد نے سنیما دیکھا لیکن فلمیں زیادہ مقبول ہالی وڈ کی تیار کردہ رہیں جس نے یوروپین مارکیٹ کے 78 فیصدی کاروبار پر اپنی گرفت کرلی۔ دُنیا کے کچھ ملکوں میں سالانہ سنیما دیکھنے والوں کی تعداد یہ رہتی ہے: رُوس 3849 ملین، امریکا 2178 ملین، چین 4000 ملین، ہندوستان 1000 ملین۔

جاپان میں سنیما کے ٹکٹ سب سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ ایک فلم شو کا ٹکٹ 1500 ین (11.20 ڈالر) کا ہوتا ہے جو نوجوان اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ایک رات فلم دیکھنے جاتا ہے اُسے 4000 ین (Yen) (29.85 ڈالر) کے مصارف برداشت کرنا پڑتے ہیں! "Emmanuelle" نامی فرانسیسی فیچر فلم دُنیا کی سب سے لمبے عرصہ تک دکھائی جانے والی فلم ثابت ہوئی۔ پیرس کے پیراماؤنٹ شہر میں یہ فلم 26 جون ۱۹۷۴ء کو شروع ہوئی اور 26 فروری ۱۹۸۵ء تک مسلسل ایک ہی سنیما ہال میں چلتی رہی، اس نے دُنیا کے تمام سنیما گھروں کے ریکارڈ توڑ دیئے! ایک دوسری فلم No Sex Please We're British نے جون ۱۹۸۰ء میں لندن کے اسٹرینڈ تھیٹر میں اپنی نمائش کے دس سال پورے کر کے دُنیا کی سب سے لمبے عرصہ تک چلنے والی کامیڈی فلم کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس مدت میں اس کے 3,746 شو ہوئے جسے 21.4 ملین افراد نے دیکھا اور باکس آفس نے ساڑھے تین ملین پاؤنڈ کا نفع کمایا۔

فلموں کی نوعیت

نارمن مارس مغربی فلموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہالی وڈ میں کئی ایسی فلمیں تیار ہوئیں جنہوں نے امریکیوں کو زبردست شاک پہنچایا۔ امریکا میں سنسر شپ میں

کافی ڈھیل دی جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ فلمیں دوسرے ملکوں کو ایکسپورٹ کی جاتی ہیں تو وہاں کے سنسر شپ حکام سے تصادم کی نوبت آ جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک فلم جس نے امریکیوں کو بھی شاک پہنچایا Killing Of Sister George ہے، اس کا موضوع جنس اناث میں ہم جنس پرستی (Lesbianism) ہے اور اس کے کئی سین نیویارک کے کہنہ مشق مبصروں کی نظر میں بھی نہایت گرم ہیں۔ مبصروں نے ان مناظر کو بہت ہی بیباک اور پرشہوت قرار دیا اور لکھا کہ جنسی جذبات کی عکاسی میں کسی چیز کو بھی تخئیل کے لئے نہیں چھوڑا گیا ہے۔

ایک دوسری فلم "Candy" ہے جو ٹیری ساؤتھرن کے اسی نام کے مقبول ناول سے تیار کی گئی ہے۔ ہالی وڈ کے تقریباً ہر بڑے اسٹوڈیو نے اسے فلمانے سے احتراز کیا۔ بالآخر اس کی شوٹنگ روم میں ہوئی۔

''ڈیلی اسکیچ'' کے فلمی مبصر کا کہنا ہے کہ ''یہ دونوں فلمیں ابتک کی دکھائی جانے والی تمام فلموں میں سب سے زیادہ فحش ورکیک ہیں''۔ وہ حیرت سے سوال کرتے ہیں کہ کیا ہالی وڈ بالکل ہی پاگل ودیوانہ ہوگیا ہے؟ میں اپنے کو آزاد خیال سمجھتا ہوں لیکن میرے پاس کوئی اچھا لفظ نہیں ہے نہ ہی کوئی رکیک صفت جسے میں ان دونوں میں سے کسی بھی فلم کے لئے استعمال کرسکوں''۔ ''ڈیلی ایکسپریس'' کے مبصر کا خیال ہے کہ جس فحش وعریاں انداز میں یہ فلمیں بنائی گئی ہیں اُس کی روک تھام کے لئے یقیناً قانون کی گرفت ہونا چاہئے۔ "Last Tango In Paris" میں ایک مرد وعورت کو نہ صرف غیر فطری عمل کرتے دکھایا گیا بلکہ انتہائی بہیمانہ حرکات کا اعادہ کرایا گیا۔ دونوں کے درمیان لو میکنگ کے انتہائی سوقیانہ مناظر پیش کئے گئے۔ It Depicts The Basest Human Instincts On The Screen یہ فلم عوام میں بہت مقبول ہوئی اور لندن کے ایک سنیما ہال میں دو سال تک چلی۔ فلم Isodora میں ایڈورڈین عہد کی ایک رقاصہ کو کئی مناظر میں برہنہ پیش کیا گیا۔ لنڈسے اینڈرسن کی پبلک اسکول لائف کی روداد والی فلم IF پر بھی بہت سے اعتراضات کئے گئے، اس میں ایک خیالی بغاوت کا منظر پیش کیا گیا جس میں لڑکے بندوق لے کر اپنے کلاس فیلوز کو شوٹ کرتے ہیں، ایک برہنہ عورت بھٹکتی ہوئی برآمدے میں معلق ہے اور ایک نوجوان لڑکا ولڑکی کیفے کے فرش پر ہم آغوش ہوکر بوس وکنار میں مصروف

دکھائے جاتے ہیں۔ سویڈن میں ولگوٹ سائمن نے I Am Curious Yellow نامی ایک فلم تیار کی جس میں جنسی فعل کو صاف طور پر دکھایا گیا۔ "Sex Act Explicitly" نیویارک ٹائمس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس فلم میں ''اعضائے تناسل کی صاف منظر کشی اور جنسی اتصال میں اُن کے عمل کو جس ناشائستہ انداز میں دکھایا گیا ہے، اُس سے پیار ومحبت کے اعلیٰ جذبات کی نہایت بھونڈی عکاسی ہوتی ہے۔ ''ولچر'' (Vulture) نامی ایک جاپانی نیوڈ پلے میں عمر رسیدہ مفلوج مالک کے نوکر کو اُس کی بیوی سے عشق کرتے دکھایا گیا ہے اور متعدد ڈرامائی سین میں کامل برہنگی کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ (۱)

برطانیہ میں تیار کی جانے والی فلم ''رومیو اور جولیٹ'' میں شب عروسی کے سین میں رومیو کو بالکل برہنہ اُٹھتے ہوئے اور جولیٹ کو بھی بالکل عریاں حالت میں تیز روشنی کی جھلکیوں میں دکھایا گیا۔ برطانوی سنسر بورڈ نے نہ صرف اُس کی نمائش کی منظوری دے دی بلکہ اُس کے سکریٹری نے کہا کہ ''فلم میں عشقیہ مناظر فحش نہیں بلکہ دراصل بڑے حسین ہیں۔'' "Sandpipe" نامی فلم میں مشہور امریکی ایکٹرس الزبتھ ٹیلر کو صرف اپنے ہاتھ سے اپنا سینہ ڈھکتے ہوئے دکھایا گیا اور اُس کا سرخ چوبی مجسمہ پوری فلم میں متعدد بار دکھایا جاتا ہے۔

امریکا نے دُنیا کی سب سے پہلی برہنہ فلم "Garden Of Eden" بنا کر اوّلیت کا شرف حاصل کیا۔ یہ رنگین فلم فلوریڈا کی ایک نیوڈ کالونی میں تیار کی گئی۔ حالانکہ اسے ایک فیچر فلم تصور کیا گیا اور اس کی کہانی بھی انسانی ہے لیکن یہ دراصل سن بیدنگ اور نیچرازم کے فلسفہ وعمل کی پوری تشہیر کرتی ہے۔ رُس میئر کو ''کنگ آف نیوڈیز'' مانا جاتا ہے، وہ نسوانی جسم کے نشیب وفراز کی واضح عکاسی کرنے کے لئے معروف ہیں، اُن کی فلم "Beyond The Valley Of Dolls" مڈل کلاس کے اخلاق وشائستگی کے بندھنوں سے بالکل آزاد ہے اور اس میں سکس اور تشدد کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور اٹھارہ مقامات پر مباشرت کے سین دکھائے گئے ہیں۔ انہوں نے بے باکی سے اعتراف کیا کہ ''میں ناظرین سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں رکھتا ہوں، میری فلموں میں آپ سیدھے وہاں پہنچ جاتے

(۱) اس فلم میں جوان بیوی کا کردار ایک ہندوستانی فوجی ڈاکٹر کی لڑکی نے ادا کیا ہے جو اپنی برہنگی پر ذرا بھی نہیں جھجکتی ہے۔

ہیں جہاں آپ ۱۵ اسکینڈ میں ہوتے ہیں۔اس فلم میں قتل، خونریزی، تشدد، ناجائز تعلقات، گمراہی، کجروی (Perversion) پیار ومحبت، شادی، قریبی رشتہ داروں سے ناجائز تعلقات، خودکشی۔سب کچھ کھل کر دکھایا گیا ہے۔

وانس پیکارڈ نے موجودہ فلموں میں فحاشی کی نمائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ The Virgin Spring میں تشدد آمیز ریپ کے سین The Silence میں ایک عورت کو ماسٹربیشن کرتے ہوئے اور A Strange Knocks میں مباشرت کو بالکل واضح انداز میں دکھایا گیا ہے۔ Boeing Boeing میں ایئرپورٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں ایک مرد کو تین عورتوں کے ساتھ اس انداز میں دکھایا گیا ہے کہ گویا وہ تینوں اُس کی کورٹ شپ کا مرکز ہیں۔ A Woman میں ایک نوجوان اداکارہ کو Orgasm کی کیفیت کے ایک سین میں ایک مرد وعورت کو جنسی اتصال کی حالت میں اور دو عریاں دوشیزاؤں کو ایک مرد اداکار کے کپڑے پھاڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

بی بی سی نے اپنے اوپن یونیورسٹی پروگرام میں بلیو فلمیں بنانے والوں کی مکمل ڈاکومنٹری پیش کی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ایسی فلموں میں کام کرنے والوں کے کیا تاثرات ہیں۔ایسی فلموں میں کام کرنے والی ایک معروف اداکارہ سے جب انٹرویو لیا گیا تو اُس نے بلا کسی جھجک کے اعتراف کیا کہ میں ایک اداکارہ ہوں، میرا کام ایکٹنگ ہے میں ان بلیو فلموں میں کام کرنے میں کوئی بداخلاقی یا معیوب بات نہیں سمجھتی۔ مباشرت کے سین میں بھی حقیقی منظر کشی تھی جب میں نے اپنے رفیق سے بوس وکنار، ہم آغوشی اور .... میں مصروف ہوئی تو مجھے ذرا بھی جھجک نہیں محسوس ہوئی اور نہ میں حیران ہوئی۔ بی بی سی کے عملہ کے افراد بھی محظوظ ہوئے۔

براڈوے میں حال میں دکھائی جانے والی ایک فلم The Best Little Whorehouse Goes Public تھی جس کے پہلے ایکٹ کے انتہا (Climax) میں Gnoup Ongasm دکھایا گیا اور دوسرے ایکٹ میں Phone Sex کے مناظر پیش کئے گئے۔اس سین میں ٹی وی کی طرح Plexi Glass کے شوکیس میں عریاں لڑکیاں دکھائی گئیں اور کیس کے اوپر مردوں کو ان سے بات چیت، ہنسی مذاق کرتے دکھایا گیا۔شو کے ڈائرکٹر نے کہا کہ ہم Outer Course کو پروموٹ کررہے ہیں جیسا کہ ہمارے

زمانے میں لوگ چاہتے ہیں۔ براڈوے کے دوسرے تخلیقی دماغوں کا کہنا ہے کہ ایڈس ہو یا نہ ہو سیکس کو جاری رہنا چاہئے۔

AIDS or no AIDS, Sex Must Go On

برہنہ عورتوں کو مختلف قسم کے رقص کرتے ہوئے دکھاتی ہوئی فلم "Show Girl" پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے ریویو شائع ہونے کے باوجود لوگ اسے دیکھنے کے لئے جوق درجوق جارہے ہیں۔اس فلم کے ریلیز ہونے سے قبل امریکا کے چودہ بڑے شہروں میں دیواروں کو اشتہارات سے لیس دیا گیا جس میں Erotic Lap Dancing کے بے باک مناظر پیش کئے گئے ہیں۔"نیویارک ٹائمس" اور "لاس اینجلز ٹائمس" نے اس پر سخت تنقید کی "لاس اینجلز ٹائمس" نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "Show Girls Is A Movie Made To Be Exploited, Not Seen" شوگرل ایک ایسی فلم ہے جو محض استحصال کرنے کے لئے بنائی گئی ہے نہ کہ دیکھنے کے لئے۔لیکن پبلک اسے دیکھنے کے لئے ٹوٹی پڑی ہے!

پیٹر اسپنیل فلمی صنعت کے سب سے ڈائمنک پروڈیوسر نے اسکرین پر عریانیت اور لو میکنگ کے مناظر دکھائے جانے کی پرزور حمایت کی، انہوں نے کہا کہ پبلک یہ دیکھنا چاہتی ہے اور سینما کا کام رائے عامہ کے مطابق کام کرنا ہے نہ کہ یہ طے کرنا کہ اخلاق کیا ہونا چاہئے۔

"Cinema Should Reflect Public Morals

Nor Lay Down What It Should Be."

ایشیائی ملکوں کی فلموں کا حالِ زار

مشرقی ملکوں کے لوگ بھی سینما دیکھنے کے عادی (Crazy) ہوگئے ہیں۔ سترہ ایشیائی ممالک دُنیا کی نصف فیچر فلمیں تیار کرتے ہیں۔چین کے باشندے سینما بینی کے سب سے زیادہ خوگر ہیں، وہاں ۱۹۸۷ء میں 25 بلین سینما کے ٹکٹ فروخت ہوئے، کمسن بچے اوسطاً ہر دوسرے دن سینما دیکھتے ہیں چاہے انہوں نے اُسی فلم کو کئی بار دیکھ لیا ہو۔ ہندوستان میں ہر روز ایک کروڑ بیس لاکھ افراد فلمیں دیکھتے ہیں۔ملک میں تقریباً گیارہ

ہزار سینما ہال ہیں۔ ہر سال تقریباً ایک ہزار فلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ فلمی صنعت ملک کی سب سے بڑی دسویں صنعت ہے جس میں دو ہزار کروڑ روپے لگے ہیں۔ مغرب کی تقلید میں یہاں کی فلموں میں بھی سیکس، تشدد اور جرائم کی بھرپور عکاسی کی جاتی ہے۔ جب سے نان ریسڈنٹ ہندوستانیوں کو فلمیں درآمد کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے کئی سینما ہال بیباکی سے انتہائی شرمناک فلموں کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ ملیالم کی فلموں میں پارنوگرافک اجزاء شامل کردیئے جاتے ہیں اور جنوبی ہندوستان کے شیٹی تھیٹر اُن کی بے جھجک نمائش کرتے رہتے ہیں۔ بعض ملیالم فلمیں انتہائی سوقیانہ (Lurid) ہوتی ہیں۔ "Chora Chuvanna Chora" ایک ایسی ہی فحش فلم ہے جسے دیکھنے کے لئے پبلک جوق در جوق آئی اور دہلی کے ایک سینما ہال میں یہ پندرہ ہفتہ چلی۔ بین الاقوامی مافیا گروہ ایسی پارنو بلیو فلمیں ملک میں اسمگل کررہی ہیں اور یہاں کے بڑے شہروں اور تجارتی مرکزوں پر اُن کی خفیہ نمائش کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ نوجوانوں کے ہاسٹل، گیسٹ ہاؤس، اور بڑے ہوٹلوں میں اُن کی نمائش کرکے کروڑوں روپے کمائے جارہے ہیں۔ ان فلموں میں Sadistic Perverted Acts دکھا کر نوجوان لڑکوں ولڑکیوں کے اخلاق کو غارت کیا جارہا ہے۔

پاکستان میں بھی یہ کاروبار فروغ پر ہے۔ خود وہاں ایسی فلمیں تیار کی جاتی ہیں اور ہانگ کانگ، سیلون اور ہندوستان سے اسمگل کرکے بھی پہنچائی جاتی ہیں۔ فلمی اداکارہ اور ماڈل دس ہزار سے پچیس ہزار روپے تک لے کر ان بلیو فلموں میں کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتی ہیں۔ ''نوائے وقت'' میں ایک ماہر نفسیات نے لکھا کہ ''یہ بلیو اور ہاٹ مغربی فلمیں نوجوانوں میں جنسی گمراہی (Perversion) فرسٹریشن، اور عدم اعتمادی پیدا کررہی ہیں۔ وی سی آر گلٹ ملک میں بڑھتے ہوئے جنسی جرائم اور نشیلی ادویات کے لئے ذمہ دار ہے۔''

چین میں بنائی جانے والی فلموں میں پہلے عریاں سین بالکل نہیں دکھائی جاتے تھے بلکہ بوس وکنار کے منظر بھی بڑی احتیاط سے دکھائے جاتے تھے کہ کہیں عوام انہیں دیکھ کر برگشتہ نہ ہوجائیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے جب سے مغربی فلمیں اور ویڈیوز یہاں آنے لگے لوگ ایسے سین دیکھنے کے عادی ہوگئے، اس لئے جب Old Well نامی فلم میں

عریاں پُرشہوت بیڈروم مناظر دکھائے گئے تو لوگوں نے اُسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اسی طرح جب فلم Wild Mountains پر سات سال سے لگی پابندی سنسر بورڈ نے ہٹائی تو چین کے سرکاری پریس نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔

خواجہ احمد عباس نے کہا کہ غیر ملکی فلمیں اور خود ہمارے ملک میں تیار ہونے والی بیشتر فلموں میں مخرب اخلاق باتیں اور غیر سماجی (Anti Social) فلسفہ کی تشہیر کی جارہی ہے۔ جیمس بانڈ کی فلمیں اور ایسی فلمیں جیسے Kiss The Girls & make them die, How to Steel a million کسی بھی معاشرہ کے لئے خطرناک ہوسکتی ہیں۔ ایسی مغربی فلموں کو نارکوٹکس کی طرح قرار دیا اور یہ مشورہ دیا کہ اگر ملک کے نوجوانوں کو اُنکا عادی نہ ہونے سے بچانا مقصود ہے تو اُن کی درآمد پر کڑی نظر رکھی جانا چاہئے۔ ڈاکٹر ناگیندر سنگھ نے بھی فلموں میں اور ٹی وی اسکرین پر ایسی فحش چیزوں کی نمائش پر سخت تشویش کا اظہار کیا کیونکہ یہ انسانیت کی بقا کے لئے سخت خطرہ ہیں۔ مناسب تعلیم اور ہوشمند رائے عامہ آنے والی نسل میں صحیح اخلاقی قدریں پیدا کرنے میں معین ثابت ہوسکتی ہیں۔

بی بیکا نندرے نے اپنے مکتوب میں لکھا کہ:

The Present Wave Represents A Kind Of Cultural
Hegemony With The Permissive West
Undermining India's Conservatism.

حسن مجتبیٰ نے اپنے مکتوب میں لکھا:

The Media Can Be Used To Project India's
Age-old Value System To The World.

ملیالم فلموں میں بڑھتے ہوئے عریاں مناظر کے سلسلہ میں ٹائمس آف انڈیا نے مشورہ دیا کہ:

"Of Course This Problem In Part Of The Wider Issue
Of Adjusting Our selves to Changes In Our Social
Mores. We Must Think Of Ways of Promoting
A Healhty Attitude Towards Sex."

چند تحقیقاتی مطالعے

پروفیسر بنجے بیز (کیلیفورنیا یونیورسٹی) نے اپنے تحقیقی مطالعہ میں یہ پایا کہ بڑی

تعداد میں فلموں میں جرائم کی نہ صرف عکاسی کی جاتی ہے بلکہ اسے خوشنما (Glorify) بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ پروفیسر اسٹوک راتھ (ہیمبرگ یونیورسٹی) نے مغربی جرمنی کی 400 فلموں کا تجزیہ کیا تو یہ پایا کہ ان میں قتل عمد، سرقہ، دغابازی اور دیگر جرائم کی بے جھجک عکاسی کی گئی تھی۔ برٹش سینما فوٹو گرافک انسٹی ٹیوٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ برطانیہ میں تیار کی گئی فلموں میں 70 فیصدی جرائم یا شہوانیت سے متعلق تھیں۔ امریکی سینٹ کی سب کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ فلمیں ہر طرح کے ظلم وشقاوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کررہی ہیں۔ جرائم کی فلمیں بدستور قائم ہیں۔ بچوں کی نشوونما پر فلموں اور ٹی.وی مضحکات کے بڑے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ روس کی ماہر تعلیمات والڈیر فیمسٹو نے اپنی تحقیقات کی بنا پر ''سویٹ کلچر'' میں لکھا کہ ''روس کی کمسن لڑکیاں ٹوئسٹ رقص، بریگیٹی بارڈٹ کے بالوں کے اسٹائل، جنسی اطالوی فلموں اور لڑکوں سے ڈانس ہال میں ملاقات کی ہوس سے غلط راہوں پر بہکی جارہی ہیں۔ Divorce Italian Style جیسی فلمیں نوجوانوں کے اخلاق کو غارت کررہی ہیں۔ اس فلم کی کہانی کا لب لباب یہ ہے کہ ایک اطالوی امیر کبیر کی اپنی بیوی سے اَن بن ہوجاتی ہے اور شوہر کی زندگی کوفت میں گذرنے لگتی ہے۔ شوہر نے خاص عیاری سے کام لے کر اپنی بیوی کی آشنائی ایک اور شخص سے کرادی اور پھر ایک روز دفعتاً اُس نے بیوی اور آشنا کو تخلیہ میں پا کر بیوی کو گولی سے مار کر ہلاک کردیا۔ مقدمہ چلا اور ملکی قانون کے مطابق ۳ سال کی قید ہوئی۔ قید سے چھوٹ کر آیا تو نامطبوع بیوی کا قصہ تو پاک ہوہی چکا تھا ایک حسین دوشیزہ سے اپنی پسند کے مطابق بیاہ رچایا۔ اطالوی پریس کا کہنا ہے کہ فلم نے بڑی صحت کے ساتھ اطالوی خانگی زندگی کی عکاسی کردی ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ سویتا بھکرے (جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) اپنی تحقیقاتی رپورٹ Sociological Impact Of Cinima میں لکھتی ہیں کہ ''موجودہ سینما معاشرہ میں منفی رول ادا کررہا ہے، سماجی وجنسی تشدد کو بڑھاوا دے رہا ہے اور جرائم کو پنپنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ زندگی کے حقائق سے کنارہ کشی اختیار کرکے افراد کو ایک خیالی دُنیا میں لے جاتا ہے، لہٰذا سینما دیکھنے والے بیشتر افراد کی نفسیات ایسی ہوجاتی ہے، بالخصوص کمسن بچوں اور نوجوانوں کی کہ وہ زندگی کے حقیقی مسائل کا سامنا کرنے سے کترانے لگتے ہیں۔

اسٹیج

فحاشی اور برہنگی کے ایسے ہی مناظر بیشتر تھیٹریکل ڈراموں میں پیش کردیے جاتے ہیں۔ عوام کا مذاق پستی کی کن حدود تک پہنچ چکا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ڈی۔ ایچ لارنس کے معرکۃ الآرا ناول ''لیڈی چیٹرلیز لور'' پر تیار کردہ ڈرامہ لندن میں دکھایا گیا تو تبصرہ نگاروں نے اعتراض اس پر کیا کہ ڈرامہ میں خوابگاہ کے سین میں لیڈی چیٹرلیز اور اس کے آشنا کو بالکل برہنہ کیوں نہیں دکھایا گیا، یہ ناول نگار کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی۔ اس تبصرہ سے متاثر ہوکر دونوں خوابگاہ کے سین میں بالکل برہنہ ہونے لگے!

ایچ وینکٹا سوبیہ (H. Venkata Subiah) لکھتے ہیں کہ ۱۹۶۹ء سے جب سے لارڈ چیمبرلین نے پلیز پر سے سنسرشپ ختم کردی ہے اسٹیج پر برہنگی یہاں تک کہ ''فرنٹل نیوڈی'' بہت عام ہوگئی ہے۔ بہت سے ذی شعور افراد نے ٹی وی کے ذریعہ گھروں میں پہنچنے والی عریانیت کو روکنے کے لئے بھی جدوجہد کی لیکن کوئی کامیابی نہ ہوسکی۔ بہت سے پلیز میں عریانیت کو لطیف پردوں کی آڑ میں پیش کیا جاتا ہے لیکن "Oh Calcutta" نامی پلے میں ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی، یہ انتہائی فحش ورکیک ہے اور اس کے ڈائیلاگ ایکشن سے بھی زیادہ گھناؤنے ہیں، اگر غلاظت مجسم کسی پلے کو قرار دیا جائے تو وہ Oh Calcutta ہے اور یہ لندن کے کھچا کھچ بھرے ہالوں میں دکھایا جارہا ہے!

لندن کے آپیرا ہاؤس میں بدمستیوں اور رنگ رلیوں سے بھرپور ایک غنائی تمثیل Moses & Aaron پیش کیا گیا جس میں کنواری دوشیزاؤں کو دیوانہ وار جنسی حرکات ادا کرتے ہوئے اور نیم عریاں جوڑوں کو جنسی اختلاط میں مشغول ہوتے اسٹیج پر دکھایا گیا۔

"Paradise Now" نامی ڈرامہ لندن کے ایک اسٹیج پر کھیلا گیا جس میں ایکٹرسوں کے برہنہ مظاہروں کے ساتھ حاضرین کو بھی عریاں ونیم عریاں حالت میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ حسین دوشیزاؤں کو صرف انگیا اور زیر جامہ میں رقص کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ جب ڈرامہ اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچا تو حاضرین کو Wake Up And Free کے لئے مدعو کیا گیا اور اسٹیج پر ہی .... اتنے میں پولیس آگئی اور یہ

ڈرامہ Paradise Lost ہو کر ختم ہو گیا۔

وسکونسن یونیورسٹی میں "Peter & Pan" نام کا غنائی تمثیل انتظامیہ کے حکم امتناعی کے باوجود کھیلا گیا جسے دیکھنے کے لئے شائقین کامرس بلڈنگ کے ہال میں بڑی تعداد میں جمع تھے۔ دو برہنہ طالبات نے معصوم دوشیزاؤں کا پارٹ ادا کیا جو پہلے اپنے شکم کے سہارے رنگین روشنی میں رقص کرتی رہیں بعد میں وہ اسٹیج پر لڑھکتے ہوئے رقص کرتی رہیں اور Never Never Land کی تخلیق کے منظر کو اپنے رقص سے پیش کیا۔ حاضرین نے جی کھول کر داد و تحسین دی۔

رقص

پروفیسر سارنسن نے لکھا ہے کہ رقص خواہ وہ کسی زمانہ کا اور کسی صورت سے ہو یوں بھی اس سے بڑھ کر کوئی چیز محرک شہوت نہیں۔ رقص کا شوق خواہ وہ تماشائے رقص کا ہو یا خود ادائے رقص کا۔ اصلاً ایک جنسی ہی شوق ہے۔ مغربی ملکوں کے باشندے تو رقص کے انتہائی شائق اور دلدادہ ہیں ہی، اب ایشیائی ملکوں میں بھی ٹینگو، سوئنگ اور بال روم ڈانسنگ بڑے شوق و رغبت سے اپنائی گئی ہے۔ چین اور جاپان، فلپائن اور تھائی لینڈ ہر ملک میں نوجوان رقص کے بے حد شوقین اور دلدادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اُنکا کہنا ہے کہ یہ ایک نہایت عمدہ صاف ستھرا ذوق ہے اور آپ اس سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اپنا وزن بھی گھٹا سکتے ہیں۔ چین میں اکثر ورکرس سائیکل پر کام سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں اُتر کر کسی پارک میں یا سڑک کے کنارے کسی بھی راہ گیر سے بغل گیر ہو کر رقص کے چند پھیرے کرنے کے بعد پھر روانہ ہو جاتے ہیں۔ روزنامہ ''چائنا ڈیلی'' میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ رقص کے کلاس نوجوان کی دلچسپی کا مرکز بن سکتے ہیں اور انہیں بیرون ازدواج جنسی تلذذ حاصل کرنے سے روک بھی سکتے ہیں۔

جاپان میں لاکھوں افراد سنیما دیکھنے کے علاوہ بال روم رقص سے دفتر کی تھکن کو دور کرتے ہیں۔ تھائی لینڈ میں متعدد پارک اس لئے مشہور ہو گئے ہیں کہ نوجوان جوڑے وہاں جمع ہو کر رقص سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سنگاپور میں حکومت کی طرف سے جو میچ میکنگ کلب قائم کئے گئے ہیں ان میں شراب نوشی اور ٹینس کھیلنے کے ساتھ ہی ساتھ بال

روم رقص کی بھی اجازت دی گئی ہے تاکہ جوڑے اپنے رفیق کا صحیح انتخاب کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ فلپائن سے زیادہ بڑے پیمانے پر بال روم ڈانسنگ کہیں بھی رائج نہیں۔ یہاں صبح و دوپہر، شام اور رات پارکوں اور رقص گاہوں، رہائشی کمروں اور اسٹیڈیم میں فلپینی ڈسکو رقص کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ کبھی یہ پارکوں میں کھجور کے درختوں کے سائے میں جمع ہو کر رقص کرتے ہیں۔ یہاں پولیس کے حکام اور عملہ کو بھی باٹ لگائے پستول چڑھائے رقص کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ انہیں محکمہ کی طرف سے ہدایت ہے کہ وہ صحتمند اور چوق چوبند رہنے کے لئے رقص کرتے رہیں!

مغربی ملکوں میں پہلے بال روم ڈانسنگ نسبتاً شائستہ ماحول میں منعقد ہوتی تھی لیکن اب رقص کی پچاسوں قسمیں۔ اسٹرپ ٹیز، کیبرے، ٹوئسٹ، پلکس، ٹاپ لیس اور لیپ ڈانسنگ وغیرہ انتہائی ہیجان انگیز اور پُرشہوت رائج ہو گئی ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں پیرس کے ایک نائٹ کلب میں ایک رقاصہ نے ''اسٹرپ ٹیز'' کا کمال پیش کیا۔ وہ انسانی فطرت کے اس راز سے واقف تھی کہ نیوڈ سے زیادہ نیکڈ ہونے کے منظر میں چونکہ Suspnense بنا رہتا ہے، لہٰذا حاضرین اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ دیدہ زیب لباس پہن کر اسٹیج پر آئی اور آہستہ آہستہ رقص کرتے ہوئے موسیقی کی دُھنوں میں اپنے کپڑے اُتارتی گئی اور بالآخر بالکل برہنہ ہو گئی! یہ فن لطیف جلد ہی یورپ و امریکا کی رقص گاہوں میں رائج ہو گیا، اس کے دلدادہ اپنے کو Lovers of the Graceful Art of Undressing کہتے ہیں فرانس میں اس آرٹ کی ٹریننگ کے لئے ایک مخصوص اکیڈمی قائم کی گئی جو اسٹرپ ٹیز کے لئے مخصوص کیبرے کھلوانے اور نئی نئی جدتیں وضع کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔ اس فن کو سیکھنے کے بعد رقاصاؤں کو اچھا مالی معاوضہ ملتا ہے۔ کرسٹائن کیلر کو ستر ہزار روپے فی ہفتہ معاوضہ ملتا تھا۔

اسٹرپ ٹیز اور کیبرے رقص کے پروگرام بڑے ہوٹلوں، رقص گاہوں اور نائٹ کلب میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ جہاں ساری ساری رات شراب پی کر رقص کر کے گزار دی جاتی ہے۔ رقاصہ جھرجھرے لباس، کبھی موتیوں کی خوشنما جھالر، کبھی پنکھوں کے رنگا رنگ لباس زیب تن کر کے نیم برہنہ یا کلیتاً برہنہ اسٹیج پر آتی ہے اور رنگین اسپاٹ لائٹ میں موسیقی کی دُھنوں میں اپنے رقص کا کمال دکھاتی ہے۔ کلب کی ہیجان انگیز و رومان انگیز فضا

میں وہ آہستہ آہستہ تھرکتے ہوئے اپنے جسم سے اُن برائے نام کپڑوں کو اتارتی جاتی ہے اور بالآخر بالکل برہنہ ہوجاتی ہے! قانون کے مطابق یہ آخری سین پانچ سکنڈ سے زیادہ طویل نہیں ہوسکتا۔اس کے بعد اسپاٹ لائٹ بند کردی جاتی ہے اور رقاصہ غائب ہوجاتی ہے۔اس شو کی قیمت ہزاروں روپے تک جا پہنچتی ہے۔

فرانس نے بالخصوص اس آرٹ کو نقطہ عروج تک پہنچادیا ہے وہاں کے کیبرے رقص دیکھنے کے لئے دور دراز ملکوں سے سیاح آتے ہیں اور اس رقص سے محظوظ ہوتے ہیں۔وہاں ایک ''فرنچ اکیڈمی آف اسٹرپ ٹیز'' بھی قائم ہے جو حسین دوشیزاؤں کو مختلف قسم کے رقص کی ٹریننگ دیکر نئے نئے پروگرام منعقد کرتی رہتی ہے۔

حال میں لندن کے Gielgud تھیٹر میں امریکن سپر ماڈل Jerry Hall نے ایسا رقص کرتے ہوئے اپنا تولیہ گرادیا اور آٹھ سکنڈ تک اسٹیج پر بالکل برہنہ رقص کیا جس سے شاک کی لہر پورے ہال میں دوڑ گئی لیکن چونکہ تماشبین اس نظارہ کو دیکھنے کے لئے تیار ہوکر آئے تھے اس لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی!(۱)

راک این رال (Rock N Roll) ایک وحشیانہ قسم کا رقص ہے اور لیٹس کس (Let`s Kiss) اس سے بھی زیادہ وحشیانہ ہوتا ہے۔نوجوان لڑکے ولڑکیاں جوڑوں میں ناچتے تھرکتے ہیں اور رقص کے اختتام پر بوسوں کی بوچھار کردیتے ہیں۔اس کی ابتدا فن لینڈ میں ہوئی، یہ وحشی پولکا کے قسم کا ایک ناچ ہے۔یہ گروپ میں بھی کیا جاتا ہے اور جوڑوں میں بھی۔ڈاکٹروں نے اس کے جراثیم پھیلانے کے امکانات کی وجہ سے اس کی مخالفت کی اور چرچ کے حکام نے بھی منبر سے اس کی مخالفت کی، لیکن نوجوان پوری طرح اسے اپناتے جارہے ہیں۔ٹوئسٹ مغربی ملکوں میں پوری طرح پھیل چکا ہے بلکہ رُوس تک میں یہ خوب رائج ہوگیا ہے۔ایک روسی میگزین نے اسے ''مغرب کے انحطاط'' کی نشانی بتایا اور اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ کیسے روسی نوجوانوں کو ان عامیانہ دُھنوں پر رقص کرنے سے باز رکھا جائے۔

نیویارک کے ایک کلب نے ''ٹاپ لیس'' رقص کی ابتدا کی جس میں عریاں چھاتیوں کی نمائش کرنے والی ساقنوں نے رقص کے پروگرام شروع کئے۔شکاگو کے طلباء

---

(۱) Toi 3-8-2001

ٹوگا (Toga) رقص زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں لڑکے ولڑکیاں صرف ایک چادر میں ملبوس ہوکر وحشی دُھنوں پر رقص کرتے ہیں اور جب جذبات خوب برانگیختہ ہوجاتے ہیں تو کلب کے قالینی فرش پر لوٹ کر بوس وکنار میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ایک دوسرا رقص جو نوجوانوں میں بہت پسند کیا جارہا ہے۔ "Nude Kicking Parties" کہلاتا ہے جسمیں نوجوان اپنے سارے کپڑے اُتار ڈالتے ہیں۔صرف بوٹ پہنے رہتے ہیں اور شراب کے نشے میں دُھت ہوکر خوب رقص کرتے ہیں، پھر ایک دوسرے کو کک کرنے لگتے ہیں جس سے بسااوقات ہاتھ پیر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ڈسکو میوزک کی دُھن پر رقص اب سب ہی یوروپی وامریکی ملکوں میں بلکہ کمیونسٹ بلاک کے ملکوں رُوس، ہنگری، زیکوسلواکیا وغیرہ میں انتہائی مقبول ہوگئے ہیں۔ڈسکوتھ بڑا پُر منفعت کاروبار ہوگیا ہے کیونکہ بڑے شہروں کے علاوہ یہ مضافات شہر میں بھی کھلتے جارہے ہیں، حالانکہ سوشلسٹ کلچر کے حامی اسے پسند نہیں کرتے اور اِسے مغرب کے انحطاط پذیر کلچر کی نشانی مانتے ہیں، پھر بھی مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں میں یہ بڑی تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں۔ ویڈیو ریکارڈس ۱۹۷۰ء کے بعد رُوس میں بہت فروغ پاگئے ہیں اور مغربی ملکوں کی اسمگل کی گئی فلمیں لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔حالانکہ قانوناً ان فلموں پر پابندی عائد ہے۔Last Tango in Paris اور Fanny & Alexander وہاں بھی بہت مقبول ہیں۔

برطانیہ کے متمول طبقہ کو بڑا دھچکا اُس وقت لگا جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اُن کی لاڈلی اولاد جسے وہ پندرہ سو پاؤنڈ سالانہ خرچ کرکے ایٹن (Eton) کے نامی اسکول میں تعلیم دلوارہے ہیں وہ بھی ایک اسٹرپیر (Stripper) رقاصہ کے دام فریب میں گرفتار ہوگئے ہیں۔انگلستان کے اس معزز تعلیمی ادارہ میں (16 اکتوبر ۱۹۷۶ء کو) ایک ٹاپ لیس اسٹرپیر نے سیاہ جھر جھرے لباس میں رقص کا مظاہرہ کیا۔اسکول کا ہال فوٹوگرافرس سے کھچا کھچ بھرا تھا جو اس تاریخی واقعہ کے فوٹو کھینچنے کے لئے منتظر تھے!

کناڈا میں گرم پانی سے بھرے ہوئے سوئمنگ پول میں لیپ ڈانسنگ (Lap Dancing) شروع ہوئی جس میں عریاں سُرین رکھنے والی دوشیزائیں مردوں سے ہم آغوش ہوکر رقص کرتی ہیں اور بوس وکنار سے بھی محظوظ ہوتی ہیں۔اس رقص کو ناشائستہ قرار

دیے جانے کے لئے معاملہ اونٹیریو کی ہائی کورٹ میں لے جایا گیا لیکن عدالت نے فیصلہ دیا کہ اس سلسلہ میں سپریم کورٹ نے جو گائڈ لائن طے کر رکھی ہیں یہ اُن کے مطابق ناشائستہ نہیں ہے۔ اونٹیریو کی عدالت کے اس فیصلہ کے خلاف حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کی تو سپریم کورٹ نے اپنے تاریخی فیصلہ میں اسے ناشائستہ قرار دیا اور لکھا کہ ''لیپ ڈانسنگ کی ایروٹک (Erotic) پریکٹس کناڈا کے معیار برداشت سے بھی ناشائستہ ہے، لہٰذا اسے بند کیا جانا چاہئے۔''

ٹیلیویژن اور انٹرنیٹ

الیکٹرانک میڈیا کا شاہکار ٹیلیویژن اور انٹرنیٹ اب دُنیا میں اتنے وسیع پیانے پر رائج ہوگئے ہیں کہ انہوں نے افراد کی سوچ اور معاشرہ کی قدروں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ ٹی وی کلچر اس قدر حاوی ہوگیا ہے کہ کتابوں، اخبارات و رسائل کے ذریعہ پہنچائی جانے والی چیزیں اب فرسودہ دکھائی دینے لگی ہیں۔ ٹیلیویژن اور پاپ میوزک کا امریکی نوجوانوں پر زبردست غلبہ ہے اور یہ اپنے پروگراموں میں حد سے بڑھی ہوئی مادیت کی نمائش کرتے ہیں اور سولہ سال کی عمر کو پہنچنے تک ایک نوجوان ٹیلیویژن پر قتل و تشدد کے دو لاکھ سے زیادہ مناظر دیکھ چکا ہوتا ہے اور بیشتر ہٹ سانگس (Hit Songs) میں حملۂ مجرمانہ اور فحاشی کی دُھنیں شامل ہوتی ہیں۔ چین جہاں اب سے بیس سال قبل ٹی.وی ایک لکژری مانا جاتا تھا، اب وہاں 600 ملین افراد ٹیلیویژن دیکھتے ہیں اور یہ تعداد دُنیا کے سب ملکوں سے زیادہ ہے۔ ملک میں 100 ملین ٹی وی سٹ ہیں اور یہ بلیک اینڈ وہائٹ سٹ تیار کرنے والا دُنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اور رنگین ٹی وی کی تیاری میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ چین کے [illegible] سے زیادہ خاندانوں میں ٹی وی ہے۔ چین میں وی.سی.آر اتنی تیزی سے فروخت ہو رہے ہیں کہ فیکٹریاں مانگ کے مطابق مال تیار نہیں کر پا رہی ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں ملک میں 44 ہزار وی.سی.آر تیار کئے گئے، ملک بھر میں تین لاکھ سے زیادہ وی.سی.آر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ گویا ہر ایک ہزار خاندانوں پر ایک مشین!

جاپان کی Matsushita کمپنی دُنیا کا سب سے بڑا ٹی وی بنانے جا رہی ہے جس کا اسکرین 43 انچ کا ہوگا، یہ 1.43 میٹر اونچا، 1.06 میٹر چوڑا اور 0.68 میٹر گہرا

ہوگا۔ اسکرین کے لئے ڈبل لیئر گلاس استعمال کیا جائے گا۔ یہ ماڈل ہوٹلوں اور نمائش گاہوں کے لئے موزوں رہے گا۔ اس کی قیمت دو ملین ین ہوگی۔

آج دُنیا میں 810 ملین سے زیادہ ریڈیو سٹ استعمال کئے جا رہے ہیں جس میں 444 ملین (55 فیصدی) صرف ریاستہائے متحدہ امریکا میں ہیں اور 15,290 سے زیادہ ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ اسی طرح 360 ملین سے زیادہ ٹیلیویژن سٹ ہیں جس میں 130 ملین (36 فیصدی) صرف ریاستہائے متحدہ امریکا میں ہیں اور 6,700 سے زائد ٹی وی اسٹیشن ہیں۔ چین کے باشندے ٹی وی کے زیادہ شائق ہوگئے ہیں اور وہاں 100 ملین سٹ، روس میں 64 ملین، جاپان میں 27 اور جرمنی میں 20 ملین ٹی وی سٹ ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۹۴ء میں 18.2 ملین رنگین ٹی وی اور 7 ملین سے زیادہ بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی سٹ تیار کئے گئے۔ نیشنل نیٹ ورک (دوردرشن) ملک کے 760 ملین باشندوں کو دیکھنے کے لئے میسر رہتا ہے اور ملک کی 84 فیصدی آبادی اور خطۂ ارض پر بسنے والے 65 فیصدی افراد 553 ٹرانسمیٹرس پر اس کے پروگرام دیکھتے ہیں۔ ٹرانسمیشن کا وقت اب 95 گھنٹہ ہوگیا ہے۔

ٹیلیویژن میں انہماک

امریکا کے بچے سب سے زیادہ ٹی وی دیکھنے کے شائق ہیں۔ کنڈرگارڈن کی سطح کا بچہ اپنے جاگنے کے وقت کا 64 فیصدی حصہ ٹی وی دیکھنے میں لگاتا ہے۔ نیلسن رپورٹ کے مطابق ۲ سے ۵ سال کی عمر کا بچہ اوسطاً ہر ہفتہ 27.9 گھنٹہ ٹی وی دیکھنے میں صرف کرتا ہے۔ دوسرے سروے میں اس سے بھی زیادہ وقت 54 گھنٹہ فی ہفتہ تک بتایا گیا ہے۔ ہائی اسکول کی سطح تعلیم حاصل کرنے تک لڑکے و لڑکیاں 15 ہزار گھنٹہ ٹی وی دیکھنے میں صرف کر چکے ہوتے ہیں اور 14 سال کی عمر کو پہنچنے تک اس نے ساڑھے تین لاکھ کمرشیل دیکھ لئے ہوتے ہیں جن میں اٹھارہ ہزار لوگوں کا قتل ہوتے وہ دیکھ چکا ہوتا ہے۔ امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر ایم. بی. رانبرگ کا کہنا ہے کہ ''ٹیلیویژن پر مسلسل قتل و غارت گری اور دوسرے بہیمانہ جرائم دیکھ کر یہ بچہ غیر حساس بن جاتا ہے اور دوسروں کی تکلیف کی طرف سے بے

تعلق سا ہو جاتا ہے''۔ ڈاکٹر گیرالڈ ٹومے نے کہا کہ گذشتہ تیس سال میں والدین اور اساتذہ کا مشفقانہ کردار الیکٹرانک میڈیا نے چھین لیا ہے۔

پروفیسر جارج گربز (یونیورسٹی آف پن سلوانیا) کا کہنا ہے کہ ٹی وی دیکھنے سے تو تشدد پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اسکرین پر مسلسل پُرتشدد مناظر دیکھنے سے خوف و ہراسگی کا ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جس میں تشدد کی طرف رجحان رکھنے والے افراد پُرتشدد کارروائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا جتنا زیادہ ہم Violence Oriented پروگرام دیکھیں گے۔ اتنا ہی تشدد اور جرم کا ماحول بنتا چلا جائے گا جس کے نتیجہ میں تشدد اور جرائم کے واقعات میں اضافہ ناگزیر ہے۔ پروفیسر ہربرٹ ہنرج (میڈیا ایکسپرٹ) نے ایک سروے میں یہ پایا کہ بچے خاص طور پر چھوٹے بچے جرائم کی فلموں کو بڑے غور سے دیکھتے ہیں اور اس کے گہرے نقوش ان کے ذہن پر ثبت ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر ہو جاتے ہیں۔ زیادہ خوفناک مناظر دیکھنے پر وہ اپنے ماں باپ سے لپٹ جاتے ہیں۔ اگر وہ اکیلے ہوتے ہیں تو ایسا نہیں کر پاتے اس لئے وہ زبردست تناؤ محسوس کرتے ہیں اور انہیں شاک لگتا ہے، لہٰذا انہیں اکیلے میں جرائم کی فلمیں نہیں دیکھنا چاہئے۔ موصوف نے ہی جب بچوں سے یہ پوچھا کہ وہ اپنے والد یا ٹی وی میں کس کے بغیر رہ سکتے ہیں تو 32 فیصدی بچوں نے یہ جواب دیا کہ وہ ''اپنے والد کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن ٹی وی نہیں چھوڑ سکتے''۔

مغربی ملکوں میں ٹیلی ویژن کے اس بڑھتے ہوئے انہماک پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے جرمن چانسلر Helmut Schmidt نے کہا کہ ''ہمارے خاندانوں کو ہفتہ میں کم از کم ایک دن اپنے ٹی۔وی سٹ بند کر دینا چاہئے اور آپس میں بات چیت کرنا چاہئے۔ ہم آپس میں کافی بات چیت نہیں کرتے نہ شادی شدہ جوڑے آپس میں، نہ والدین اپنے بچوں سے اور نہ دوست احباب آپس میں، جس کی وجہ سے ہم تنہا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ٹی۔وی بعض اچھے اور معقول پروگرام بھی پیش کرتے ہیں لیکن بہت زیادہ ٹی۔وی دیکھنے سے ہم لوگ اور خاص طور پر ہمارے بچے اس دُنیا اور اپنے سماج کے بارے میں ایک جھوٹا تصور قائم کر لیتے ہیں جو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا''۔

اقوامِ متحدہ کے سابق سکریٹری جنرل یوتھانٹ نے کہا تھا کہ موجودہ تفریحی

آلات ٹیلی ویژن شو، فلموں اور پاپولر لٹریچر میں تشدد کا عنصر بہت ہی بڑھ گیا ہے، یہاں تک کہ وہ افراد کی روزانہ زندگی کا ایک لازمی جزو بنکر پوری طرح حاوی ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ افراد و اقوام کا برتاؤ زندگی کے ہر معاملہ میں اتنا پُرتشدد ہو گیا ہے۔

پروفیسر سوروکن اپنی کتاب Sane Sex Order میں لکھتے ہیں کہ ''اس آلہ کا اہم کار نمایاں اب تک صرف یہی رہا ہے کہ ہمارے لاکھوں خاندانوں میں نائٹ کلب کا عاشقانہ بدمستی سے بھرپور ماحول، بھدے کمرشیل پروگرام، قتل و جنس کے ڈراموں کے لامتناہی سلسلہ کو پیش کیا جائے۔ اگر ہماری فلموں کی اکثریت اخلاقی انحطاط کے گڈھ کے سرے تک پہنچاتی ہے تو ٹیلی ویژن پروگراموں کی اکثریت ہمیں اس گندگی میں پوری طرح غرق کر دیتی ہے''۔ ص ۲۷

ناشائستہ (Offensive) پروگرام

مغربی ملکوں میں ٹیلی ویژن کے پروگرام انحطاط کی کس حد پہنچ گئے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکا میں ''۱۱ بجے رات'' کے شو میں روزانہ اور Adult Hour میں ہر سنیچر کی شب سیکس شاپس، مساج پارلرس کی سیڈو ڈاکومنٹری میں عریاں چھاتیوں اور عریاں رانوں کی نمائش بے جھجک کردی جاتی ہے۔ جاپان میں کافی شاپس میں عریاں سینوں کی نمائش کرتی ہوئی ویٹرس کے سین ٹی وی اسکرین پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اسٹریلیا میں "Last Tango In Paris" اور "Let`s Go Naked" نیوڈسٹ کالونی میں تیار کردہ ڈاکومنٹری ٹیلویژن پر دکھائی گئی۔ یوگوسلاویہ میں سیکس، ہوموشکولٹی اور Profanity Full Nudity ٹی.وی اسکرین پر برابر دکھائی جاتی ہے اور Breakdown میں جب Penis کی صاف نمائش کردی گئی تو صرف کچھ افراد نے اعتراض اٹھایا! فرانس کے تینوں سرکاری نٹ ورک سیکس اور عریانیت کا بے جھجک مظاہرہ اپنے پروگراموں میں کرتے رہتے ہیں۔

سوئڈن میں ٹی.وی اسکرین پر ایک امریکی جوڑے کو برہنہ رقص کرتے دکھایا گیا، اس کے خلاف ٹیلیفون سے احتجاج کئے گئے لیکن ذمہ داروں نے کہا کہ ننگے رقص کی یہ نمائش اعلیٰ سطح پر صلاح و مشورہ کے بعد کی گئی تھی! بی بی سی نے ٹی وی پر بچہ کی ولادت کا پورا

منظر دکھادیا۔ فلم دکھانے سے قبل اناؤنسر نے صرف یہ اعلان کیا کہ جو لوگ اس منظر کو نہ دیکھنا چاہیں وہ سٹ چھوڑ کر چلے جائیں۔ برٹش ٹیلیویژن ڈاکومنٹری میں ایک نیوڈسٹ کالونی کے برہنوں کے گروہ در گروہ جس میں عورتیں بھی شامل تھیں، اپنے خیموں کے ارد گرد خوشی کا جشن مناتے دکھائے گئے Male & Female Anatomy Was Shown In Full Frontal Frankess فلم میں مردانہ و زنانہ اعضائے جسمانی کی آزادانہ و بے جھجک نمائش کی گئی تھی۔ پروگرام کے شروع میں یہ اعلاج کردیا گیا کہ شاید کچھ خاندان اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کریں تو وہ اپنے سٹ آف کردیں!

بی بی سی نے ہی سوال و جواب کے طرز کا ایک 45 منٹ کا پروگرام پیش کیا جس میں بہ ظاہر ایک عریاں خاتون کو ایک مرد کے ساتھ قبل از ازدواج جنسی تعلقات، ہوموشکولٹی، Incest، محرومات کے ساتھ مباشرت جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے دکھایا گیا۔ پروگرام کے اختتام پر ڈائریکٹر نے ماڈل سے اپنے جنسی تجربات پر تبادلۂ خیالات کیا، سوالات بڑے چونکا دینے والے تھے لیکن ماڈل بھی اپنے نظریات میں بالکل آزاد واقعی ماڈرن تھی، وہ بلا جھجک جوابات دیتی رہی۔ اس پروگرام کا پیش ہونا تھا کہ ہزاروں دیکھنے والے ششدر رہ گئے اور ٹیلیفون و خطوط سے بی بی سی سے زبردست احتجاج کیا گیا کہ ایسا عریاں پروگرام نشر کیسے کیا گیا؟ بی بی سی کے ترجمان نے جو جواب دیا وہ قابل غور ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ پروگرام تیار تو دس مہینہ سے تھا لیکن ٹی وی کے کنٹرولر اب جاکر اس پر رضامند ہوئے کہ اسے دیر رات بالغوں کے دیکھنے کے اوقات میں پیش کیا جائے انہوں نے مزید کہا کہ ''یہ پروگرام یہی دیکھنے کے لئے تھا کہ روایت پرست برطانیہ اس آئیٹی اور خلائی دور میں بھی جنسی تعلقات اور اخلاقی قدروں کے معاملہ میں انہیں دقیانوسی قدروں پر جما ہوا ہے جو آج سے صدیوں قبل قائم کی گئی تھیں!''

اٹلی میں سرکاری ٹیلیویژن نے کافی غور و خوص اور بحث و مباحثہ کے بعد بیسوائی پر Candid Camera کے ذریعہ تیار کی گئی ایک ڈاکومنٹری ٹی وی پر پیش کردی۔ اس فلم میں بیسوا کے کمرہ میں خفیہ کیمرے لگا کر عصمت فروشی کے کاروبار کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور اُسے ٹی وی اسکرین پر دکھایا گیا۔ تحریک آزادی نسواں کی ایک ذمہ دار عہدہ دار نے کہا کہ عصمت فروشی کے کاروبار میں عورت کا جس طرح استحصال کیا جارہا ہے اس سے معاشرہ کی

ریاکاری کا پردہ فاش ہوجاتا ہے۔

چین میں پہلے پروگرام نسبتاً بہتر ہوتے تھے اور برہنگی کے مظاہرے سے گریز کیا جاتا تھا لیکن اب وہاں بھی اسکرین پر بوس و کنار کے بڑے گرم منظر اور تشدد کی بھرپور عکاسی کرنے والی فلمیں ٹی وی پر دکھائی جانے لگی ہیں۔ Eighteen Years Behind Enemy Lines میں نسوانی جسموں کی اس قدر برہنہ نمائش کی گئی تھی کہ کئی فلمی نقادوں نے اس پر سخت تنقید کی ایک اداکارہ کو صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا لپیٹ کر غسل کرتے دکھایا گیا تھا جس پر خاص طور سے اعتراض کیا گیا۔

نائیجیریا میں ایک قتل کی واردات اور عدالتی پھانسی کی فلم بنا کر ٹی. وی پر دکھائی گئی۔ اس رُجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے اخبار ''ٹائمز'' نے لکھا کہ ''ٹیلیویژن کی رپورٹنگ کی بھی کوئی حدود ہونا چاہئیں یا اُسے بالکل ہی چھوٹ ہے کہ وہ جنگ کی خوفناکیوں اور انتہائی کرب یا بہیمیت کے مناظر بھی ناظرین کے سامنے پیش کردے؟

''واشنگٹن پوسٹ'' نے لکھا کہ ''دوسرے ملکوں میں عام طور پر یہ خیال رائج ہے کہ امریکا پُرتشدد فلموں کو پسند کرتا ہے لیکن یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ دراصل 83 فیصدی امریکی ٹی وی پروگرام پر تشدد نہیں ہوتے البتہ سیکس سے بھرے رہتے ہیں''۔

ٹیلیویژن اور اخلاقی قدروں کی پامالی

معاشرہ پر ٹیلیویژن کے اثرات معلوم کرنے کے لئے امریکا میں ۱۹۹۶ء میں دو تحقیقاتی سروے کئے گئے۔ پہلا سروے عام امریکیوں سے یہ معلوم کرنے کے لئے کیا گیا کہ اُن کے خیال سے ٹی وی دیکھنے کا اثر خاندان کی قدروں پر کیا پڑتا ہے اور دوسرے میں ہالی وڈ کے ایکزیکیٹیوز (Executives) سے یہ دریافت کیا گیا کہ اُن کی رائے میں معاشرہ پر ٹیلیویژن کے کیا اثرات مرتب ہورہے ہیں؟ پہلے سروے سے یہ انکشاف ہوا کہ واقعی ٹیلیویژن کے کافی مضر اثرات معاشرہ پر مرتب ہورہے ہیں۔ دو تہائی سے زیادہ امریکیوں نے یہ اعتراف کیا کہ ٹی وی دیکھنے سے تشدد میں اضافہ ہوا ہے، خاندانی قدریں پامال ہوتی ہیں اور حکومت نیز قانون کا نفاذ کرنے والی ایجنسیوں کی طرف بدگمانی پیدا ہوئی ہے۔ پرائم ٹائم میں پیش کئے جانے والے پروگراموں کا جو تجزیہ کیا گیا اس میں نصف سے زیادہ میں

جنسی مناظر کی بڑی واضح تصویر کشی کی گئی تھی اور بڑی تعداد میں لوگوں نے اتنی بیباک گرافکس پیش کیے جانے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

دوسرے سروے میں ہالی وڈ کے ایگزیکیٹوز میں اسّی فیصدی نے یہ تسلیم کیا کہ ٹی وی پر دکھائے جانے والے تشدد میں اور اصل زندگی میں پُرتشدد برتاؤ کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔

- 53 فیصدی ایگزیکیٹوز نے یہ مانا کہ ٹی وی کے پروگرام دیکھنے کی وجہ سے ہی لوگوں کا اعتماد حکومت سے اُٹھتا جارہا ہے۔
- 46 فیصدی نے خاندانی قدروں میں انحطاط کے لئے بھی ٹی وی کو ذمہ دار قرار دیا۔
- 34 فیصدی نے یہ بھی مانا کہ امریکا میں طلاق کے بڑھتے ہوئے واقعات کے لئے بھی ٹی وی کے یہ پروگرام خاصی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

گلف کے میڈیا ایکسپرٹس نے مغربی بالخصوص امریکا کے سٹیلائٹ ٹی وی پروگراموں کو پورنوگرافک بتاتے ہوئے انہیں مخرب اخلاق بتایا۔ ایمریٹ سنٹر فار اسٹریٹیجک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ (Centre for Strategic Studies & Research) ایک مطالعہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ سٹیلائٹ ٹیلیویژن کے پروگرام اس علاقہ میں فیشن، موسیقی، پسند کے معیار (Taste) مادّی اشیاء کی مانگ یہاں تک کہ لوگوں کی سوچ پر بھی اثر انداز ہورہے ہیں۔

دُنیا کے دوسرے علاقوں کی طرح گلف میں بھی انٹرنیشنل براڈ کاسٹنگ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے دوران شروع ہوئی۔ جب امریکا کی کیبل نیوز اینڈ نٹ ورک (CNN) نے جنگ کے مناظر کو (Live) ساری دُنیا کے لوگوں کو اُن کے ڈرائنگ روم میں ہی دکھادیا، اب تقریباً ہر خلیجی خاندان پابندی سے ان پروگراموں کو جن میں امریکی لائف اسٹائل کو پیش کیا جاتا ہے، دیکھنے کا عادی ہوگیا ہے جو ایک نئی قسم کی کلچرل امپریل ازم ہے!

سٹیلائٹ ٹی وی کا اثر نوجوانوں پر معلوم کرنے کے لئے اس مطالعہ میں سعودی عرب، کویت، متحدہ عرب ایمرت (UAE) ہر ملک کے ۱۴ سے ۲۲ سال کی عمر کے پانچ پانچ سو طلباء سے جن میں لڑکے و لڑکیاں برابر تعداد میں شامل تھیں سوالات پوچھے گئے تو یہ معلوم ہوا کہ عام طور پر ہر خلیجی ملک کے خاندان میں تین ٹی وی سٹ ہوتے ہیں اور ہر نوجوان

اوسطاً دو گھنٹہ روزانہ اِن پروگراموں کو دیکھتے ہیں۔ سعودی نوجوان اسپورٹس چینل کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں، کویت کے نوجوان کامیڈی پروگرام کو اور متحدہ عرب ایمریٹ کے نوجوان میوزک چینل کو شوق سے دیکھتے ہیں۔ سروے سے یہ معلوم ہوا کہ ہوم نیشنل چینل کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے۔ خاص کر نئی نسل کے نوجوانوں میں جو CNN، NBC کے پروگراموں کو زیادہ شوق سے دیکھتے ہیں یا بی بی سی کے عربی پروگرام سنتے ہیں۔ کچھ طلباء نے یہ بھی کہا کہ ملکی میڈیا کی بہ نسبت غیر ملکی نیوز نٹ ورک زیادہ معتبر معلومات مہیا کرتے ہیں۔

متحدہ عرب ایمریت میں سماجیات کے پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ کوالوا نے حال میں گلف کے خاندانوں اور معاشرہ پر بین الاقوامی سٹیلائٹ چینل کے مرتب ہونے والے اثرات کا ایک تحقیقی جائزہ لیا جس میں جرائم اور خاص کر جرائم اطفال سے اُس کے گہرے تعلق کا بھی احاطہ کیا گیا۔ موصوف نے اپنے اس مطالعہ میں یہ پایا کہ بچوں میں کچھ ایسے جرائم ظہور پذیر ہوئے ہیں جو پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے۔ پروفیسر موصوف اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''سٹیلائٹ ٹی وی پر مغربی ملکوں کے پروگرام دیکھ کر یہ نوجوان اور کم عمر بچے انہیں مغربی قدروں اور لائف اسٹائل کو اپنانے لگتے ہیں اور اسی سے یہ رُجحان پیدا ہورہا ہے''۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون نے بتایا کہ خود میرے شوہر ہر وقت ٹی وی سے چپکے بیٹھے رہتے ہیں، بچوں کا کیا کہنا۔

اسلامی رُجحان رکھنے والے ذمہ دار عہدہ دار ایسے پروگراموں پر پابندی لگانے کی تجویز دے رہے ہیں لیکن شارجاع کے ٹی وی کے ڈائرکٹر جنرل نے کہا کہ ایسے مغربی پروگراموں کا مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس سے بہتر پروگرام پیش کریں نہ کہ اس پر پابندی عائد کردیں۔ انہوں نے کہا کہ تمام عرب ممالک کو مل کر ٹی وی کے اس حملہ کا مقابلہ کرنا چاہئے اور عمدہ پروگرام عربی زبان میں پیش کرنا چاہئے تاکہ نوجوان اس طرف رُجوع ہوسکیں۔ اگر یورپ اور گلف میں سٹیلائٹ ڈش کا موازنہ فیصدی کے اعتبار سے کیا جائے تو گلف میں زیادہ سٹیلائٹ ڈش پائے جائیں گے بہ نسبت یورپ کے۔

موزمبیک کی پارلیمنٹ میں ایک مباحثہ کے دوران ایک رُکن پارلیمنٹ نے کہا کہ Racy Brazilan Television Soaps ملک میں بڑھتی ہوئی بیسوائی کا ایک

بہت بڑا سبب ہیں، والدین خود اپنے بچوں کو Tele Novealas دیکھنے دیتے ہیں جس میں عریاں رقص کرتی ہوئی رقاصائیں اپنے جسمانی نشیب وفراز کو بے باکانہ انداز سے اسٹیج پر برہنہ پیش کردیتی ہیں جس کا یقینا خراب اثر نوجوانوں پر پڑ رہا ہے، اس طرح ہم خود اپنے نوجوانوں کے اخلاقی انحطاط کے لئے ذمہ دار ہیں۔ ایم۔ ٹی۔ وی برطانیہ اور دوسرے یوروپی ملکوں میں تقریبا 50 ملین گھرانوں کو کیبل اور سٹیلائٹ پر پروگرام دکھاتا ہے، ان پروگراموں میں Sado Masochism اور Anal Sex کے اتنے گندے پروگرام پیش کئے گئے کہ خود وہیں کے انڈیپنڈنٹ ٹیلیویژن کمیشن نے 60 ہزار پاؤنڈ کا جرمانہ عائد کردیا!

ٹی وی کی نئی ٹکنالوجی V. Chip میں والدین کو یہ اختیار رہتا ہے کہ وہ جس پروگرام کو قابل اعتراض سمجھیں اُسے بند کرسکتے ہیں۔ امریکا میں یہ نئی ٹکنالوجی استعمال کی جانے لگی جس پر ری پبلکن نمائندہ تھامس بیلی نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ اس سے ہالی وڈ کو اور بھی موقع مل جائے گا کہ وہ اور زیادہ پر تشدد و جنسی سین دکھانے والے پروگرام بنائیں کیونکہ ناپسندیدہ پروگرام آف کئے جاسکتے ہیں۔

ٹیلی ویژن بینی کے خوفناک اثرات

ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو بکثرت دیکھنے سے بڑے ہی مضر صحت اثرات انسان کے جسم اور دماغ پر نیز اُس کی نفسیات پر مرتب ہوتے ہیں، اس سے خاندانی زندگی میں انتشار اور تعلیم میں خلل بھی واقع ہوتا ہے اور یہ افراد کے جذبات میں ہیجان برپا کرکے انہیں تشدد اور جرائم پر بھی اُکساتا ہے۔ دہشت گردی اور پُر تشدد مناظر نیز عریانیت وسیکس آجکل کے بیشتر فکشن، فلموں اور ٹی وی کا ناگزیر جز ہوتے ہیں۔ ایسے لٹریچر کو پڑھنے اور ایسے پروگراموں کو دیکھنے کے بعد انفرادی واجتماعی برتاؤ میں متشددانہ رجحان کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ پائنیر نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا:

”آج کی دُنیا بڑی ہی خوفناک ہوتی جارہی ہے۔ معاشرہ کے مختلف شعبوں میں، اخباروں اور فلموں میں اور سب سے بڑھ کر ٹیلیویژن پر خوفناک مناظر کثرت سے دکھائے جانے لگے ہیں۔ نئی نسل کے نوجوان جو کامکس پڑھ کر تیار ہوئے ہیں ان میں خوفناکی کی طرف اتنا شدید رُجحان پیدا ہوجاتا ہے کہ اکثر یہ نوجوان بڑے ہی

خوفناک قسم کے قتل کرڈالتے ہیں، خصوصاً مغربی ملکوں میں، جن کی تفصیلات رونگٹے کھڑے کردینے والی ہوتی ہیں“۔

ماہرین سماجیات نے نوجوانوں میں بڑھتے ہوئے جارحانہ رُجحان کے لئے فلموں اور ٹی وی اسکرین پر بہیمانہ (Sadistic Brutality) مناظر کے ذریعہ سفلی جذبات کا اُبھارا جانا بتایا۔ پروفیسر ہربرہنرچ کا کہنا ہے کہ میڈیا میں بڑھتا ہوا تشدد ایسے جذبات کو اُبھارتا ہے جس سے ڈیموکریسی اور باہمی اشتراک وتعاون حاصل کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

پروفیسر رابرٹ ایم۔ لائبرٹ (R.M. Liebert) (ماہر نفسیات نیویارک یونیورسٹی) نے بچوں پر کئے گئے تجربات میں یہ پایا کہ جو بچے مسلسل گیارہ دن تک ٹی وی پر تشددانہ پروگرام دیکھتے رہے ان میں جارحانہ ذہنیت 200 سے 300 فیصدی تک بڑھ گئی ہے۔ ایک دوسرے تجربہ میں جو تین سے پانچ سال کے بچوں پر کیا گیا یہ پایا گیا کہ 88 فیصدی بچوں میں ایسے پروگرام دیکھنے کے بعد جارحانہ رُجحان پیدا ہوجاتا ہے اور فری چوائس ہونے کے باوجود وہ ایسے کھلونوں سے کھیلتے ہیں جن میں Aggressive Connotations ہوں۔ اسی تجربہ میں جب ۹ سے ۱۲ سال کے 434 بچوں کا مشاہدہ کیا گیا تو یہ دیکھا گیا کہ وہ اپنی پرابلم حل کرنے میں فورس کا استعمال کرتے ہیں اور لڑکیوں کی طرف بے رغبتی کا رویہ اپناتے ہیں۔ پروفیسر Undeutsch تو اس حد تک کہتے ہیں کہ ٹی وی پر تشدد کی فلمیں دیکھ کر بچے اور نوجوان جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

پروفیسر البرٹ باڈورا (اسٹینفورڈ یونیورسٹی) کا کہنا ہے کہ مسلسل تشدد کی فلمیں دیکھ کر بچے جارحانہ رویہ اختیار کرلیتے ہیں۔ کچھ ہی وقت تک ایسی فلموں کو دیکھ کر بچے اپنے برتاؤ میں اس کی نقل اُتارنے لگتے ہیں اور مہینوں بعد بھی وہ اُن دیکھی ہوئی چیزوں کی ہوبہو نقالی کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ اصل زندگی میں ایسے مسائل سے دوچار ہونے پر برتاؤ کا یہی طریقہ اپنانا چاہئے۔ کیٹ موڈی (۱) لکھتی ہیں کہ ”ہمارے پاس اس کے کافی ثبوت ہیں کہ ٹی وی دیکھنے کے خوگر بچے عادی افراد میں نمایاں جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ یہ دماغ کی لہروں کو (Brain Waves) بدل سکتا ہے، آنکھوں کی

(۱) کتاب: Growing Up On TV از Kate Moody

گردش کو مفلوج کرسکتا ہے۔ ہاتھوں کو لنج کرسکتا ہے، مرکزی اعصابی نظام کو برافروختہ (Irritate) کرسکتا ہے، احساسات پر حملہ آور ہوسکتا ہے، مائکروویو Micro Wave Radiation کا اثر ڈال سکتا ہے اور مرگی کے دورہ تک میں مبتلا کرسکتا ہے۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ یہ بچوں کو Stunning Complex Pieces Of Information دیتا ہے لیکن جو معلومات اس طرح پہنچائی جاتی ہے وہ غیر مربوط ہونے کی بنا پر Content اور معنی سے خالی ہوتی ہے۔ ٹی وی زیادہ دیکھنے سے بچوں میں تشنج (Convulsive Disorder) پیدا ہوجاتا ہے اور اسکرین سے نکلنے والی روشنی Photogenic Epilepsy بھی پیدا کرسکتی ہے۔

امریکی ماہر نفسیات جیمس ڈالسن اپنی کتاب "Hide or Seek" میں لکھتے ہیں کہ:

امریکی ٹی وی پر جو پروگرام دکھائے جاتے ہیں ان کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک امریکی طالب علم ۱۴ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مار دھاڑ، قتل و غارت گری سے بھرپور اوسطاً ۱۸ ہزار فلموں کا مشاہدہ ٹیلیویژن کے ذریعہ کرلیتا ہے۔ ایک دوسرے امریکی محقق کے بیان کے مطابق امریکی بچوں کی سب سے بڑی اور طویل سرگرمی نہ تو اسکول کی پڑھائی ہے اور نہ گھریلو سرگرمیاں، اوسطاً اسے عہد طفولیت کے ۱۴ ہزار گھنٹے (یعنی چار سال نو ماہ کی مدت) ٹی وی اسکرین کی نذر ہوجاتی ہے۔ ٹی وی کے پروگراموں میں یہ رُجحان بھی فروغ پارہا ہے کہ مختلف موضوعات پر (جن میں جنسی موضوع بھی شامل ہے) صاف صاف گفتگو کی جائے اور اس طرح نوجوان نسل کو حقائق زندگی سے روشناس کرانے کی آڑ میں آداب واخلاق اور تہذیب کی بنیادوں پر تیشہ چلایا جارہا ہے۔ ہمارے ٹی وی اسٹیشنوں نے بڑے خوبصورت انداز میں اسقاط حمل، ناجائز تعلقات اور آبروریزی کو کھل کر بچوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس قسم کے پروگراموں کو معاشرہ کی ضرورت کالبادہ اُڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ معاشرہ کے حق میں سم قاتل کے سوا کچھ نہیں''۔

ڈاکٹر مائیکل روتھنبرگ (M. Rothenberg) نے کہا کہ ٹی وی دیکھنے سے بچوں میں جارحانہ برتاؤ خاصی بڑی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ امریکا میں اوسط درجہ میں

۱۸ سال کی عمر کا بچہ پندرہ ہزار گھنٹے ٹی وی دیکھنے میں گذار چکتا ہے اور اس عرصہ میں کم از کم اٹھارہ ہزار قتل عمد کے واقعات نیز مار دھاڑ، ڈکیتی، بم سے اڑا دینے، جعل سازی اور اذیت رسانی کے بیشمار معاملات کی پوری عکاسی پردۂ سیمیں پر دیکھ لیتا ہے۔ شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے معاشرہ میں منظم آواز ٹی وی پر دکھائے جانے والے تشدد کے خلاف اٹھائی جائے اور میڈیکل پروفیشن کے افراد کو خاص طور پر اس میں شامل ہونا چاہئے۔(۱)

ٹیلیویژن کے پروگراموں کو غیر متوازن طریقے سے لمبے وقفہ تک دیکھنے سے انسان کی نفسیات (Psyche) متاثر ہوتی ہے۔ ایک برطانوی میڈیکل جرنل نے اس سلسلہ میں محققین کی ریسرچ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ٹی وی پر خودکشی وغیرہ کے جو منظر دکھائے جاتے ہیں وہ دیکھنے والوں پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ امریکی سائنس دانوں نے آگاہ کیا کہ ایسے پروگرام دیکھنے کے بعد متعدد ناظرین مختلف اسباب کی بنا پر نفسیاتی طور پر زیادہ اُلجھن محسوس کرتے ہیں۔ امریکا میں گذشتہ بیس سال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ٹی وی پر خودکشی کی رپورٹیں دکھانے کے بعد مسلسل ردّعمل ہوا ہے۔ خاص طور پر اسوقت جب خودکشی کرنے والا کوئی معروف شخص ہو۔ مختلف ملکوں میں کئے گئے تجربات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شام کو ٹی وی دیکھنے سے نیند کی کوالٹی میں بھی فرق پڑتا ہے۔ جو طلباء لمبے وقفہ تک ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں اُن کی پڑھنے کی رفتار اور میتھ میٹیکل (Mathmetical) پرابلم حل کرنے کی صلاحیت بھی گھٹ جاتی ہے۔ برنسٹن کی ایجوکیشنل ٹیسٹنگ سروس نے چھ ملکوں میں طلباء پر تجربات کئے تو وہی نتائج نکلے جو والدین اپنے بچوں کو برابر بتاتے رہتے ہیں کہ بہت زیادہ ٹی وی دیکھنے سے ان کی پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔...... جتنی زیادہ دیر تک بچے ٹی وی دیکھتے ہیں اتنا ہی ان کے رزلٹ خراب ہوتے ہیں۔ یہ بچوں کو سست (Dull) بھی بنادیتا ہے۔ امریکا میں اب سرکاری طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ بہت زیادہ ٹی وی دیکھنے سے طلباء کا ذہن کند پڑجاتا ہے اور پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔

امریکا کے دو ڈاکٹروں Dr. Fred اور Dr. Merrelyn Emery نے اپنے تجربات میں یہ پایا کہ ٹیلیویژن صرف خیالات میں مزاحمت (Impede) ہی نہیں ڈالتا بلکہ اس کا Inherently Retarding بنیادی طور پر سست کردینے والا اثر ہوتا ہے اور یہ

(۱) Annual Register : Arecord Of Woold Events 1975. p406

احساسات کو کند کر دیتا ہے (Sensory Deprivation)۔ ٹیلیویژن دماغ کو گھلا (Atrophied) دیتا ہے جس سے دماغ صرف سادہ طور پر براہِ راست حاصل شدہ معلومات، تجربات کو صرف منتقل (Convey) کر دیتا ہے اور ان کی تعبیر (Decipher) کرنے کا کام نہیں کرتا۔ اسی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ٹی وی زیادہ دیکھنے سے بچوں کا سیکھنے کا برتاؤ خاصی بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے۔

پونا کے دو محققین ڈاکٹر اے۔ جے واڈکر اور ڈاکٹر سچن جے شاہ نے اپنی کتاب The Television Intoxication میں ٹیلیویژن دیکھنے سے فرد کی صحت پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لمبی مدت تک ٹی وی دیکھنے سے بالغوں اور کم عمر بچوں دونوں کی صحت پر خراب اثرات پڑتے ہیں۔ تشدد اور فحاشی سے بھرپور ولگر (Vulgar) پروگرام دیکھنے سے بدہضمی، تیزابیت، اختلاج قلب، سانس کی تکلیف، ہائی بلڈ پریشر Dyspnoea, Ulcerative Colitis سر میں شدید درد اور آنکھوں میں تکان Strain پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مختلف دماغی امراض Schizophrenia اور Depressive Psychoneurosis ہو جاتے ہیں۔ کچھ عورتوں کو Hormonal Imbalance بھی ہو سکتا ہے اور حاملہ عورتوں کو ایکسرے کے مسلسل Exposure سے فیٹس (Foetus) کو مستقل طور پر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ان ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ٹی وی دیکھنا سانپ کے زہر کے مانند ہے جیسے وہ مناسب مقدار میں طبی طور پر مفید ہوتا ہے لیکن زیادہ مقدار میں وہ سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔

بہت زیادہ ٹیلیویژن دیکھنا آنکھوں کے لئے مضر ہوتا ہے۔ جاپان کی وزارت صحت نے ملک کے 1.25 ملین جاپانی بچوں کی بصارت کی جانچ کرائی تو یہ ثابت ہو گیا کہ لمبی مدت تک ٹی وی دیکھنے سے آنکھوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ حالانکہ اس سروے میں جاپان کے کل طلبا، میں سے صرف 6.4 فیصدی طلباء کور کئے گئے پھر بھی ماہرین نے نتائج پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ ساٹھ فیصدی طلباء نے ایک کے پرفکٹ اسکور (Perfect Score) سے کم اسکور کیا۔ ہائی اسکول کی سطح کے ایک تہائی طلباء نے 0.3 سے بھی کم اسکور کیا جو کہ انتہائی Poor مانا گیا۔ وزارت صحت کے ذمہ داران کا کہنا ہے کہ حالانکہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ بصارت کو ہونے والا یہ نقصان صرف ٹی وی دیکھنے سے ہوتا ہے، یہ نقصان

زیادہ پڑھائی کرنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بہتر ہوگا کہ بچے ٹی وی دیکھنے کے اوقات کو کم کر دیں۔ حکام کا کہنا ہے کہ پندرہ سال قبل ویڈیو گیمس کے شروع ہونے کے بعد سے بچوں کی بینائی گرنے لگی تھی، اس کے بعد ہوم کمپیوٹر گیمس کی دریافت کے بعد حالات سدھرنے لگے لیکن ۱۹۹۰ء سے بینائی میں گراوٹ کے مسئلہ نے سنگین صورت اختیار کر لی۔

تیل ابیب یونیورسٹی کے فیکلٹی آف میڈیسن کے ایک اسرائیلی محقق نے اپنی تحقیقات کی بنا پر یہ کہا ہے کہ زیادہ ٹی وی دیکھنے سے فرد کے آئندہ زندگی میں الزیمر Alzheimer کے مرض میں مبتلا ہونے کے امکانات زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ بصارت وسماعت کے لگاتار بے درد (Relentless) چکر کی وجہ سے فرد پر جو نفسیاتی تھکن و تناؤ پڑتا ہے اُس کی وجہ سے اس مرض کے لاحق ہو جانے کے امکانات کافی بڑھ جاتے ہیں۔

ویڈیو گیمس امریکا میں فلموں سے دوگنا کاروبار کر رہے ہیں اور ہمارے یہاں کے بڑے شہروں میں بھی یہ بہت مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ وقت اور پیسہ کی بربادی کے علاوہ یہ بینائی کے لئے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ کے۔ کپور (آف بامبے ہاسپٹل) کا کہنا ہے کہ مدھم روشنی والے اسکرین پر مستقل آنکھیں گڑوئے رکھنے سے یا تو Refractory Errors ہونے لگتی ہیں یا چشمہ کا نمبر بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سر میں درد، تناؤ اور تھکن (Tension & Strain) اور متعدد ہاضمہ کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر بچے چڑچڑے مزاج کے ہو جاتے ہیں، کہنا نہیں مانتے اور اُن کی پرسنالٹی میں متعدد خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو والدین، اساتذہ اور دوسرے ساتھیوں سے برتاؤ میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ بچے تنگ مزاج ہو جاتے ہیں اور اُن میں تشدد پر آمادگی نیز حکم عدولی کا رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر پرمود جوگ نے پونا میں ۹ سے ۱۲ سال کی عمر کے 300 بچوں کے والدین سے ایک سوالنامہ کے ذریعہ معلومات حاصل کیں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پرائمری اسکول کے بچے جو ٹی وی پر سیکس اور تشدد کے پروگرام دیکھتے ہیں اس کی وجہ سے اُن میں بلوغ سے پہلے ہی جنسی جارحانہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مطالعہ میں یہ پایا گیا کہ پرائمری اسکول کے بچے ہر ہفتہ اکیس گھنٹے ٹی وی دیکھنے میں لگاتے ہیں، اس طرح وہ ایک سال میں ایک

ہزار گھنٹے ٹی وی دیکھنے میں صرف کرتے ہیں جبکہ اتنا ہی وقت سال بھر میں اسکول کی تعلیم میں لگایا جاتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا میں کے وی سیتھورتی کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ ان کے کئی ڈاکٹر دوستوں نے انہیں بتایا کہ ویڈیو ٹیلیویژن سے آنکھوں کو پہنچنے والا نقصان اُس سے دس گنا زیادہ ہوتا ہے جتنا کہ سنیما دیکھنے سے اور اسکی وجہ انہوں نے یہ بتائی جو بڑی معقول لگتی ہے: ویڈیو ٹی وی میڈیم میں روشنی کیبل سے پکچر ٹیوب کے ذریعہ آنکھوں پر سیدھے اسی طرح پڑتی ہی جیسے کہ بیٹری کی Beam شعاع ہماری آنکھ پر اندھیرے میں سیدھے پڑتی ہے۔ اسکے برعکس سنیما اسکرین پر پروجیکٹر سے پھینکی ہوئی روشنی اسکرین جذب کرلیتی ہے اور دیکھنے والا اسکرین پر صرف Images دیکھتا ہے جیسا کہ شیڈ والے میں ہوتا ہے۔ جو بچے چھٹیوں میں ٹی وی پر دو دو تین تین فلمیں دیکھتے ہیں اُن کی آنکھوں پر ۹ گھنٹے لگاتار ایسی روشنی بینائی کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے اور میرے خیال سے ٹیلیویژن ویڈیو میڈیم سے آنکھوں کو ہونے والا نقصان بہت کم کرکے بتایا جارہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت، سوشل سائنٹسٹ اور ڈاکٹر صاحبان پبلک میں بالخصوص نئی نسل میں ٹی وی بینی کے مضر اثرات کے بارے میں کافی شعور پیدا کرنے کی جدوجہد کریں۔

> *"Our age has witnessed great Strides in Science and technology as also an enormous collapse of moral values."*
>
> *- Soli Sorabjee*

حصہ دوئم

فحش کاری

باب۔ ۵

جنسی اَنارکی

انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں جنس کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ متمدن زندگی کی طرف انسان کا پہلا قدم ہی اس وقت اُٹھا جب خاندان کی تاسیس عمل میں آئی اور خاندانوں کے اِسی منضبط مجموعہ کا نام معاشرہ ہے۔ جس طرح خاندانوں کا نظم وضبط فریقین کے رشتۂ ازدواج، باہمی اُلفت ویگانگت، ایثار وقربانی نیز احساس ذمہ داری پر قائم ہے، اُسی طرح خاندانوں کے باہمی اشتراک وتعاون، بھائی چارگی اور خیالات میں ہم آہنگی سے معاشرہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ جو نصب العین، بصیرت اور قدریں (Values) معاشرہ کے بیشتر افراد اپناتے ہیں وہی معاشرہ کی اجتماعی قدریں بن جاتی ہیں۔

جنسی قوت ایک خداداد قوت ہے جو ہر ذی رُوح میں پائی جاتی ہے اور اُس کا بنیادی مقصد افزائش نسل اور انسانی نسل کا بقا ہے۔ تمدن انسانی کی تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا کے ہر مذہب اور ہر معاشرہ کے دانشوروں نے اس کے صحیح استعمال کے لئے کچھ اصول اور ضابطے مقرر کئے ہیں تاکہ فرد کی صحت اور معاشرہ کا نظم برقرار رہے۔ اگر ان خواہشات کی

تکمیل اعتدال کے ساتھ مناسب حدود میں کی جاتی ہے تو فرد کی آسودگی کے ساتھ اُس کی اندرونی صلاحیتیں بھی اُجاگر ہوتی ہیں اور افزائشِ نسل کا سلسلہ بھی برقرار رہتا ہے۔ خاندان کے استحکام سے بچوں کی مناسب پرورش ونگہداشت ہوتی ہے اور اُن کی معقول تربیت بھی انجام دی جاتی ہے جس سے معاشرہ مضبوط بنیادوں پر قائم رہتا ہے اور نظم وضبط بھی برقرار رہتا ہے۔ لیکن اگر یہ خواہشات اپنی حد سے تجاوز کرنے لگتی ہیں اور ہمہ وقت فرد کے دل ودماغ پر چھائی رہتی ہیں تو وہ اس کے اثر سے بے چین ہونے لگتا ہے جس سے اُس کی کارکردگی بھی متاثر ہوتی ہے اور وہ کوئی تخلیقی کام انجام دینے سے قاصر رہتا ہے۔ معاشرہ کا نظم درہم برہم ہوجاتا ہے اور ہر طرف افراتفری (Anarchy) پھیل جاتی ہے۔

جنسی قوت (Sexual Impulse) ویسے ہی اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ اُسے بروئے کار لانے کے لئے کسی مصنوعی محرک Artificial Stimulant کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن جدید معاشرہ نے اس بنیادی خواہش کو برانگیختہ کرنے کے اتنے محرکات جمع کردیئے ہیں کہ وہ پورے معاشرہ کا روگ بن گئی ہے۔ اقتصادی خوشحالی، فارغ البالی، لیزر ٹائم، کمیونی کیشن میں حیرت انگیز ترقی، سٹیلائٹ ٹی وی، ان سب نے مل کر آج کے نوجوانوں کے جنسی ادراک (Perception) کو بالکل بدل کر (Distort) رکھ دیا ہے۔ اب نوجوان سیکس کے معاملہ میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ضبطِ نفس اور معقول حدود میں رہ کر خواہشات کی تکمیل۔ یہ سارے تصورات اب فرسودہ قرار پاچکے ہیں۔ آج کے دور میں جنس کا معاشرہ پر اتنا شدید غلبہ ہوچکا ہے کہ راونٹری اور لیور کے الفاظ میں یہ دور ''جنسی گولہ باری'' (Sexplosion) کا ہے اور پروفیسر سوروکن کا کہنا ہے کہ ''ہمارے تمدن میں جنس ایسی رس بس گئی ہے کہ امریکی زندگی کے ہر بن وموسے ٹپکنے لگی ہے''۔

"We Are Completely Surrounded By The Riding Tide Of Sex, Which Is Flooding Every Compartment Of Our Culture, Every Section Of Our Social Life."

فطرت کے قوانین کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے اسے خالص بہیمانہ جذبہ کی صورت میں دیکھا جارہا ہے۔ جس میں باہمی اُلفت، موانست اور یگانگت کا کوئی نام نہیں۔ سیکس کی اس لہر میں بہہ جانے والوں کا نقطۂ نظر صرف یہ ہے کہ یہ محض وقتی خوش فعلی کا جذبہ

ہے جس میں فریقِ ثانی کی محبت، اس سے لگاؤ اور اشتراک وتعاون حاصل کرنیکی چنداں ضرورت نہیں۔ اس نقطۂ نظر کی خوب تشہیر کی جارہی ہے کہ محبت وخلوص کے بغیر جنسی تعلق میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ یہ اخلاقاً مذموم ہے۔ اب تو ادیبوں اور مصنفوں نے لکھنا شروع کردیا ہے کہ جب جمہوریت میں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے تو جنسی اختلاط میں رکاوٹ کیوں ہو؟ جب سیاسی آزادی ہے تو جنسی معاملات میں بھی پوری آزادی اور خودمختاری کیوں نہ ہو؟ جدید ماہرین نفسیات اس نظریہ کی پُرزور تشہیر کررہے ہیں کہ خواہشات پر کنٹرول کرنے (Inhibition) سے دماغی اُلجھن بڑھتی ہے، اس لئے جنسی خواہشات کو مکمل آزادی دینا چاہئے! اقوام متحدہ سے یہ مانگ کی گئی کہ حقوق انسانی کے اعلان میں ایک ضمنی تجویز جنسی آزادی کی بھی شامل کی جائے جس کی رو سے دُنیا کے تمام انسانوں کو جنسی معاملات میں مکمل آزادی اور خودمختاری کے اختیارات دیئے جائیں۔ مظاہرہ کرنے والے جو پلاکارڈ لئے تھے اُن پر لکھا تھا:

جنس ایک بنیادی انسانی حق ہے

''امن جنسی آزادی کی راہ سے''

امریکا، فرانس اور اٹلی میں طلباء نے جو زبردست ہنگامے ۱۹۶۸ء میں برپا کئے تھے اس میں دوسری مانگوں کے ساتھ ایک مانگ یہ بھی تھی کہ انہیں لڑکیوں کی ڈارمیٹری میں ہمہ وقت جانے کی اجازت ہونی چاہئے اور اٹلی کے طلباء نے اپنے ہاسٹل کی خوابگاہ میں طالبات کی رفاقت کی بھی تجویز پیش کی۔ یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس پر مشہور امریکی ایکٹرس Raquel Welch کا قد آدم کٹ آؤٹ آویزاں کیا گیا جس کے نیچے جلی عبارت میں یہ لکھا تھا: No No To Sexual Repression اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پانیر نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ ''فرائیڈ جنگ اور ایڈلر شکریہ کے مستحق ہیں اور ڈی۔ ایچ لارنس اور اُن کی کتاب لیڈی چیٹر لیز لور بھی کہ ان کی بدولت جدید نسل کو یہ یقین ہوچکا ہے کہ جنسی خواہشات کو دبانا بُرا ہے اور کلاس فیلوز سے ہی جنسی تعلقات قائم کرکے بارہ کے اخلاقی اصول تعلیم گاہوں میں برتے جانے لگیں۔''

اسی طرح بیجنگ یونیورسٹی میں ۱۹۸۸ء میں ایک پوسٹر آویزاں کیا گیا جس پر لکھا گیا: Allow Free Love and The Sexual Repression Of One Billion People

ڈاکٹر ارنسٹ کلیکٹن (Ernest Claxton) لکھتے ہیں کہ آج کے نوجوانوں کو بہت زیادہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ اپنی چوائس اور برتاؤ میں یقیناً اُس سے متاثر ہوتے ہیں جو وہ اپنے گردوپیش دیکھتے ہیں۔ اُن کی دماغی صلاحیتیں اور قوت فیصلہ کا شعور ابھی پختگی کو نہیں پہنچ پاتا کہ اُن کے جسم بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں۔ میڈیا کے ذریعہ اشتہارات کی زبردست پبلیسٹی فلموں اور ٹی وی پر عریاں و پرتشدد مناظر اور بالغ افراد کی بے اصولی باتیں نیز ان کا کردار یہ سب مل کر ایک ایسا ماحول بنادیتی ہیں جہاں اخلاقی قدریں بالکل ڈھندلی پڑ جاتی ہیں اور جنسی اختلاط فی الواقع ہو کر رہتا ہے۔'' ایڈنبرا ریویو نے تقریباً ساٹھ سال قبل لکھا تھا کہ ''عنقریب جنسی اختلاط کی حیثیت ٹینس کے کھیل کی طرح ہوجائے گی، وہ تو استقرار حمل کا اندیشہ ہے جو معاملہ کو قدرے پیچیدہ بنادیتا ہے۔ اس قول کی سچائی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، ہر قید و بند سے آزاد جنسی آزادی نے دوشیزگی اور عفت مآبی کا قلع قمع کردیا ہے۔ بیویاں بدلنے، گروپ سیکس، بغیر شادی ایک ساتھ رہنے کا رواج اب داخل فیشن ہوچکا ہے۔ نوجوانوں میں شادی سے قبل جنسی اختلاط کو نہ صرف پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جارہا ہے بلکہ اس کی ہمت افزائی کی جارہی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ناجائز حمل، اسقاط اور جنسی امراض میں معتد بہ اضافہ ہورہا ہے اور ایچ آئی وی انفکشن اور ایڈس جیسا مہلک مرض وبائی شکل میں ساری دُنیا میں پھیلتا جارہا ہے۔

نیویارک میں شارع عام پر آٹھ جوڑوں کو جنسی اختلاط میں مصروف پائے جانے پر اُن کی گرفتاری عمل میں آئی (۱) اور لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر ایک جوڑے کو آٹو میٹک واک وے پر مباشرت میں مصروف پایا گیا، حیرت زدہ مسافروں کے ہاتھ سے سوٹ کیس چھوٹ گئے اور ماؤں نے اپنے بچوں کے منھ دوسری جانب پھیر دیئے۔ جب ایئرپورٹ بیڈروم میں تبدیل ہوگیا۔ (۲) سویڈن کی پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا گیا جس میں ہر مقام پر جنسی فعل کی اجازت دینے کی تجویز پیش کی گئی جسکا مطلب یہ ہوگا کہ جوڑے ساحل سمندر پر پارکوں میں حتیٰ کہ شارع عام پر بھی مباشرت کرسکیں گے، صرف شرط یہ ہوگی کہ یہ نظارہ دیکھنے والوں کو ناگوار نہ ہو۔ The Spectacle Should Not Offend Onlookers. (۳)

(۱) پائنیر ۲۵/اکتوبر ۱۹۷۱ء (۳) پائنیر ۱۴/مئی ۱۹۷۰ء
(۲) پائنیر ۱۳/اکتوبر ۱۹۸۱ء

جنسی بے راہ روی تمام مغربی ملکوں میں ناقابل یقین حد تک بڑھ چکی ہے۔

برطانیہ میں متواتر وضع کئے جانے والے قوانین نے طلاق کو آسان بنادیا ہے۔ اسقاط کی عام اجازت ہے۔ ہوموسکشولیٹی کو قانوناً جواز حاصل ہے اور اسٹیج سے ہر قسم کی سنسرشپ کو ختم کردیا گیا ہے۔ وہاں ہر 16 ولادتوں میں ایک ناجائز ہوتی اور ہر 15 شادیوں میں ایک طلاق پر ختم ہوجاتی ہے۔ معاشرہ کے ہر طبقہ میں رشتۂ ازدواج سے قبل جنسی اختلاط اب معمول ہوگیا ہے نہ کہ کوئی استثنائی بات۔ ایک انڈر گریجویٹ لڑکی نے "ISIS" میں لکھا کہ اب آکسفورڈ میں پاکیزہ پن کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے۔ جرمنی سے متعلق ایک رپورٹ میں لکھا گیا کہ کنواریوں کی نسل اب ختم ہوتی جارہی ہے اور منع حمل گولیوں نے استقرار حمل کے اندیشہ کو ضائع کردیا ہے۔ انگریز سیاسی مبصر ہنری فیرلائی (Henry Fairlie) کا کہنا ہے کہ برطانیہ اپنے پبلک برتاؤ کے اعتبار سے اس وقت مغرب کا سب سے غیر اخلاقی ملک ہے۔ Most Immoral Country In The West پلائی ماؤتھ کو حال میں ایک ہاٹ لائن سے جوڑا گیا ہے کہ رائل نیول کالج ڈارٹ ماؤتھ سے تنہا سیلر اپنی تفریح کے لئے لڑکیوں سے رابطہ قائم کرسکیں۔ انگریز مصنف جیمس مارس (James Moris) لکھتے ہیں کہ دُنیا کی راجدھانیوں میں لندن سے زیادہ فحش وعریاں کوئی شہر نہیں ہے جہاں خوبصورت پارکوں میں جوڑے جنسی اتصال میں مصروف رہتے ہیں اور سوہو کے علاقہ میں اسٹرپ شوز کے مظاہرے بیباکی سے ہوتے رہتے ہیں Hornsey College آف آرٹس میں پورنوگرافی کے خفیہ کلاس منعقد ہوتے ہیں جہاں Erotic Arts کی تعلیم دی جاتی ہے اور لڑکے ولڑکیاں پورنوگرافک میگزین میں شائع ہونے والے مضامین پر بحث ومباحثہ کرتے ہیں اور ٹرم کے اختتام پر "Danish Blue" جیسی فلمیں اور Oh Calcutta جیسے ڈرامہ دیکھتے ہیں۔

وانس بیکارڈ لکھتے ہیں کہ امریکا میں ایسے مردوں کے بارے میں تو کم سنا جاتا ہے جو اپنی بیویوں کو دوسروں کے یہاں بھیج دیتے ہوں لیکن ایسے شوہر اور بیویاں بڑی تعداد میں ہیں جو آپس میں گروپ بنا کر بیویاں تبدیل کرنے پر رضامند ہوجاتے ہیں۔ کچھ دوسرے ملکوں میں Mate Swapping کی اس رسم کو ایک کھیل کی شکل دے دی گئی

ہے۔ سوئزرلینڈ کی کچھ خواتین نے خود ان سے بتایا کہ وہاں ایسی Key Parties ہوتی ہیں جن میں متمول گھرانوں کے جوڑے نئے نئے تجربات کا لطف حاصل کرنے کے لئے اپنے فلیٹ کی چابیوں کے گچھے پھینکتے ہیں جو خاتون جس گچھے کو اٹھا لیتی ہے وہ شب باشی کے لئے اُسی کے فلیٹ میں چلی جاتی ہے۔ کیلیفورنیا کے سو سے زیادہ ایسے جوڑوں نے ایک رپورٹر سے اس کا اعتراف کیا اور ایک اخباری اشتہار کے جواب میں تین سو سے زائد ایسے خطوط موصول ہوئے جس سے اس شرمناک رسم کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!(۱)

لائٹ اور مارٹیمر اپنی کتاب "USA Confidential" میں لکھتے ہیں کہ لاس انجلز سیکس سے بھرپور (Ovesexed) ہو رہا ہے، ہزاروں کی تعداد میں حسین و دلربا لڑکیاں سینٹ لوئس کی پشت پر ویٹرس، سیلز گرلس یا کارہاپس کے جابس کی تلاش میں منتظر کھڑی رہتی ہیں، یہاں لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں، بہت سی ۱۵ سال کی لڑکیاں ۲۰ سال کی دکھائی پڑتی ہیں اور ۳۰ سال والیوں کے کارنامے انجام دیتی ہیں۔ لڑکیوں کی یہ اُور سپلائی پوری ریاست میں ہول سیل پیمانے پر جاری ہے۔ برہنہ ماڈل سے لے کر اشتہاروں، آرٹ کلاسوں اور عریاں فوٹو گرافی تک کے فرائض یہ انجام دیتی ہیں۔

فرانس نے نہایت لطیف انداز میں نفاست کے ساتھ جنسی کاروبار کو فروغ دیا ہے۔ Youth Must Sow His Wild Oats یہاں کا پسندیدہ Motto ہے اور نوجوانوں کے تمام ایسے اقدام کو ہر اخلاقی بندش سے آزاد سمجھا جاتا ہے۔

جنس کے بارے میں رُجحانات میں انقلابی تبدیلیاں

ویسے تو بدکاری کا وجود تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہا ہے لیکن مذہب چونکہ کردار کی اصلاح کا ضامن ہے، اس لئے اُس نے ضبطِ نفس کو اپنا کر عفت و پاکدامنی کی زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے۔ قدیم زمانہ میں زانی و زانیہ کو سنگسار کر دیا جاتا تھا۔ مصر میں زانی کے عضوِ تناسل کو قطع کرا دیا جاتا تھا کہ آئندہ وہ اس جرم کا ارتکاب کرنے کے اہل ہی نہ رہیں اور زانیہ کی ناک کاٹ دی جاتی تھی۔ انگلستان میں سا کزن قوم میں زانی اور زانیہ کو زندہ جلا دیتی تھیں۔ ۱۰۳۱ء میں شاہ کیانوٹ نے ایسے

(۱) "Sexual Wilderness" ص ۲۶۳

مجرموں کے کان اور ناک کاٹنے کا حکم دیا تھا۔ کرامول نے ۱۶۵۰ء میں زنا کی سزا موت مقرر کی تھی۔ قدیم یونان میں بھی زنا کو ایک مذموم فعل قرار دیا گیا تھا اور مجرمین کو سرِ بازار شرمناک سزائیں دی جاتی تھیں۔ اہل اسپارٹا مجرمین کی آنکھیں نکلوا دیتے تھے۔ غرض مشرقی و مغربی دونوں معاشروں میں زنا کو انتہائی مذموم فعل قرار دیا جاتا تھا اور اُس کے خلاف سخت قوانین نافذ تھے۔ لیکن قرونِ وسطیٰ کے بعد سے مغربی معاشرہ کے تصورات میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ عیسائیت کی غلط تعلیمات اور اہل کلیسا کی بدچلنی کو دیکھ کر مذہب کے خلاف لوگوں میں عام طور پر جذبۂ منافرت پیدا ہو گیا اور عیسائی اقوام نے کلیسا کی عائد کردہ ہر قسم کے قید و بند سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد جو زبردست تبدیلیاں ہوئیں انہوں نے لوگوں کی سوچ اور کردار کو اور بھی زیادہ آزاد بنا دیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک ایسا اخلاقی زلزلہ آیا جس نے تمام پُرانی قدروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور جنسی بے راہ روی کے دروازے کھول دیئے۔ حالانکہ رُومن کیتھولک چرچ اب بھی رشتۂ ازدواج کے قبل اور اُس کے باہر جنسی اختلاط کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور موجودہ سوسائٹی کی اس آزاد روش کی مخالفت کرتا ہے لیکن چرچ سے وابستگی کے باوجود بہت بڑی اکثریت اِن احکام سے روگردانی کر رہے ہیں اور سراسر ان کی خلاف ورزی کر رہے ہیں بلکہ خود چرچ کے بعض عمائدین ان جنسی بندشوں میں ڈھیل دیئے جانے کی موافقت کر رہے ہیں۔

پوپ پال ششم نے ۱۹۷۶ء میں جنسی اخلاقیات پر ۲۰ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز جاری کی جو ''ویٹکن سکسی کوڈ'' کے نام سے مشہور ہے، اس میں جنسی اختلاط، ہوموسکشولیٹی اور ماسٹربیشن پر چرچ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا کہ ''رشتۂ ازدواج سے قبل یا باہر ہر قسم کا جسمانی اتصال چرچ کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے اور ایسا تعلق صرف شادی کے مقدس رشتہ کے اندر ہی جائز کہا جا سکتا ہے۔ ہوموسکشولیٹی کو انتہائی معیوب اور غیر اخلاقی عمل بتایا گیا اور کہا گیا کہ یہ عمل یقیناً گمراہی پر مبنی ہے اور اس سے اجتناب برتا جانا چاہئے کیونکہ یہ خدائی نظام کے خلاف بغاوت ہے اور چرچ اس کی کبھی موافقت نہیں کر سکتا۔''

ایسے ہی خیالات کا اظہار ماسٹربیشن کے بارے میں بھی کیا گیا اور ان دونوں

افعال کو Intrinsically & Seriously Disordered Acts بتایا گیا۔

موجودہ مغربی معاشرہ گمراہی کی کس حد تک پہنچ چکا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یورپین پارلیمنٹ نے (فروری ۱۹۹۴ء میں) ایک تجویز یہ پاس کردی کہ ہم جنسوں کے درمیان ہونے والی شادیوں کو بھی قانوناً جائز قرار دے دیا جائے! ''آزاد محبت'' قبل از ازدواج جنسی اختلاط، کنٹراسپشن اور ابارشن کے اِن نظریات کی پُر زور مخالفت کرتے ہوئے پوپ جان پال دوئم نے دُنیا کے تمام کیتھولکس سے اپیل کی کہ وہ اِس جنسی گمراہی کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں جو صرف وقتی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی وکالت کرتے ہیں اور اس کے دوررس نتائج جو معاشرہ پر مرتب ہوتے ہیں ان کی طرف سے یکسر غافل ہیں۔ معاشرہ کے عام مفاد فرد کی صحت اور اس کی رُوحانی بالیدگی کے پیش نظر ان نظریات کی پُر زور مخالفت کرنے کی ضرورت ہے۔ آزادانہ جنسی تعلقات، منع حمل اور اسقاط اخلاقاً نہایت معیوب ہیں اور چرچ جن اعلیٰ قدروں کا علمبردار ہے اُس کی مخالفت کرتی ہیں اور ساری دُنیا میں بے حیائی کی جو لہر پھیل گئی ہے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جانا چاہئے کیونکہ یہ اخلاقی انحطاط کی طرف لے جانے والی ہے۔

اس کے بالکل برعکس اینگلیکن چرچ نے اپنی لبریشن تھیالوجی میں یہ نقطۂ نظر پیش کیا (۱۹۹۵ء) کہ چرچ کو اب بدکاری کو گناہ نہ سمجھنا چاہئے اسکاٹ لینڈ کے اینگلیکن چرچ کے صدر بشپ رچرڈ ہالوے (Richard Holloway) نے ''ڈیلی ٹیلیگراف'' کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''قدرت نے انسانوں کی ساخت ایسی رکھی ہے کہ وہ صرف ایک فریق کے وفادار نہیں رہ سکتے۔ چرچ کو یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ بدکاری انسان کی سرشت میں داخل ہے اور Genetics کی وجہ سے وہ کئی عورتوں سے جنسی تعلق رکھتا ہے اور اس Loving Relationship پیار کے رشتہ کو سمجھنا چاہئے۔ بشپ موصوف نے کہا کہ بیشتر جنسی معاملات میں چرچ کا نقطۂ نظر موجودہ معاشرہ کے افراد کے فطری تقاضوں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ نسلِ انسانی کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم خوب پھیل کر تخم ریزی کریں۔ خدا اِس حقیقت سے واقف تھا اس لئے اُس نے ہمارے اندر جنسی خواہش (Built In Sex Drive) بنائی تا کہ ہم روئے زمین پر خوب پھیل کر انسانی نسل کو بڑھائیں۔

چرچ آف انگلینڈ کے ایک ترجمان نے کہا کہ بشپ موصوف چرچ کی اس تعلیم

کی مخالفت نہیں کر رہے ہیں کہ بدکاری ناقابل قبول ہے بلکہ وہ تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اس پر نئے سرے سے غور وخوض کیا جانا چاہئے۔ بشپ موصوف کا مقصد لوگوں کو موجودہ جنسی انقلاب کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنا ہے نہ کہ پرامسکیوٹی Promiscuity کی حمایت کرنا!!

سابق آرچ بشپ آف کینٹربری لارڈ فشر نے قدیم طرز کی سگائی کو پھر سے جاری کرنے کی تجویز پیش کی جس میں غیر شادی شدہ جوڑے چرچ کی بلیسنگس (Blessings) کے ساتھ ایک ساتھ سوتے ہیں۔ اپنے ایک مجموعۂ مضامین "Touching on Christian Truth" میں انہوں نے لکھا کہ ایسا جوڑا جس کی سگائی ہو چکی ہو اور وہ شادی کرنے جا رہے ہوں اُن کے درمیان ہونے والے جنسی اختلاط کو اخلاقی نقطۂ نظر سے زنا (Fornication) نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''میں جنسی بے راہ روی کو بڑھاوا نہیں دے رہا ہوں میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ نوجوانوں کو بھی معاشرہ میں اپنا ذمہ دارانہ رُول ادا کرنے کا موقع دیا جانا چاہئے اور انہیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔'' چرچ آف انگلینڈ نے بھی شادی سے قبل جنسی تعلق کو موجودہ دور کی ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ Canon Hugh Melinsky نے شادی سے قبل مباشرت اور بغیر شادی ایک ساتھ رہنے کی رسم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں بیڈروم کے بارے میں فرسودہ تصورات کو بدلنا چاہئے جن میں تحکمانہ انداز جھلکتا ہے۔ آج کے بیشتر نوجوان لڑکے و لڑکیاں جن تجربات سے گزر رہے ہیں اُن میں کچھ کے لئے تو یہ نیا تجربہ ہوتا ہے اور بعض شادی شدہ جوڑے ایسے ہیں جن میں یا تو ایک فریق یا دونوں فریقوں میں ایک پہلے ہی مباشرت سے لطف اندوز ہو چکے ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے تعلق کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، رشتۂ ازدواج کو زیادہ گہری اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔

لبرل رُجحانات

دُنیا کے تمام مذاہب، مصلحین اور دانشوروں نے عفت مآبی اور پاکدامنی کی زندگی گزارنے پر زور دیا ہے اور شادی سے قبل کنوارے پن (Premarital Chastity) نیز

رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجانے کے بعد فریقین کی باہمی وفاداری (Fidelity) کو نہ صرف مستحسن قرار دیا ہے بلکہ اس پر پوری طرح گامزن رہنے کی تلقین کی ہے اور اس سے انحراف کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی اور گناہ قرار دیا ہے۔ معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی اس میں خاندان کے استحکام، رشتۂ ازدواج کی پائیداری اور بچوں کی مناسب نگہداشت وتربیت جیسے بے شمار فوائد اور حکمتیں مضمر ہیں۔

انیسویں صدی کے وکٹورین عہد تک عفت مآبی وپاکدامنی کے یہ تصورات دُنیا کے تمام ملکوں میں (قبائل کو چھوڑ کر) رائج رہے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے ختم ہونے پر اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کے نتیجہ میں یہ بندشیں ڈھیلی ہونا شروع ہوئیں۔ جنگ کے اختتام کے بعد لاکھوں کی تعداد میں امریکی مردوں کا خلط ملط دُنیا کے دوسرے ممالک کے باشندوں سے (جس میں عورتیں بھی شامل تھیں) بڑھنے لگا، جس کے نتیجہ میں اُن کے جنسی تصورات متزلزل ہونے لگے اور برتاؤ میں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ فرانس کے Gay Paree مقام پر پہلی اور دوسری جنگ کے بعد بڑی تعداد میں امریکی اور برطانوی مردوں کا ربط ضبط فرانسیسی لڑکیوں سے بڑھا۔ آج بھی بیشتر امریکی وبرطانوی مرد فرانسیسی لڑکیوں کو زیادہ آزاد خیال، گرمجوش اور بیباک محبت کرنے والی مانتے ہیں۔ بہر حال اس خلط ملط نے وکٹورین عہد کی بندشوں کو کافی ڈھیل دے دی اور فری لو (Free Love) کا تصور کھل کر پیش کیا جانے لگا۔

۱۹۲۰ء کے بعد جنسی رُجحانات میں جو زبردست تبدیلیاں ہوئیں اُن میں کچھ ماہرین نفسیات وسماجیات کی تصنیفات نے بھی اہم رُول ادا کیا۔ اس صدی کے شروع میں سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶-۱۹۳۹) نے اپنی تحقیقات کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ دُنیا میں بڑھتے ہوئے اعصابی امراض (Neurosis) کا اہم سبب دبی ہوئی جنسی خواہشات (Repressed Sexuality) ہوتی ہیں، اُن کے شاگردوں نے اس نقطۂ نظر کی ترویج کی کہ جذباتی طور پر صحتمند رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی جنسی خواہشات کو دبا کر نہ رکھیں بلکہ بلا جھجک اُن کی تسکین کرتے رہیں (Express Our Instincts Freely) (حالانکہ بعد میں فرائڈ نے خود اپنے بعض نظریات سے رُجوع کرلیا تھا لیکن اس بات کو اُن کے شاگردوں نے نظر انداز کر دیا)

دوسری اہم شخصیت جس نے لوگوں کے خیالات میں انقلابی تبدیلی پیدا کی وہ الفرڈ کنسے (Kinsey) تھے جنھوں نے انڈیانا یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف سیکس ریسرچ قائم کیا اور اُس کی طرف سے دو ضخیم رپورٹیں Sexual Behaviour In Human Male/Female شائع ہوئیں۔ کنسے چونکہ ٹریننگ کے اعتبار سے ماہر حیاتیات تھے اس لئے انہوں نے اُن ہی چیزوں کی پیمائش کی جنہیں وہ ناپ سکتے تھے اور ہزاروں مردوں وعورتوں سے سوالنامہ بھروا کر اور انٹرویو کرکے انہوں نے مردوزن کے جنسی تعلقات پر اپنی تحقیقات مرکوز رکھیں۔ وہ ایسے لوگوں کو ناپسند کرتے تھے جو جنسی افعال کو اخلاقی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہوں، اس لئے انہوں نے فطری جنسی برتاؤ کا بہ غائر مطالعہ کیا جیسا کہ وہ ہوتا ہے نہ کہ جیسا اُسے ہونا چاہئے اس لئے وہ جنسی برتاؤ میں آزاد روش کی حمایت کرنے والے مانے جانے لگے۔

تیسرے محقق جنہوں نے لوگوں کے جنسی برتاؤ میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں وہ ولیم۔ ایچ۔ ماسٹرس تھے جنہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سینٹ لوئس کی لیبوریٹری میں ہزاروں مردوں اور عورتوں کے رنگین فوٹو مباشرت کے وقت کے لئے اور اُن جسمانی کیفیات وتغیرات کا مفصل جائزہ لیا اور اُن سے بہت سے کارآمد نتائج اخذ کئے۔

چونکہ یہ تینوں محققین میڈیسن یا بیالوجی کے ماہرین تھے، اس لئے انہوں نے جنسی تعلق کے صرف شہوانی (Erotic) پہلو پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی اور مذہب واخلاقیات کے پہلوؤں اور اخلاقی قدروں کو بالکل نظر انداز کر دیا جو جنسی برتاؤ کو بھی ایک انسانی تجربہ مانتے ہیں اور شرم وحیا، عفت وپاکدامنی، ضبط نفس، خلوت اور اعتدال پسندی کے تصورات کو بھی انسانی برتاؤ سے وابستہ کرتے ہیں۔ جنسی فعل کو محض ایک حیاتیاتی عمل ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تعلقات اور اخلاقی قدروں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور اس نقطۂ نظر کی پُرزور تائید وتشہیر کی جانے لگی کہ جنسی برتاؤ کو اخلاقی زاویۂ نظر سے دیکھا (Evaluate) ہی نہیں کیا جانا چاہئے۔ فرنچ جیورسٹ رینے گوئن (Guyon) نے عصمت مآبی، باکرہ پن اور یک زوجگی کی پُرزور مخالفت کی اور جنس سے متعلق جملہ امتناعی احکام (Taboos) کو فرسودہ قرار دیتے ہوئے جنسی افعال کو ہر قسم کی اخلاقی بندشوں سے آزاد کرانے کی پُرزور وکالت کی۔ امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر البرٹ ایلس کا کہنا ہے کہ قبل از ازدواج جنسی اختلاط کی مکمل

آزدی ہونا چاہئے اور بعض مواقع پر جب فریقین واقفیت رکھتے ہوں اور آپس میں ایڈجسٹ ہوں تو اس کی ہمت افزائی کی جانا چاہئے کیونکہ یہ نہ تو غیر اخلاقی ہوتے ہیں اور نہ مضرت رساں۔ انہوں نے شادی شدہ جوڑوں میں زنا Adultery کی بھی حمایت کی اور کہا کہ ایسے تعلقات نہ صرف ازدواجی رشتوں کو قائم رکھتے ہیں بلکہ انہیں اور مستحکم بناتے ہیں۔

انگلستان کے ماہر نفسیات اے۔ ایس نیل (A.S. Neill) نے بچوں میں شروع سے ہی آزادانہ جنسی کھیل کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ بچوں پر جب شروع سے ہی اخلاقی بندشیں ٹھونسی نہیں جاتیں تو وہ زیادہ صحتمند طریقے سے عنفوان شباب کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سمرحل اسکول کے بچے میری گفتگو اور کتابوں سے یہ اچھی طرح جان لیتے ہیں کہ میں پوری طرح آزاد جنسی زندگی گزارنے کا حمایتی ہوں خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو۔ ڈاکٹر الکس کمفرٹ بچوں کو ابتدا میں ماسٹربیشن اور بعد میں جنسی اتصال کا تجربہ کرنے کی سفارش کرتے ہیں تاکہ وہ کامیاب جنسی زندگی گزار سکیں۔ وہ پاکدامنی کی کوئی وقعت نہیں سمجھتے۔ برطانوی ماہر نفسیات یوسٹس چسر (Eustace Chesser) کہتے ہیں کہ اگر شادی سے قبل جنسی اختلاط فریقین کی باہمی رضامندی سے کسی دھوکے یا فریب کے بغیر ہوتا ہے تو اسے صحیح سمجھنا چاہئے، جب فریقین کو اپنے فعل پر کسی قسم کا پچھتاوا نہیں ہوتا اور کسی تیسرے فریق کو کوئی نقصان نہیں ہوتا تو اس میں کیا حرج ہے اور بداخلاقی کی کیا بات ہے! ڈاکٹر پیٹر ہینڈرسن کا کہنا ہے کہ اگر سگائی ہوجانے کے بعد اقتصادی مجبوری سے فریقین شادی نہیں کر پارہے ہیں تو انہیں مباشرت سے روکا نہیں جانا چاہئے۔

پروفیسر کارسٹیرس (Carstairs) کا کہنا ہے کہ جنسی اختلاط کا تجربہ شادی کے لئے مناسب تیاری ہے اور شادی اتنے ہی دنوں تک بنی رہنا چاہئے جب تک کہ بچے بڑے نہ ہوجائیں۔

جنس کے متعلق طلباء وطالبات کے خیالات خوفناک حد تک بے باک ہوگئے ہیں، کارنل یونیورسٹی کے صدر نے کہا کہ دراصل سیکس کے معاملات میں طلباء کسی قسم کی بھی پابندی یا بندش نہیں چاہتے۔ سماجی مبصر جان کیٹس کئی درجن یونیورسٹیوں کے کیمپس کا دورہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ تقریباً سب ہی طلباء اور بیشتر فیکلٹی ممبران اس پر متفق ہیں کہ جنسی اختلاط کو اخلاقی زاویۂ نظر سے جانچا ہی نہیں جانا چاہئے:

Sexual Intercourse Is Not Subject To Moral Judgement لاس انجلز یونیورسٹی میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا گیا جس میں لکھا گیا کہ "ہر فعل اخلاقی اعتبار سے درست ہے جس سے کوئی مجروح نہ ہو"۔

Where There Is No Victim, Every Act Is Morally Right

البرٹ ایلس نے کہا کہ "محبت کے بغیر جنسی اختلاط کوئی جرم نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کے لئے انتہائی لطف اندوز تجربہ ہوتا ہے اور یہ لاکھوں افراد کی زندگیوں میں خوشیاں بکھیرتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی تائید میں طلاق وازدواج کے شاہی کمیشن (برطانیہ) کے سامنے فیبن (Fabian) سوسائٹی نے یہ تجویز رکھی کہ وہ شوہر وزوجہ کو اس بات کا حق دے کہ اگر اُن میں سے کوئی ایک دفعہ کسی باہری فریق سے زنا میں مرتکب ہوجائے تو صرف اس بناء پر طلاق نہ ہوسکے گی۔

وانس پیکارڈ نے اپنے مطالعہ میں پایا کہ شادی تک کنوارا رہنے کا رواجی تصور اب طلباء کی اکثریت کو قبول نہیں۔ طلباء کی اکثریت اس خیال کی حامی ہے کہ اگر فریقین کی عمر ۱۸ سال سے اوپر ہوچکی ہے اور وہ منگنی کا ارادہ رکھتے ہیں تو اُن میں مباشرت کو معقول سمجھا جانا چاہئے۔ لڑکیاں نسبتاً قدامت پسند پائی گئیں۔ جاپان کے بیشتر نوجوان مرد اور عورتیں یہ تسلیم کرتی ہیں کہ اُن کے محبوب اُن کے شوہروں سے الگ ہوتے ہیں وہاں عام احساس یہ ہے کہ محبت ایک شے ہے اور شادی بالکل دوسری چیز۔ بیس بائیس سال کی عمر کے نوجوان لڑکے ولڑکیاں دوشیزگی (Virginity) کی کوئی وقعت نہیں سمجھتیں اور یہ یقین رکھتی ہیں کہ شادی سے قبل جنسی اختلاط شادی کی تیاری کے لئے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں، اس طرح وہ اپنے فرسٹریشن کو دور کرکے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے شادی کے پارٹنر کا انتخاب افزائش نسل کے لئے کرسکتے ہیں نہ کہ جذبات کی رو میں بہ کر۔ بیشتر نوجوان یہ یقین رکھتے ہیں کہ جس سے وہ پیار کرتے ہیں اس سے مباشرت میں کوئی حرج نہیں، ویسے بھی پیار اور افزائش نسل کے تصور میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔

ماہر سماجیات ڈورس فرے Doris Frey لکھتی ہیں کہ بیشتر متمول ملکوں میں جنس اور محبت میں کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ سویڈن میں نوجوان لڑکے ولڑکیاں شادی کے پارٹنر کا انتخاب کرنے کے لئے آزادی کے ساتھ جنسی تجربات سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔

دوشیزگی عنقا ہوتی جارہی ہے اور اُسے ایب نارمل (Abnormal) سمجھا جاتا ہے۔ برطانیہ میں بیشتر غیر شادی شدہ لڑکے ولڑکیاں مباشرت سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور ایک تہائی شادی شدہ جوڑے شادی سے باہر ناجائز تعلقات قائم رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ اسقاط، ناجائز ولادتوں، طلاق اور جنسی امراض میں ظاہر ہوتا ہے اور جو ذہنی وجسمانی اذیتیں اٹھانا پڑتی ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ڈنمارک نے جو فی کس آمدنی کے اعتبار سے یورپ کا پانچواں مالدار ملک ہے ہر قسم کی پورنوگرافی پر سے بندشیں ہٹادی ہیں اور ہر قسم کی Permissiveness کو مکمل آزادی ہے حالانکہ بیسوائی اب بھی قانوناً ممنوع ہے!

کمیونسٹ معاشرہ میں رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلق کو روا سمجھا جاتا ہے اگر وہ باہمی الفت اور خلوص کے ساتھ ہوں۔ لینن کا کہنا تھا کہ کمیونزم کا مقصد لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں بکھیرنا ہے۔ شادی سے قبل جنسی تعلق اگر باہمی محبت، خیالات کی ہم آہنگی، خلوص اور اعتماد پر قائم ہے تو اُسے غیر اخلاقی نہیں مانا جاتا اور نہ معیوب سمجھا جاتا ہے!

پروفیسر سارنسن اپنی کتاب Love & Marriage میں لکھتے ہیں کہ "جنسی آزادی نے دوشیزگی اور عفت مآبی کا قلع قمع کردیا ہے۔ شادی کے قبل کسی لڑکی کا باکرہ رہنا اب ممکن ہی نہیں۔ آج کل مانع حمل تدابیر کے بہم پہنچنے میں سہولت اور سوسائٹی میں باکرہ پن کی اہمیت باقی نہ رہنے سے لڑکیوں کی بڑی اکثریت کو جنسی تجربات سے گزرنے کے مواقع حاصل ہوگئے ہیں"۔

نیویارک میں بورڈ آف ایجوکیشن کی طرف سے منعقد ایک سیمینار میں ایک ۱۷ سالہ لڑکی نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "آپ ہم پر بڑی پابندی عائد کررہے ہیں آپ سولہ سترہ سال کی جوان سیانی لڑکی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مباشرت نہ کرے، وہ بہر حال ایسا کر کے رہے گی"۔ ایک دوسری لڑکی نے کہا کہ "سیکس ایک ایسی چیز ہے جو ہماری زندگی کا جز ہے، اُسے تعلیم سے باہر پردوں میں چھپا کر رکھنا بڑی بھاری بھول ہے"۔ ایک تیسری لڑکی نے بتایا کہ اس کی کئی سہیلیاں ناجائز بچوں کی پرورش کررہی ہیں، والدین سے آپ اس قسم کی باتیں کر نہیں سکتے مجبوراً دوسری سہیلیوں سے ہی باتیں کرنا پڑتا ہے اور اس طرح غلط معلومات حاصل ہوجاتی ہیں"۔ ان سب لڑکیوں نے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ انہیں اسکولوں میں اور زیادہ جنسی تعلیم کیوں نہیں دی جاتی؟

وانس پیکارڈ نے ایک واقعہ ایک امریکی ماں کا نقل کیا ہے جس نے اپنی بیٹی کو ڈیٹنگ میں شدید انہماک کو ذرا کم کرنے کا مشورہ دیا تو اس لڑکی نے اپنی ماں کے منہ پر اپنا جیکٹ پھینکتے ہوئے کہا ممی خدارا آپ محبت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں"!

"Mother for goodness sake, yon don't know

any thing abot Love"! (p32)

امریکا میں ڈیٹنگ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا محبوب مشغلہ ہے لیکن یہ صرف پیار ومحبت تک محدود نہیں رہتا بلکہ لڑکیوں کو جسمانی اور جنسی طور پر تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات یہ تعلق بڑی ناخوشگوار صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر نفسیات جے سلورمین (J. Silverman) نے امریکا میں ڈیٹنگ کا ایک عمیق مطالعہ (۱) کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "ہر پانچ لڑکیوں میں ایک لڑکی کو جسمانی یا جنسی طور پر حملۂ مجرمانہ یا تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ نازیبا تعلق ہی کمسنی کے حمل اور خودکشی کے واقعات میں اضافہ کا سبب ہورہا ہے۔ فوری طور مجروح ہونے کے علاوہ ڈیٹنگ کے تشدد سے نوجوان لڑکیوں کی صحت کو متعدد خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔ ہائی اسکول کی سطح تک تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں جو ان نازیبا تعلقات کا شکار ہوجاتی ہیں وہ ان دوسری لڑکیوں کے مقابلہ میں (جن کے تعلقات ایسی ناخوشگوار صورت اختیار نہیں کرتے)۔

- شراب اور ڈرگس کے استعمال کے امکانات چارگنا۔
- کمسنی میں حاملہ ہوجانے کے امکانات چھ گنا۔
- خودکشی کے امکانات آٹھ گنا زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

پیکارڈ نے کچھ امریکن اور یوروپی ملکوں کی یونیورسٹیوں میں طلبہ وطالبات کی جنسی زندگی کا تفصیلی جائزہ سوالنامہ اور انٹرویو سے لیا اور اپنی تحقیقات کو "Sexual Wilderness" نامی کتاب میں پیش کیا۔ وہ اپنی تحقیقات کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ "جنسی بے راہ روی یقیناً بڑھ گئی ہے"۔

"Sexual Permissiveness Is So Clearly

In The Ascedancy Today"

(۱) اس مطالعہ کی تفصیلات جرنل آف امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن میں شائع ہوئیں۔ Toi 2.8.01

حالانکہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شادی سے قبل دوشیزہ رہنے کا تصور یقیناً قابل تعریف ہے، خاص طور پر لڑکیوں کے لئے لیکن اسے معاشرے کے نارمیٹو کوڈ Normative Code میں شامل نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ یہ ایک ذاتی فیصلہ ہے جسے افراد کی صواب دید پر چھوڑ دیا جانا چاہئے! انہوں نے تین شرائط پیش کئے کہ اگر وہ پورے ہوتے ہوں تو سوسائٹی کو شادی سے قبل جنسی تعلقات کی رضامندی دے دینا چاہئے:

- اوّل یہ کہ لڑکے اور لڑکی میں گہرے دوستانہ تعلقات پائے جاتے ہوں اور وہ ایک دوسرے سے واقف ہوں۔
- دوئم یہ کہ دونوں ہائی اسکول کر چکے ہوں اور اگر کالج کی تعلیم کا منصوبہ ہو تو اس کا پہلا سال پاس کر چکے ہوں۔
- سوئم یہ کہ انہیں اُمید ہو کہ وہ آپس میں شادی کرلیں گے اور اُن کے حقیقی دوست اس اُمید سے واقف ہوں۔

یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہئے کہ ایسا کوڈ اُسی صورت میں برداشت کیا جائے گا جب غیر شادی شدہ جوڑے کو موثر منع حمل تدابیر سے واقفیت ہو، جب وہ اس تجربہ پر عمل درآمد کرنے جارہے ہوں! (ص ۴۰٦)

متذکرہ بالا لبرل رُجحانات کا اثر افراد کے جنسی برتاؤ میں پڑنا بالکل فطری تھا اور فی الواقع ایسا ہی ہوا بھی۔ حالانکہ سماجی مبصروں میں اس سلسلہ میں کافی بحث ومباحثہ رہا ہے کہ شادی سے قبل جنسی اختلاط میں اضافہ ہونے کی جو بات کہی جارہی ہے اُس میں قیاس آرائی کتنی ہے اور سچائی کتنی؟ جو ماہرین سماجیات اضافہ کے قائل ہیں انہوں نے حالات سے ملنے والے تین ثبوت پیش کئے ہیں:

١) ناجائز ولادتوں میں اضافہ۔

٢) کنواری حاملہ ماؤں کی تعداد میں اضافہ۔

٣) جنسی امراض (STD) میں اضافہ۔

یہ اُمور اس بات کو پوری طرح ثابت کرتے ہیں کہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر شادی سے قبل جنسی اختلاط Incidence Of Premarital Coitus میں اضافہ ہوا ہے۔

اس کے علاوہ دوسرا ثبوت وہ سروے اور جائزے ہیں جو مختلف ماہرین نفسیات وسماجیات نے لوگوں سے اُن کی جنسی زندگی کے بارے میں سوالنامہ یا انٹرویو سے معلومات حاصل کرکے اُس کا مخصوص Statistical Techniques سے تجزیہ Analysis کرتے ہوئے رپورٹوں کی شکل میں مرتب کیا اور اُن سے معنی خیز نتائج اخذ کئے۔ تیسرا ثبوت وہ Opinion Polls ہیں جو مختلف کمپنیوں یا میگزین کے لئے کئے گئے جس میں آبادی کے عام افراد سے اُن کے جنسی رُجحانات و برتاؤ کے بارے میں معلومات یکجا کی گئیں اور اُن سے نتائج اخذ کئے گئے۔

یہاں کچھ ایسے تحقیقاتی مطالعوں کے اہم انکشافات بیان کئے جاتے ہیں جس سے مختلف ملکوں کے باشندوں کی جنسی زندگی پر روشنی پڑتی ہے:

(١) کنسے رپورٹ

انڈیانا یونیورسٹی کے ماہر جنسیات ڈاکٹر الفرڈ چارلس کنسے نے ١٢ ہزار امریکی مردوں اور ٦ ہزار عورتوں سے سوالنامہ/ انٹرویو کے ذریعہ اُن کی جنسی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرکے مبسوط رپورٹیں پیش کیں جو Sexual Behaviour In Human Male/Female کے نام سے ١٩٤٨ء اور ١٩٥٣ء میں شائع ہوئیں۔ اس رپورٹ کے کچھ اہم انکشافات درج ذیل ہیں:

مردوں کی جنسی زندگی

(١) امریکی مرد کی جنسی زندگی کی ابتدا شادی کے بعد نہیں ہوتی بلکہ اس کے بہت قبل شروع ہوجاتی ہے۔ شادی تک جنسی قوت کو روکا نہیں جاتا۔

(٢) امریکا میں جنسی اعتبار سے کوئی مرد بے عمل نہیں ہے بلکہ اُس کی عملی زندگی بسا اوقات بلوغ سے قبل شروع ہوجاتی ہے۔

(٣) شادی سے قبل عورتوں سے اختلاط کرنے والوں کی تعداد ١٥ سال کی عمر تک ٢٥ فیصدی ہے اور ١٦ سے ٤٠ سال کی عمر کے دوران ٩٠ فیصدی ہے۔ ١٦ سے ٢٠ سال کی عمر کے دوران غیر فاحشہ عورتوں سے اختلاط کا تناسب ٤٠ فیصدی ہے۔

(٤) جن لوگوں کی تعلیم گرامر اسکول تک ہوئی اُن میں ٨٤ فیصدی کو عورتوں سے اختلاط

کا سابقہ رہا ہے۔ ہائی اسکول تک تعلیم پانے والوں کا تناسب ۷۷ فیصدی اور کالج کے تعلیم یافتوں کا تناسب ۴۹ فیصدی تھا۔ کم تعلیم یافتہ لوگوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلہ میں عورتوں سے اختلاط کا تناسب زیادہ پایا گیا ہے۔

- شادی شدہ مردوں میں نصف سے زیادہ نے اپنی بیوی کے علاوہ غیر عورتوں سے اختلاط کیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اتنی ہی عورتیں دورانِ ازدواج آشنائی کرتی رہیں۔
- جنسی افعال کی کثرت ۱۶ سے ۲۰ سال کے نوجوانوں میں سب سے زیادہ پائی گئی کیونکہ اس عمر کے ۷۰ فیصدی نوجوان جنسی اختلاط میں مبتلا پائے گئے۔
- امریکہ میں بیشتر صورت میں شوہر اپنی بیویوں کو آوارگی کی ترغیب دیتے ہیں کہ خود اپنی آوارگی کے لئے عذر نکل آئے۔
- امریکی مردوں کی ۹۵ فیصد تعداد ایسے جنسی اعمال میں مبتلا ہے جن کی نوعیت تعزیری جرائم کی ہے۔

عورتوں کی جنسی زندگی

- عورتوں کا کردار جنسی طور پر مردوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ بدلا ہے اور اب وہ جنسی اعتبار سے اتنی سرد نہیں ہیں جتنا کہ اُن کے بارے میں پروپیگنڈا کیا گیا۔
- ۵۰ فیصدی عورتیں شادی سے قبل جنسی ملاپ کر لیتی ہیں، اُن کے مقابلہ میں مردوں کا تناسب ۸۳ فیصد ہے۔
- عمر کے ابتدائی زمانہ میں مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم جنسی افعال میں مبتلا ہوتی ہیں۔ مردوں میں تقریباً ۹۲ فیصد افراد کسی نہ کسی قسم کا جنسی تجربہ کر لیتے ہیں لیکن عورتوں میں صرف ۲۷ فیصد اس طرف رُجوع ہوئیں۔
- عورتوں کی تعداد جو Petting کی طرف راغب تھیں ۹۱ فیصد بڑھ گئی۔
- شادی سے قبل جنسی تعلق قائم کرنے والی عورتوں میں سے ایک تہائی نے دو سے پانچ مردوں تک یہ تعلقات قائم کئے۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا وہ اپنے اس رویہ پر شرمندہ ہیں؟ تو اس کا جواب نفی میں ملا۔
- امریکا میں آزادیٔ نسواں کی لہر میں وفاداری کا دُہرا معیار ختم ہو چکا ہے۔ اب اگر

عورت نے شوہر سے بے وفائی بھی کی تو لوگ اُسے زیادہ معیوب نہیں سمجھتے اور شوہر بھی اسے برداشت کرنے کے جذبات پیدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر کنسے اپنی تحقیقات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ”آج بھید کھل جانے کی بدنامی کا ڈر دور ہوتا جا رہا ہے، ہتھ پھیر کے مواقع بڑھتے جا رہے ہیں اور پھر آخری مرحلہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ اونچے معاشرتی طبقہ میں یہ چیز بڑھتی جا رہی ہے۔ ناجائز بچوں کے جس کلنک (Stigma) کے ڈر سے لڑکیاں بچی رہتی تھیں وہ کلنک بھی بیشتر ملکوں میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس بات کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے کہ شادی کے لئے باکرہ (Virgin) ہونا ضروری ہے“۔

ڈاکٹر کنسے کی ان تحقیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے جی۔ ایس۔ گھورے (G.S. Ghure) لکھتے ہیں: ”اگر ہم کنسے کے سامپل (Sample) کا موازنہ امریکا میں ہی اس سے قبل Davis & Terman کے دو سامپل سے کریں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ امریکا کی لڑکیوں میں شادی سے قبل جنسی انہماک کنسے کے سامپل میں ہر اعتبار (DeepSexuality, Time, Promiscuity) سے بڑھ گیا ہے، لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ گذشتہ پچاس سال میں امریکی لڑکیوں کے نقطۂ نظر میں اس حد تک تبدیلی آ چکی ہے کہ اب وہ صرف شادی کو اپنی جنسی تسکین کا موقع نہیں مانتیں بلکہ وہ شادی سے بہت قبل اپنے دوستوں اور منگیتروں کے ساتھ ڈیٹنگ کے دنوں میں ہی لمس شہوانی، بوس و کنار، ہم آغوشی اور Petting کی جملہ منزلوں سے گزر چکتی ہیں اور ان کی بڑی تعداد جنسی اختلاط سے بھی لطف اندوز ہو چکی ہوتی ہے اور ان کارگزاریوں میں منہمک ہونے کی اوسط عمر بھی کم ہو گئی ہے۔ ان تمام اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب امریکی لڑکیوں کی بڑی اکثریت اپنے جنسی جذبات کی تسکین کے لئے شادی کا انتظار نہیں کرتیں بلکہ اپنے جذبات کی تسکین (جس میں مباشرت بھی شامل ہے) بہت پہلے کر لیتی ہیں اور یہ نتیجہ ہے اُن تعلیمات اور ترغیبات کا جو گذشتہ نصف صدی سے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر پھیلائی جا رہی ہیں، لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ Culturally Conditioned ہیں نہ کہ Biologically Evolved!“ (۱)

(۱) Sexual Behaviour of the American Female: G.S. Ghure P. 91 & 151

(۲) ڈورتھی، براملے، برائٹن کی تحقیقات

امریکا کے ۴۶ کالجوں کے ۱۳۶۴ طلبہ وطالبات سے انٹرویو کرنے سے حقائق ذیل سامنے آئے:

- ہائی اسکول تک کی پڑھائی میں ہی یہاں کے بچوں کا کردار داغدار ہو جاتا ہے۔ دو تہائی لڑکوں ولڑکیوں کو ۱۸ سال کی عمر تک جنسی تجربہ ہو جاتا ہے۔
- تین چوتھائی لڑکے غیر کنواری لڑکیوں سے شادی کرنے کو تیار تھے۔
- دو تہائی لڑکوں کو ضبط ولادت کے طریقے معلوم تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لڑکیاں ابارشن کرادیتی ہیں۔
- ۶۴ فیصدی طلبہ وطالبات شادی کے بعد بھی اس دائرہ کے باہر جنسی تسکین کو برا نہیں مانتے تھے بلکہ اس کے لئے تیار رہتے تھے۔
- کالجوں کے ۵۰ فیصدی لڑکے اور ۲۵ فیصدی لڑکیاں جنس سے لذت اندوز ہو چکی تھیں۔ ۵۰ فیصدی طلبا، جو اس سے بچے رہے انہوں نے ابارشن کا خوف یا اپنے معیار کی محبوبہ نہ ملنا اس کا سبب بتایا۔ ایسے ہی اسباب لڑکیوں نے بھی بتائے۔ مجموعی طور پر ۶۴ فیصدی طلبا، اس قدیم رسم ورواج اور پرانی قدروں (Values) کو ٹھکرانے کو تیار تھے!
- لڑکیاں اب بھی نسبتاً زیادہ پاکدامن ہیں پھر بھی نصف سے زیادہ کو کالج میں داخلہ سے پہلے ہی جنسی فعل کا تجربہ چھوٹی عمر میں اسکول میں ہی ہو چکا تھا۔
- زیادہ بدچلن لڑکیاں "نئے خیالات والے" خاندانوں کی ہوتی ہیں جن کے والدین اسے معیوب بھی نہیں سمجھتے۔

(۳) گائل گرین کی تحقیقات

گائل گرین (۱) نے ۱۰۲ کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ وطالبات سے انٹرویو لیا اُن کا سامپل ۶۱۴ پر مشتمل تھا۔ اس جائزہ کے مطابق صرف ۵۰ فیصدی طالبات ہی گریجویٹ ہونے تک جنسی اختلاط کے تجربہ سے محروم رہ جائیں گی۔ میشیگن میں زیادہ سے

(1) Sex And The College Girl

زیادہ ۳۰ فیصدی اور میری بالڈون اسکول کی صرف ۲۰ فیصدی طالبات اس تجربہ سے بچ پاتی ہیں۔ امریکن کالجوں میں اپنے کو پاکدامن کہنے والی لڑکی کی سب ہی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ ایسی کنواری کی اہمیت صرف اس لئے ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ کہا جاتا ہے کہ جو کنواری سے پہلی بار مباشرت کرتا ہے اُس سے زندگی بھر لگاؤ بنا رہتا ہے۔ ایک لڑکی نے محقق سے کہا کہ محبت کے معنی کیا ہیں؟ صحبت! اس میں بنتا بگڑتا کیا ہے؟ الباما کے ایک پروفیسر نے کہا جس نے محبت کرنا سیکھا اُسی کو صحبت کرنا چاہئے لیکن جس نے کیا وہی شوہر ہے!

وانس پیکارڈ کی تحقیقات

امریکا کے سماجی مبصر وانس پیکارڈ نے ریاستہائے متحدہ امریکا، کینڈا، انگلستان، ناروے، سویڈن، جرمنی، اٹلی وغیرہ کے ملکوں کا دورہ کرکے وہاں کے مردوں عورتوں کے باہمی برتاؤ، سکشول شناخت (Sexual Identity) نسلی اختلافات، اخلاقیات اور شادی کے متعلق بدلتے ہوئے رُجحانات کا تفصیلی مطالعہ کیا، انہوں نے وہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ وطالبات سے چک لسٹ (Check List) انٹرویو کے ذریعہ ان اُمور پر معلومات حاصل کیں اور انہیں مرتب کرکے اپنی کتاب "Sexual Wilderness" میں پیش کیا۔ ان کے سامپل میں دو ہزار طلبا، وطالبات شامل تھیں۔ اُن کی اہم تحقیقات کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- غیر شادی شدہ امریکی طالبات میں جنسی مباشرت کے انہماک میں اس ۲۰ سال کے عرصہ میں ۶۰ فیصدی کا اضافہ ہو گیا۔ اگر علاقائی اختلافات کو نظر انداز کر دیا جائے تو مباشرت کا ملکی اوسط مردوں میں ۶۰ فیصدی اور عورتوں میں ۴۰.۵ فیصدی ہوگا۔ کیریر کی طرف رغبت رکھنے والی لڑکیاں زیادہ بے راہ روپائی گئی اور وہ ہر قسم کے جنسی افعال میں دوسری لڑکیوں سے زیادہ ہی بے باک اور آزاد روش پر چلنے والی پائی گئیں۔
- امریکی لڑکیوں میں جنسی مباشرت کے یہ اعداد ایک دوسرے پہلو سے اور بھی چونکا دینے والے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں امریکی کالجوں میں بہ مقابلہ ۱۹۴۰ء کے ۱۹ فیصدی زائد لڑکیاں تعلیم پارہی تھیں اور اُن میں مباشرت کا انہماک ۲۷ سے بڑھ کر

۴۳ فیصدی ہوگیا۔ لہٰذا یہ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کے بعد سے کالج میں داخل ہونے والی ہر ۱۹ لڑکیوں میں کم از کم ۱۶ (یعنی ۸۰ فیصدی) جنسی صحبت سے لطف اندوز ہو چکی ہیں!

* یہی امر جب انگلینڈ کی طالبات سے دریافت کیا گیا تو ۶۳ فیصدی نے یہ تسلیم کیا کہ انہیں تجربہ ضرور ہو چکا ہے لیکن وہ پختہ نہیں ہیں۔ اسی طرح جرمنی کی ۶۰ فیصدی ناروے کی ۵۴ فیصدی اور کنیڈا کی ۳۵ فیصدی لڑکیوں نے تسلیم کیا کہ وہ جنسی مباشرت (Coitus) سے لطف اندوز ہو چکی ہیں۔
* پانچ یونیورسٹیوں کے سامپل میں طلبہ وطالبات کے جنسی اختلاط میں مبتلا ہونے کے اعداد ذیل کے نقشہ میں پیش ہیں:

سامپل	مباشرت میں مبتلا ہونیوالوں کا فیصد	
	لڑکے	لڑکیاں
انگلش یونیورسٹی	75	63
ناروے یونیورسٹی	67	54
امریکی یونیورسٹی	58	43
کینیا یونیورسٹی	57	35
جرمن یونیورسٹی	55	60

* ملکی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے 2200 کے پورے سامپل کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کے نوجوانوں میں Petting کی ابتدا 16 سال کی عمر سے ہی ہو جاتی ہے اور پہلا جنسی اختلاط کا تجربہ ۱۷ سال کی عمر میں ہو جاتا ہے اور ان دونوں جنسی افعال کے درمیان اوسطاً دو ڈھائی سال کا وقفہ رہتا ہے۔
* 58 فیصدی نوجوانوں نے یہ اعتراف کیا کہ اُن کے کئی جنسی پارٹنر ہوتے ہیں۔
* ایک قابل غور بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اب لڑکیاں لَو میکنگ (Love Making) میں پہل بھی کرنے لگی ہیں اور یہ پُرانا خیال کہ وہ صرف Passive رول ادا کرتی ہیں صحیح نہیں رہا۔

* جنسی اختلاط کو اب Sin کے بجائے Fun سمجھا جانے لگا ہے اور اُسے Happy Encounter سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
* پیکارڈ نے اپنے کالج سروے میں یہ پایا کہ دو تہائی امریکی طلبہ وطالبات نے یہ بتایا کہ وہ اپنے پہلے جنسی تجربہ کے وقت شراب نہیں پیتے تھے۔ ہر آٹھ میں ایک نے یہ بتایا کہ وہ پہلے جنسی اختلاط کے وقت نشے کی حالت میں تھے۔ انگریز لڑکیاں زیادہ تعداد میں شراب کا شغل کرتی تھیں ان کی ۴۰ فیصدی تعداد شراب پیتی تھی اور جن لڑکیوں نے مباشرت کا پہلا تجربہ کیا اُن میں ایک تہائی نے یہ بتایا کہ وہ خود یا اُن کے پارٹنر یا دونوں شراب کے نشے میں تھے۔
* طلباء وطالبات اپنے ہاسٹل کے کمروں میں دوسرے فریق کو کس وقت تک Entertain کر سکتے ہیں اس پر بھی بسا اوقات یونیورسٹی کے حکام سے ٹکراؤ کی صورت پیش آجاتی ہے۔ امریکا کی ہی مختلف یونیورسٹیوں میں اس سلسلہ میں الگ الگ اوقات متعین ہیں: کولمبیا یونیورسٹی میں طلباء اپنے کمرہ میں طالبات کو سنیچر کی رات کو ۱ بجے تک بلا سکتے ہیں، ہارورڈ یونیورسٹی نے روم وزٹ ہفتہ کے سب دنوں میں ۷ بجے شام تک اور ویک اینڈ پر آدھی رات تک کی اجازت دے رکھی ہے۔ کچھ یونیورسٹیوں نے ۲ بجے شب تک کی بھی اجازت دی ہے لیکن عملاً ان احکام کا نفاذ مشکل ہی سے ہو پاتا ہے اور نتیجہ ظاہر ہے......

(۵) انسٹیٹیوٹ آف سوشل ایکشن (شکاگو)

انسٹیٹیوٹ آف سوشل ایکشن نے ۱۹۷۶ء میں امریکا کے بیس مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں 3,700 طلباء وطالبات کا ایک Opinion Poll لیا تو یہ پایا کہ اب امریکا کے جتنے طلباء جنسی اختلاط سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اتنی ہی تعداد میں طالبات بھی اپنی جنسی آسودگی کے لئے تیار رہتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے سروے میں 49 فیصدی لڑکیاں گریجویشن کرنے تک باکرہ (Virgin) رہی تھیں لیکن ۱۹۷۶ء میں یہ تعداد کم ہو کر صرف 26 فیصدی رہ گئی۔ سروے میں یہ بھی بتایا گیا کہ بیشتر جوڑے Mono gamous تھے یعنی ایک ماہ میں وہ ایک ہی فرد سے ہمبستر ہوتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں کئے گئے دوسرے

سروے سے یہ معلوم ہوا کہ امریکی عورتوں کی اب صرف ۲۱ فیصدی تعداد شادی ہونے تک جنسی تجربہ سے احتراز کرپاتی ہیں جبکہ ایک نسل قبل تک یہ تعداد 48 فیصدی تھی۔

(۶) پلے بوائے ریسرچ فاؤنڈیشن

اس فاؤنڈیشن نے اپنے ایک مطالعہ میں یہ پایا کہ ۱۸ سے ۲۳ سال کی عمر کی امریکی شادی شدہ خواتین میں ۲۴ فیصدی اپنے لَوافیر (Love Affair) اور جنسی تعلقات ایسے لوگوں سے قائم رکھتی ہیں جواُن کے شوہر نہیں ہوتے اور ۲۵ سے ۳۵ سال کی عمر والیوں میں ایسے ناجائز تعلقات رکھنے والیاں ۳۲ فیصدی ہوتی ہیں۔ ہم جنسیت کے بارے میں بتایا گیا کہ ۱۸ سے ۴۰ سال کی عمر کے ۲۵ فیصدی مرد اس طرف رغبت رکھتے تھے اور اسی عمر کی ۱۸ فیصدی خواتین لیزبین (Lesbian) رُجحان رکھتی تھیں۔ مرد ہوموسکشولش میں ۹ فیصدی عادی ہم جنس پرست تھے۔

(۷) نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہیلتھ

امریکی عورتوں کے جنسی برتاؤ کے بارے میں اس انسٹیٹیوٹ نے ۲۰ سے ۲۹ سال کی 1314 غیر شادی شدہ خواتین کا ایک سروے ۱۹۸۳ء میں کیا تو یہ معلوم ہوا کہ اس عمر کی ہر پانچ عورتوں میں چار جنسی تجربہ سے گزر چکی ہیں، ایک تہائی کم از کم ایک بار حاملہ ہو چکی ہیں اور ۴۰ فیصدی اپنے پہلے حمل کا اسقاط کرا چکی ہیں۔

- ایک تہائی خواتین اپنی مرضی سے کسی نہ کسی مرد کے ساتھ رہ چکی ہیں اور
- ۷ افیصدی عورتیں بغیر منع حمل تدابیر اختیار کئے عادی طور پر جنسی اختلاط میں مبتلا ہوتی ہیں۔
- ۱۹۸۳ء میں امریکا میں ۲۰ سال سے ۲۹ سال کی عمر والی کل ۸۱ لاکھ عورتوں میں ۴ لاکھ کے ولادت ہوئی اور ۶ لاکھ ۶۰ ہزار ابارشن کرائے گئے۔
- اسی عمر کی ۲۵ فیصدی عورتیں جب تک کہ اُن کو پہلا استقرار حمل نہیں ہو جاتا منع حمل آلات استعمال نہیں کرتیں۔
- ایسی غیر شادی شدہ عورتیں زیادہ تر اپنا جنسی تعلق اپنے بوائے فرینڈس سے بنائے رکھتی ہیں اور کبھی Casual Relationships غیر مردوں سے بھی بنا لیتی ہیں۔

(Pioneer 18.7.1986)

(۸) ڈیورکس کمپنی کا سروے

مشہور کنڈوم نیوفیکچرنگ کمپنی Durex ڈیورکس نے یورپ کے ۱۵ ملکوں میں دس ہزار نوجوانوں سے اُن کی جنسی زندگی سے متعلق ایک سروے ۱۹۹۵ء میں کیا تو یہ منکشف ہوا کہ برطانوی نوجوان (Teenagers) یورپ کے دوسرے ملکوں کے نوجوانوں کی بہ نسبت جنسی اعتبار سے زیادہ جلد سرگرم عمل Sexually Active ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ کے ۱۴ فیصدی نوجوانوں نے یہ تسلیم کیا کہ وہ ۱۴ سال کی عمر تک پہلا جنسی تجربہ کر چکتے ہیں اور ۱۶ سال کی عمر کو پہنچنے تک تو تقریباً ۳۵ فیصدی نوجوان جنسی اعتبار سے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں ۱۶ سال سے کم عمر نوجوانوں میں جنسی مباشرت کا فیصد یہ تھا: فرانس ۲۳ فیصدی۔ اسپین ۲۰ فیصدی۔ اٹلی ۱۲ فیصدی۔

امریکی نوجوان اس اعتبار سے سب سے زیادہ تیز (Grow up Fastest) پائے گئے وہاں کے ۴۹ فیصدی نوجوانوں نے یہ اعتراف کیا کہ وہ اپنی سولہویں سالگرہ تک پہلا جنسی تجربہ کر لیتے ہیں اور اُن میں بھی ۱۱ فیصدی کی عمر تو ۱۳ سال سے بھی کم تھی! (TOI 10.7.96)

محفوظ جنسی تدابیر کے بارے میں معلومات (Awareness) برطانیہ کے نوجوانوں کی سب سے کم تھیں وہاں کے صرف ۴۰ فیصدی نوجوانوں نے یہ بتایا کہ وہ Casual Sex کے وقت کنڈوم استعمال کرتے ہیں جبکہ فرانس کے ۶۹ فیصدی اور اٹلی کے ۴۸ فیصدی بالغ افراد ان منع حمل تدابیر پر عمل کرتے ہیں۔ امریکا کے نوجوانوں کے بارے میں ان اعداد کی تصدیق وہاں کے سینٹر فار ڈزیز کنٹرول کے ایک مطالعہ (۱۹۹۰ء) سے بھی ہو جاتی ہے جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ امریکا کے ایک تہائی نوجوان سکنڈری اسکول میں پہنچنے تک جنسی تجربہ کر چکتے ہیں اور جب یہ نویں گریڈ میں پہنچتے ہیں (جب ان کی عمر ۱۴-۱۵ سال کی ہوتی ہے) تب ہی ان میں ۴۰% نوجوان لڑکے جنسی اعتبار سے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

اسی مرکز کی رپورٹ سے متاثر ہو کر امریکا میں "True Love Waits" نامی تحریک شروع ہوئی تھی جسے ۲۶ چرچ کی تنظیموں کا تعاون حاصل تھا۔ اس تحریک کی ایما پر ۲ لاکھ ۱۱ ہزار امریکی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے اگست ۱۹۹۴ء میں واشنگٹن میں پبلک

کے سامنے پاکدامن (Chaste) رہنے کا اقرار کرتے ہوئے وہ کارڈ بھرا تھا اور دستخط کئے تھے جس پر یہ مضمون چھپا تھا:

''یہ یقین کرتے ہوئے کہ حقیقی محبت انتظار کرتی ہے میں خدا کو حاضر و ناظر مان کر خود اپنے سے، اپنے خاندان والوں سے، اور جن کو ڈیٹ Date کرتا ہوں اُن کو، اور اپنی ہونے والی شریک حیات اور ہونے والے بچوں کے سامنے یہ عہد کرتا ہوں کہ میں شادی ہونے تک پاکدامن رہوں گا/ رہوں گی''۔

(TOI-1.8.94)

(۹) ریڈ بک میگزین کا سروے

امریکی میگزین (Red Book) نے ایک Poll کیا جس کے نتائج اپنی ایک اشاعت میں شائع کئے۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ امریکا میں ۴۰ سال کی عمر کی تمام شادی شدہ خواتین میں ایک تہائی شادی ہونے تک کنواری رہتی ہیں لیکن ۲۵ سال سے کم عمر دلہنوں میں صرف ۶ فیصدی شادی کے وقت کنواری رہتی ہیں۔ پول میں حصہ لینے والی ۵ فیصدی عورتوں نے یہ بتایا کہ انہیں کبھی جنسی آسودگی (Orgasm) حاصل نہیں ہوئی لیکن ۶۱ فیصدی خواتین نے یہ اعتراف کیا کہ جب بھی وہ لو میکنگ میں شریک ہوتی ہیں انہیں جنسی آسودگی حاصل ہوجاتی ہے۔ ۴۳ فیصدی خواتین نے تسلیم کیا کہ وہ اپنی جنسی زندگی سے مطمئن ہیں اور ۱۷ فیصدی نے یہ کہا کہ وہ اور زیادہ لو میکنگ کی خواہشمند ہیں۔

(۱۰) شیرے ہائٹ (Shere Hite) کی تحقیقات

امریکی سیکس ریسرچر شیرے ہائٹ نے امریکی مردوں اور عورتوں سے ان کی جنسی زندگی کے بارے میں جو تحقیقات کیں ان کے نتائج اپنی کتاب "Male Sexuality" میں درج کئے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ۷۲ فیصدی امریکی مرد رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی اختلاط میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسرا اہم انکشاف یہ تھا کہ بڑی تعداد میں مرد اُن لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے جن سے وہ بیحد پیار کرتے رہے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ وہ جذبات کی رو میں بہ نہیں گئے۔

(۱۱) برطانیہ کی ایک سرکاری رپورٹ کے انکشافات

برطانیہ میں نیشنل کاؤنسل فار ون پیرنٹ فیملیز اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ ٹرسٹ کے اشتراک سے ایک سرکاری کمیٹی کا تقرر کیا گیا تھا کہ اسکولی لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی جس میں والدین کو چونکا دینے والے کئی انکشافات تھے۔ اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈیلی اسٹار کے مبصر Ian Monk نے لکھا "Forget The Swinging Sixties We're Living In The Sizzling Seventies" رپورٹ میں بتایا گیا کہ:

- بن بیاہی لڑکیوں میں مباشرت کا اضافہ پہلے سے دُگنا ہوگیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شادی کے دن ہر چار لڑکیوں میں صرف ایک کنواری ہوتی ہے۔
- جوان ورکنگ گرلس کے والدین کے لئے اور بھی چونکا دینے والا انکشاف یہ ہے کہ یہ ٹین ایج (Teen Age) کی لڑکیاں جب شادی کرتی ہیں تو ہر چار میں ایک حاملہ ہوتی ہے اور جو دوسری لڑکیاں حاملہ نہیں بھی ہوتی ہیں وہ بھی یہ نہیں کہہ سکتیں کہ انہوں نے جنسی اختلاط نہیں کیا ہے۔
- رپورٹ میں حاملہ کمسن دُلہن کو یہ بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ آگے چل کر اُس کے طلاق پانے کے امکانات بھی دُگنے ہوگئے ہیں۔
- Hard Headed Career Girls کے بارے میں بتایا گیا کہ ہر دس ایسی لڑکیوں میں ایک کمسنی میں شادی کرے گی اور ہر بیس میں ایک شادی کے گون کو زیب تن کرتے وقت حاملہ ہوگی۔
- عورتیں اپنے جنسی تجربات میں کافی بے باک ہوتی جارہی ہیں جب کہ پہلے صرف مرد اس قسم کے تجربات میں آگے رہتے تھے۔

(Pioneer 23.9.79)

(۱۲) ''سوشل ٹرینڈس'' کا جائزہ

برطانیہ میں ایک سروے ۱۹۷۹ء میں کیا گیا جس کے نتائج ''سوشل ٹرینڈس'' میگزین میں شائع ہوئے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ برطانیہ میں ہر دس میں سات نوجوان

شادی سے قبل جنسی تعلق کو بالکل روا سمجھتے ہیں۔ لڑکے تو تقریباً سب کے سب اسے مناسب سمجھتے ہیں۔ 85 فیصدی نے کہا کہ وہ مسرت کے ساتھ ایسے رُومانی تجربہ سے گزر جانا چاہتے ہیں اور لڑکیوں میں 65 فیصدی نے ایسے رُومانس کے لئے آمادگی کا اظہار کیا۔ بہت سے نوجوان یہ جانتے ہیں کہ اُن کی شادیاں طلاق میں ختم ہوں گی لیکن وہ ایسے امکانات سے گھبراتے نہیں۔ حالانکہ جنسی اخلاقیات کے بارے میں وہ اتنے زیادہ آزاد خیال ہیں لیکن ویسے وہ کافی قدامت پسند Conservative Homeloving اور ایماندار بھی ہیں اُن میں 80 فیصدی ڈرگ نوشی اور 40 فیدی سگریٹ نوشی کو ناپسند کرتے ہیں۔

(India Express 26.2.78)

(۱۳) کاسموپالیٹن میگزین کا سروے

برطانیہ کی فینسی فری گرلس ہمیشہ ایک نئے جوش وولہ سے جنسی کھیل کھیلنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ کاسموپالیٹن میگزین نے اپنے قارئین میں ایک جائزہ لیا تو 67 فیصدی نے شادی سے قبل خوب کھل کر جنسی ملاپ کی موافقت میں رائے دی۔ 57 فیصدی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں محبت میں پیش قدمی کے مواقع ملنا چاہئیں اور 80 فیصدی نے کہا کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ گھومنے پھرنے اور شراب نوشی کے دور کے لئے ہمیشہ پیسہ خرچ کرنے کے لئے خوشی سے آمادہ رہتے ہیں۔

(۱۴) گنتھر ہونلڈ (Gunther Hunold) کی تحقیقات

جرمن مصنف اور ماہر تعلیمات گنتھر ہونلڈ نے ایک سوالنامہ اور انٹرویو کے ذریعہ مغربی جرمنی کی لڑکیوں سے اُن کی ابتدائی زندگی، عنفوان شباب، پاکدامنی اور جنسی تجربات کے متعلق معلومات حاصل کر کے ایک رپورٹ "Sex Records Of The School Girls" میں شائع کیں جس کے کچھ اہم انکشافات پیش ہیں:-

* اب دوشیزگی کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے Virgins Are A Dying Breed
* تقریباً سب ہی لڑکیاں منع حمل گولیاں (Pills) استعمال کرتی ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ بغیر کسی طبّی معائنہ کے وہ ایسا کرتی رہتی ہیں۔

* استقرار حمل کے اندیشہ سے بے خوف ہو کر وہ ہر قسم کے جنسی تجربات میں کھل کر حصہ لیتی ہیں اور انہیں جنسی معاملات میں اتنی واقفیت ہوتی ہے جتنی کہ شاید اُن کے والدین کو بھی نہ ہو۔
* وہ اپنے ہونے والے شوہر کا بڑا واضح خاکہ ذہن میں رکھتی ہیں اور اپنی خواہشات پر ذرا بھی کنٹرول کئے بغیر شادی ہونے تک تمام جنسی تجربات سے گزر چکی ہوتی ہیں۔

(۱۵) ہیمبرگ انسٹی ٹیوٹ فار سکشول ریسرچ کی تحقیقات

ہیمبرگ انسٹی ٹیوٹ نے مغربی جرمنی کے ۱۱ سے ۱۶ سال کی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک سروے کیا تو یہ معلوم ہوا کہ دو تہائی لڑکے اور نصف لڑکیاں (۵۰ فیصدی) ۱۱ سال کی عمر کو پہنچنے تک ڈیٹ (Date) کر چکے ہوتے ہیں لیکن وہ جنسی تجربہ کے آخری مرحلہ پر اُسوقت پہنچتے ہیں جب وہ ۱۶ سال کی عمر کے ہو جاتے ہیں اور ۱۶ سال کی عمر کی لڑکیاں اپنی ہی عمر کے لڑکوں کی بہ نسبت زیادہ کثرت سے مباشرت (Coitus) کرتی ہیں۔ ویسے لڑکے مباشرت کی ابتدا جلدی کر دیتے ہیں کیونکہ سروے میں یہ بتایا گیا کہ لڑکے ۱۲ سال کی عمر پر ہی پہلا جنسی تجربہ کر لیتے ہیں اور ۱۶ سال کی عمر کو پہنچتے تک ۲۲ فیصدی لڑکے پورا جنسی تجربہ حاصل کر لیتے ہیں جبکہ ۴۰ فیصدی لڑکیاں اپنی دوشیزگی کھو چکتی ہیں۔

(۱۶) ایمنڈ سائنٹفک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تحقیقات

Emnid Scientific Research Institute

جرمنی کے ماہر جنسیات Norbert Kluge کی نگرانی میں ایمنڈ انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۹۵ء میں ایک تحقیقاتی مطالعہ کیا جس میں ۱۴ سے ۱۷ سال کے ۵ ہزار نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں نیز اُن کے والدین سے اُن کی جنسی زندگی سے متعلق سوالنامہ اور انٹرویو کے ذریعہ معلومات فراہم کیں تو بعض جوابات بڑے چونکا دینے والے ملے۔ جوابات کا تجزیہ کرنے سے محققین اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب جرمنی کے باشندے جنسی تعلقات میں بیجا طور پر محتاط (Prudish) نہیں ہیں بلکہ وہ جنسی موضوعات پر کھل کر اپنے والدین سے گفتگو کرتے ہیں اور اُن کے والدین بھی پہلے کی طرح شہد کی مکھی اور پھولوں کی تمثیل دے کر ڈھکی چھپی

باتیں نہیں کرتے۔ گذشتہ تیس سال میں جرمنی میں جنسی تعلیم میں بڑی توسیع ہوئی ہے اور ۱۹۶۰ء کے دہے میں جنسی آزادی کی جو لہر آئی اُس نے یہاں کے نوجوان طلباء کے خیالات اور سوچ میں بھی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں اور آج صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ اگر کوئی ۱۸ سال کا لڑکا کسی لڑکی کو بوسہ نہیں کرتا یا کسی گرل فرینڈ کو گھر نہیں لاتا تو اُس کے والدین خود اس بات پر متفکر ہو جاتے ہیں! اس مطالعہ کے کچھ اہم انکشافات یہ ہیں:

- 85 فیصدی والدین نے یہ تسلیم کیا کہ وہ اپنے بچوں سے جنسی اعضاء فیملی پلاننگ اور جنسی طریق کار پر بے جھجک بات کرتے ہیں۔
- 75 فیصدی والدین نے کہا کہ انہیں اپنے لڑکوں ولڑکیوں کے شادی سے قبل جنسی تعلقات پر کوئی اعتراض نہیں اگر یہ تعلقات مستحکم (Steady) ہوں اور منع حمل تدابیر اپنائی جاتی رہیں۔ بڑی تعداد میں نوجوانوں نے اور زیادہ موثر اور کارگر امتناع حمل تدابیر کے بارے میں معلومات بہم پہنچائے جانے کی ضرورت پر زور دیا۔
- جنسی تعلیم کے بارے میں جو اعتراضات پہلے تھے وہ اب تقریباً بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ پہلے جنسی معاملات پر بات کرنا معیوب (Taboo) سمجھا جاتا تھا اب بیشتر جرمن خاندان بغیر کسی جھجک کے ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں۔
- پہلے کے نوجوان جب پہلی بار لَو میکنگ کرتے تھے تو بہ مشکل دس میں ایک منع حمل تدابیر استعمال کرتا تھا اب یہ معلومات اتنی عام ہو چکی ہیں کہ ہر نوجوان ان تدابیر کو اپناتا ہے۔ ان کے والدین میں ایک تہائی نے یہ بتایا کہ جب وہ اس عمر کے تھے تو کوئی ایسی تدابیر استعمال نہیں کرتے تھے۔
- فرانکفرٹ کی ایک پرائیوٹ فیملی پلاننگ تنظیم کا کہنا ہے کہ منع حمل تدابیر اپنائے جانے کی وجہ سے ہی جرمنی میں اسقاط حمل کے واقعات میں کمی ہوئی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ۲۱ ہزار نوجوان لڑکیوں نے اسقاط کرائے تھے جبکہ ۱۹۹۱ء میں یہ تعداد ۸ ہزار سے بھی کم ہوگئی۔
- ماہر جنسیات (Kluge) کا کہنا ہے کہ سیکس کے بارے میں اتنی بے جھجک بات چیت مہلک مرض ایڈس کے پھیلنے کی وجہ سے بھی ہوئی ہی جو زیادہ تر آزادنہ جنسی

تعلقات کی وجہ سے پھیلتا ہے۔

(۱۷) سوسن مارلنگ کی تحقیقات

ماہر سماجیات سوسن مارلنگ Susan Marling لکھتی ہیں کہ نزردرلینڈ میں نوجوان لڑکے ولڑکیاں کمسنی میں ہی اپنے والدین سے جنسی موضوعات پر کھل کر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ ایک ۱۳ سالہ لڑکی نے جب اپنا پہلا جنسی تجربہ اپنی والدہ سے بتایا تو خوشی کے مارے اس کی والدہ نے مٹھائی (Confetti) تقسیم کی۔ ایک ۱۷ سالہ لڑکے کی والدہ اس کیلئے کنڈوم خرید کر لے آتی ہے یہ بچے صاف دلی کے ساتھ انتہائی بے باکانہ انداز میں جنسی تعلقات، کنٹراسپشن اور جنسی طریق کار جیسے موضوعات پر اپنے والدین سے بات چیت کرتے ہیں۔ موصوفہ لکھتی ہیں کہ ''انکی یہ ہمت لائق ستائش ہے اور دوسروں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔'' یہی وجہ ہے کہ نزردرلینڈ میں نوجوان لڑکیوں میں استقرار حمل اور ابارشن کی شرح دوسرے مغربی ملکوں مثلاً انگلستان وغیرہ سے بہت کم ہے''۔ ایک نوجوان نے کہا:

"Everything Is Out In The Open Here. We All Know How
To Take Care Of Ourselves. Sex Is Good But
We Have To Be Careful"

ڈچ فیملی پلاننگ تنظیم کی طرف سے Rutgers فاؤنڈیشن میں جنسی تعلیم کے تحت نوجوانوں کو جنسی معلومات بہم پہنچانے کے لئے ٹیلی ویژن پر سیریل دکھائے جاتے ہیں جنہیں دیکھنے کے بعد آپس میں تبادلۂ خیالات ہوتا ہے اور سوال وجواب کے ذریعہ شکوک رفع کئے جاتے ہیں۔ سرما کی تعطیلات میں یہ مان لیا جاتا ہے کہ نوجوان ضرور مباشرت سے لطف اندوز ہوں گے، لہٰذا ان چھٹیوں سے قبل ٹی.وی پر مخصوص سیریل دکھائے جاتے ہیں جن میں احتیاطی تدابیر کے بارے میں پوری معلومات ہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ان پروگراموں کے ویڈیو کیسٹ کی زبردست مانگ ہے اور کالج میگزین میں بھی ان عنوانات پر مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

Rutgers فاؤنڈیشن کا قیام ۱۹۶۹ء میں عمل میں آیا تھا، یہاں جنسی کاؤنسلرس تعینات ہیں جو نوجوانوں کو مخصوص کاؤنٹر پر ضروری معلومات دیتے ہیں اور انکے شبہات کو

بھی رفع کرتے ہیں۔ حالانکہ نیدرلینڈ میں رضامندی کی قانونی عمر ۱۶ سال ہے لیکن ۱۲ سے ۱۶ سال کی عمر کے جو بچے مباشرت کرتے ہیں انکے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاتی۔ فاؤنڈیشن کے ذمہ داران نے بتایا کہ ۱۳ سال کی عمر کے صرف ۶ فیصدی بچے مباشرت کرتے ہیں اور ۱۷ سال کی عمر کو پہنچنے تک ۵۰ فیصدی نوجوان لڑکے ولڑکیاں اس فعل میں منہمک ہوجاتی ہیں۔ یہاں رائے عامہ نظریۂ عملیت (Pragmatism) سے متاثر ہوتی ہے نہ کہ اخلاق انگشت نمائی سے۔

(۱۸) کنیڈین جرنل آف پبلک ہیلتھ کی تحقیقات

کناڈا کے مختلف کالجوں اور اونٹریو کی دو یونیورسٹیوں میں طلبہ وطالبات سے اُن کی جنسی زندگی اور کنٹراسپشن کے متعلق ان کے رجحانات جاننے کے لئے ایک تحقیقاتی سروے کیا گیا جس کے نتائج کنیڈین جرنل آف پبلک ہیلتھ میں شائع ہوئے جس کے اہم انکشافات کا خلاصہ پیش ہے:-

* طلباء نے بتایا کہ وہ شادی سے قبل جنسی اختلاط میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن صرف اُن سے ہی جنہیں وہ بخوبی پیار کرتے ہیں۔
* 75 فیصدی طلباء نے اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ جس پارٹنر سے محبت کرتے ہوں اُس سے مباشرت کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتے۔ صرف 5 فیصدی طلباء نے Casual وقتی تعلق پر رضامندی کا اظہار کیا۔
* ہائی اسکول کی طالبات جنہیں جنسی تجربہ سے سابقہ نہیں پڑا 32 فیصدی تھیں اور انہوں نے اپنی پسند کا پارٹنر نہ ملنے کی وجہ سے اس فعل سے احتراز کیا۔
* بیشتر طالبات منع حمل تدابیر کے استعمال کی موافقت کرتی ہیں لیکن زیادہ تر نے یہ بتایا کہ انہوں نے پہلے جنسی تجربہ کے وقت اس کا استعمال نہیں کیا تھا۔
* ہائی اسکول کے طلباء میں 35 فیصدی نے پہلے جنسی تجربہ کے وقت ان منع حمل تدابیر کا استعمال نہیں کیا تھا اور 29 فیصدی نے عزل کی تدبیر استعمال کی۔
* تجربہ کار طلباء میں 22 فیصدی نے پہلے جنسی تجربہ کے وقت کسی بھی برتھ کنٹرول طریق کار کو نہیں اپنایا تھا۔

(۱۹) آسٹریلیا میں کی گئی جنسی تحقیقات

آسٹریلیا میں ۱۶ سے ۲۵ سال کی عمر کے غیر شادی شدہ نوجوانوں کا ایک جائزہ ۱۹۷۷ء میں لیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ 80 فیصدی سے زائد نوجوان شادی سے قبل جنسی اختلاط کی موافقت میں ہیں اور یہی رُجحان لڑکیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ سروے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ آسٹریلیا کی لڑکیاں امریکی اور برطانوی لڑکیوں سے زیادہ مانع حمل گولیاں استعمال کرتی ہیں اور شادی سے قبل جنسی اختلاط اور مانع حمل تدابیر کا پیٹرن عام طور پر بخوبی رائج ہو چکا ہے۔

(۲۰) دوسرے یوروپی ملکوں کے جائزے

سویڈن: جارج کارلسن (انسٹی ٹیوٹ آف اُپاسالا) نے شادی سے قبل جنسی اختلاط مردوں میں ۸۱ فیصدی اور عورتوں میں 65 فیصدی پایا۔ لڑکیوں میں اختلاط میں اضافہ گذشتہ ۵ سال میں سب سے زیادہ 60 فیصدی ہوا۔ 40 فیصدی دُلہنیں شادی کے وقت حاملہ ہوتی ہیں۔ **مشرقی جرمنی:** پروفیسر بورمین نے اپنے مطالعہ میں پایا کہ ۲۰ سال کی عمر تک ۸۳٫۵ فیصدی لڑکے اور ۷۸ فیصدی لڑکیاں شادی سے قبل جنسی تجربے سے گزر چکتی ہیں۔ **ڈنمارک:** کرسچین اور کاپنٹر نے اپنے جائزہ میں پایا کہ 64 فیصدی مرد اور 60 فیصدی عورتیں شادی سے قبل جنسی تعلقات میں ملوث ہو چکتی ہیں۔ **اٹلی:** گیبریلا پارکا نے اپنے جائزے میں یہ پایا کہ یہاں دُہرا اخلاقی معیار لاگو ہے۔ ۷۵ فیصدی مرد ایسی عورتوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں جو شادی سے قبل جنسی اختلاط میں مبتلا ہوں لیکن خود ۷۵ فیصدی مردوں نے یہ اعتراف کیا کہ وہ دوسری عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کر چکے ہیں جنمیں بیسوائیں بھی شامل ہیں۔

(۲۱) وکٹر۔ آئی۔ پیری ونڈسٹیو (Perevedentseve) کی تحقیقات

ویسے تو عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روسی معاشرہ مغربی معاشرہ کی بہ نسبت کافی صاف ستھرا اور پیورٹین (Puritan) ہے لیکن سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد مغربی

جنسی آزادی کی لہر نے روس کو بھی خاصی حد تک متاثر کر دیا ہے اور وہاں بھی ویسی ہی اخلاقی انحطاط کا دور دورہ ہے جس کے لئے مغرب پہلے سے ہی بدنام ہے۔ روس کے مشہور ڈیموگرافر بیری وِنڈسٹیو نے جو تحقیقات کیں اس کے کئی نتائج کافی چونکا دینے والے ہیں:

- شادی سے قبل نیز رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی اختلاط خوب پھیل چکا ہے اور بڑی تعداد میں نوجوان شادی سے ہی کترانے لگے ہیں تا کہ آزادانہ ذواتی کے مواقع حاصل رہیں۔
- 52 فیصدی طلبہ اور 14 فیصدی طالبات ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے تک ہی جنسی اختلاط کا تجربہ کر چکتی ہیں اور 34 فیصدی مرد نیز 50 فیصدی عورتیں ۱۹ سے ۲۱ سال کی عمر میں اس تجربہ سے گزر چکتی ہیں۔
- ہر 100 شادیوں میں ۲۸ طلاق میں ختم ہو جاتی ہیں اور ہر دس پیدائشوں میں ایک ناجائز ہوتی ہے۔

(۲۲) ڈاکٹر ولیم سائمن اور ڈاکٹر جان گیگون کی تحقیقات:

امریکی کیمپس پر جنسی شغل سے متعلق

ڈاکٹر سائمن اور ڈاکٹر گیگون نے امریکا کے ۱۲ مختلف کالجوں میں بارہ سو طلباء وطالبات کا جائزہ یہ معلوم کرنے کے لئے لیا کہ امریکا کے کالجوں میں جنسی انقلاب کی اصل نوعیت کیا ہے؟ اپنی تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جنسی انقلاب دراصل واقع ہوا ہے لیکن اُس کی وسعت کو کافی بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ آزازانہ جنسی تعلقات (Promiscuity) میں یقیناً اضافہ ہوا ہے اور اس کے حمایتی موثر انداز میں اُس کی وکالت بھی کر رہے ہیں۔ طلباء کے جنسی رُجحانات میں زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں بہ نسبت اُن کے برتاؤ کے اور رُجحان و برتاؤ میں جتنا تال میل اب ہے وہ کئی نسلوں کے بعد ہو پایا ہے۔ اب جنس کو صرف جنسی فعل تک ہی محدود نہیں رکھا جاتا بلکہ اُسے فرد کے کامل برتاؤ کا ایک جز مانا جاتا ہے۔ جنسی گہری دوستی اب سنجیدگی سے قائم کئے گئے تعلقات کے بعد ظہور میں آتی ہے نہ کہ محض سرسری ملاقات کے بعد۔ ڈاکٹر ریس (Reiss) نے یہ پایا کہ حالانکہ طلبا جنس کے بارے میں مجرمانہ احساسات (Guilty Feelings) رکھتے ہیں لیکن یہ مجرمانہ

احساسات عام طور پر اُن کے جنسی برتاؤ میں مانع نہیں ہوتے جب وہ اسے شروع کر دیتے تو جاری رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں انہیں پچھتاوا نہیں ہوتا بلکہ رفتہ رفتہ احساس جرم ختم ہو جاتا ہے۔

جنسی رُجحانات میں نمایاں تبدیلی جنس مونث میں زیادہ ہوئی ہے بہ نسبت جنس مذکر کے۔ جدید تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ گذشتہ دس بیس سال میں قبل از ازدواج جنسی اتصال میں ملوث ہونے والی طالبات کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ کالج کے سینئر سالوں میں پہنچنے تک طالبات کی بڑی تعداد اور طلباء کی اس سے بھی بڑی تعداد جنسی اختلاط کر چکی ہوتی ہے۔ حالانکہ دونوں صنفوں کی بڑی تعداد کالج کے ابتدائی دور میں اپنی دوشیزگی کو برقرار رکھتی ہے۔

اس سلسلہ میں کافی قیاس آرائی کی گئی ہے کہ مانع حمل گولیاں طلباء کو مباشرت پر آمادہ کرنے میں کافی معین ثابت ہوئی ہیں لیکن تحقیقات سے اس امر کی تصدیق نہیں ہوتی۔ بڑی تعداد میں شادی سے قبل استقرار حمل کے واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مانع حمل تدابیر لازمی طور پر مباشرت سے روکتی نہیں۔ ڈاکٹر گیگون کا یہ کہنا ہے کہ مانع حمل گولیوں کی وجہ سے لوگ جنسی اختلاط کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے بلکہ جب وہ فیصلہ کر لیتے ہیں تب جا کر گولیاں لے آتے ہیں۔

ڈاکٹر سائمن اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جنسی انقلاب ابھی اتنا ریڈیکل (Radical) نہیں ہوا ہے جتنا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ جدید نسل نے گذشتہ روایات سے برملا علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اس کا بڑا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب جنس کے موضوع پر کھل کر بات چیت کی جانے لگی ہے اب آئندہ نسل کہاں تک اس بات چیت کو عملی جامہ پہنچاتی ہے، یہ ایک کھلا ہوا سوال ہے؟

Billie Wright & Linda Weiner اپنی کتاب "The Lecherous Professor" میں لکھتے ہیں کہ امریکا میں ہر سال تقریباً ۱۰ لاکھ لڑکیاں اپنے پروفیسروں کی ہوسناکی کا شکار بنتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دراصل لڑکیاں اپنے گریڈ کے لئے اتنی فکرمند ہوتی ہیں کہ وہ ایسے پروفیسروں کے جنسی اقدام کی طرف خاطر خواہ دھیان دینے کے لئے مجبور ہوتی ہیں، اس لئے وہ زیادہ تر اپنے کو سپرد کر دیتی ہیں، حالانکہ دل سے وہ اس تعلق

کے لئے رضامند نہیں ہوتیں۔

برطانیہ کی مشہور و معروف آکسفورڈ یونیورسٹی کے کالجوں میں مخلوط تعلیم عرصہ سے رائج ہے اور فطرتی طور پر ان طلباء میں پٹنگ (Petting) کالج کے حدود میں۔ ڈائننگ ہال اور لائبریری میں بے باکی سے رائج ہے۔ حال میں (Passionate Petting) کے متعدد واقعات منظر عام پر ایسے دیکھنے میں آئے جس سے انڈر گریجویٹ اور اکیلے رہ جانے والے طلباء کو بڑا فرسٹریشن ہوا۔ چنانچہ Exeter کالج کے انڈر گریجویٹ طلباء نے میٹنگ کر کے یہ طے کیا کہ ایک (Sex Snoop) مقرر کیا جائے جو گشت کر کے ایسے مستقل ہیوی پٹنگ کرنے والوں کو متنبہ کرے۔ کچھ طلباء نے یہ بھی تجویز رکھی کہ اس دستہ کو ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔ طلباء نے یہ بھی طے کیا کہ ڈائننگ ہال میں ہیوی پٹنگ کی ممانعت ہونا چاہئے اور کامن روم کو دو حصوں میں بانٹ دینا چاہئے۔ ایک لائٹ پیٹنگ کے لئے دوسرا ہیوی پیٹنگ کے لئے! طلباء نے اس تجویز کی بھی موافقت کی کہ کالج کی لائبریری میں تین بجے شب سے آٹھ بجے صبح تک جنسی اختلاط کی بھی ممانعت کر دی جائے۔ کالج کی لائبریری میں مطالعہ کرنے سے بور ہو کر طلباء جنسی آسودگی کے لئے مباشرت میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ Valentine's کے دن ایسے منظر عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں۔

جان فانن لسے اسکاٹ کا کہنا ہے کہ آج کیمپس شادی کیلئے نہایت موثر مارکیٹ بن گیا ہے "College & Matrimony Combine To Render The Campus The Most Active Marriage Market In Modern Times"

جنسی ہوس کا شکار بچے بھی

معصوم و نوخیز بچوں پر جس قدر ظلم ترقی یافتہ اور امیر ملکوں میں ہو رہا ہے وہ عہد حاضر کی تاریخ کا عجیب و غریب المیہ ہے۔ امریکا کے چالیس فیصد بچے والدین سے محروم ہیں اور ایسے بچوں کی تعداد کم از کم سوا تین کروڑ (32 ملین) ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ یا تو یہ بچے ناجائز ہیں یا اُن کے والدین گھریلو جھگڑوں اور منشیات کی وجہ سے انہیں چھوڑ چکے ہیں۔ امریکہ میں کم از کم 25 لاکھ بچے ہر سال بڑوں کی جنسی ہوس کی بھینٹ چڑھ

جاتے ہیں...... چھوٹے بچوں پر جنسی تشدد کا تناسب کہیں زیادہ بڑھ گیا ہے اور ایک اندازے کے مطابق ہر سال پچاس لاکھ بچے اس تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ پورے امریکہ کی 28 فیصدی لڑکیاں 14 برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی درندگی کا شکار ہو جاتی ہیں جبکہ 18 برس کی عمر سے پہلے 38 فیصدی لڑکیاں ہوس کا نشانہ بنتی ہیں۔ یہ بچے زیادہ تر اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں مجرمانہ حملوں کا نشانہ بنتے ہیں۔(۱)

کولمبیا براڈ کاسٹنگ سروس کے پروگرام میں بتایا گیا کہ امریکہ میں 15 ملین بچے و بچیاں قریبی رشتہ داروں کی ہوسنا کی کا شکار (Incest) ہو چکی ہیں۔ ایسے بچوں کی تعداد جنہیں ان کے باپ چچا اور دوسرے قریبی رشتہ داروں نے اپنی ہوس کا شکار بنایا۔ ایک سے پانچ لاکھ کے درمیان بتائی گئی۔ جب انہیں ہوس کا شکار بنایا جاتا ہے تو وہ کم عمر کے ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اس معاملہ کی شکایت کس سے کی جائے اور جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں اور شکایت کرنے کی ہمت کرتے ہیں تب قانون کی رُو سے معاملہ بہت پُرانا ہو چکا ہوتا ہے۔

امریکی مصنفہ کیتھرین ہیریسن (Kathryn Harrison) کی چوتھی کتاب "The Kiss" کے نام سے حال ہی میں Random House پبلشر نے شائع کی ہے اس سے قبل اُن کے تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں مصنفہ نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہیں اور اسی میں تفصیل سے یہ روداد بھی لکھی ہے کہ جب وہ بیس سال کی تھیں تو کیسے اُن کے والد نے انہیں پھسلا کر اپنے دام میں گرفتار رکھا اور کیسے ان کا یہ ناجائز جنسی تعلق چار سال تک قائم رہا۔ اس کتاب کی اشاعت نے امریکی لٹریری حلقوں میں کافی ہلچل مچا دی۔ بعض تبصرہ نگاروں نے سچا اعتراف کئے جانے کی وجہ سے اُس کی تعریف کی اور بعض نقادوں نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا۔ ایک مبصر نے یہ سرخی قائم کی:

"Dating Your Dad"

مصنفہ نے اپنی روداد میں لکھا کہ وہ دس سال تک اپنی نانی کے پاس رہیں اور اپنے والد کو دیکھا بھی نہیں، کیونکہ انکے والد اور والدہ میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ اس لمبے عرصے میں جب وہ بیس سال کی ہو کر اپنے عنفوانِ شباب پر پہنچ گئیں تو ایک دن اُن کے

(۱) "یہ ہے مغربی تہذیب" از ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق۔ ص ۴۰-۴۴

والد نے انہیں دیکھا اور رخصت ہوتے وقت انہوں نے بھینچ کر انہیں پیار کیا جو پدرانہ پیار بہر حال نہیں تھا، اس پیار سے ''میں نے اتنی لذت محسوس کی کہ میں بالکل مدہوش ہوگئی اور میں نے اپنے کو کامل طور پر اُن کے سپرد کر دیا اور Incest کا یہ تعلق چار سال تک جاری رہا''۔ مصنفہ نے اپنی کتاب میں یہ جملہ بھی لکھا: "In Me He Found A Creature More Worthy Of Worship Than The Creator" اس جملہ پر ایک مبصر نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسز ہیریسن کو اس جملہ کے لئے World Narcissism Cup دیا جانا چاہئے! (TOI 14-9-97)

آسٹریلیا میں بچوں سے بدسلوکی کے یہ واقعات اتنے زیادہ بڑھ گئے کہ وہاں کی سینٹ کو یہ قانون وضع کرنا پڑا (جولائی ۱۹۹۴ء) کہ جو آسٹریلین سولہ سال سے کم عمر بچوں کے ساتھ بدسلوکی میں مرتکب پائے جائیں گے انہیں جیل کی سزا دی جاسکتی ہے۔ جس کی میعاد ۱۷ سال تک ہوسکتی ہے۔ اگر وہاں کے شہری ٹورسٹ دوسرے ملکوں میں ایسے افعال میں مبتلا ہوں گے تب بھی اُن پر آسٹریلیا کی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاسکے گا خواہ یہ فعل اُن ملکوں میں قابل تعزیر جرم نہ بھی ہو اور سیٹلائٹ سے ریلے کی گئی ویڈیو شہادت بھی اس سلسلہ میں قابل قبول ہوگی۔

جنسی ایذا رسانی کے واقعات امریکی حکومت کیلئے پریشانی کا باعث: صنعت کو خسارہ

اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے اور اس موضوع پر معقول ٹریننگ دیئے جانے کے باوجود امریکہ میں خواتین ورکرس کے ساتھ جنسی ایذا رسانی کے واقعات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ورکرس کا وقت ضائع ہونے سے ملکی صنعت پر بھی خراب اثرات پڑ رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے کئے گئے ایک سروے میں 44 فیصدی عورتوں اور ۱۹ فیصدی مردوں نے یہ بتایا کہ انہیں نہ چاہنے والی جنسی ہوسناکی کا ہدف بنایا جاتا ہے اُن سے فحش مذاق کیا جاتا ہے، اُن پر آوازہ کسی کی جاتی ہے اور چار فیصدی خواتین نے یہ بھی بتایا کہ اُن پر حملۂ مجرمانہ اور ریپ بھی کیا گیا۔ اس ایذا رسانی کیوجہ سے ورکرس کو جو بیماری کی وجہ سے جو چھٹیاں لینی پڑیں اُس سے کارخانوں کی پیداوار میں کمی کے باعث ملکی صنعت کو دو سال

کے عرصہ میں ۱۹۹۴ء-۱۹۹۲ء 327 ملین ڈالر کا خسارہ اٹھانا پڑا۔

امریکہ میں ملک گیر پیمانے پر کئے گئے ایک مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ وہاں 28 فیصدی کالج کی لڑکیاں ۱۴ سال کی عمر سے ہی ریپ یا ریپ کی کوشش کا شکار ہوجاتی ہیں۔ مسز میری کوس (Mary Koss) جو اس مطالعہ کی رپورٹ کو مرتب کرنے میں شریک تھیں انہوں نے جرنل آف کنسلٹنگ اینڈ کلینکل سائکالوجی میں لکھا کہ ''مجھے یقین نہیں ہوتا تھا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑکیاں شروع سے ہی جنسی ہوسناکی کے اقدام و تشدد (Intimate Sexual Violence) کا شکار ہوجاتی ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں انہیں ایسی ایذا رسانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔

ڈاکٹر الان گلمور (Alan Gilmour) ڈائریکٹر سوسائٹی فار پری وینشن آف کروئیلٹی ٹو چلڈرن کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں جن بچوں کو جنسی طور پر ایذا پہنچائی جاتی ہے اُن میں ۱/۵ پانچ سال سے کم عمر کے ہوتے ہیں اور کچھ تو ایک سال کے بچے ہوتے ہیں اور اس قسم کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے اور مزید تشویش کا امر یہ ہے کہ ایسے بچوں کی اوسط عمر کم میں ہوتی جارہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس ایذا رسانی کے بعد بچوں پر دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بسا اوقات وہ جرائم کی راہ پر نکل جاتے ہیں، اس سلسلہ میں پبلک کے شعور کو اور زیادہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔

برطانیہ کے چلڈرن ہوم جرائم کی نرسری بن گئے ہیں جہاں منتظمین نہ صرف خود بچوں پر جنسی تشدد کرتے ہیں بلکہ اُن سے جسم فروشی بھی کراتے ہیں۔ بعض اداروں کو باقاعدہ قحبہ خانوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے...... ہر بڑی عمر کا بچہ چھوٹوں پر جنسی تشدد کرتا ہے اور تشدد کا نشانہ بننے والے اکثر بچوں کی عمر دس سال سے کم تھی۔

ماڈرن جاپان میں سیکس کا بزنس فروغ پر

جاپان میں سیکس کے بارے میں کھلے رجحانات کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ صدیوں سے وہاں زرخیزی اور لنگ (Phallic) کی پوجا تہواروں کے موقعہ پر کی جاتی رہی ہے اور سیکس کے بارے میں مذہبی امتناعی اُمور (Taboos) وہاں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکے۔ ۱۹۵۶ء تک وہاں قحبہ گری پر کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی تھی اور اس پابندی کے نفاذ کے

بعد بھی سیکس کے بزنس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

صدیوں سے سیکس کے بارے میں آزاد نظریات اور اِدھر دولت کی ریل پیل نے وہاں سیکس کو ملٹی ڈالر بزنس بنادیا ہے جو ہر قسم کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ٹوکیو کے Kabukicho ڈسٹرکٹ میں لوگ سڑکوں کیکنارے کھڑے ہو کر اسٹرپ ٹیز کلب کے اشتہارات تقسیم کرتے ہیں یا قحبہ خانوں کے لئے گاہکوں کو کھلے بندوں ترغیب دیتے ہیں۔ایسے کلب جہاں کمسن لڑکیوں سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے سڑکوں کے کنارے واقع ہیں اور یہ سب کچھ پولیس کے خوف کے بغیر کھلم کھلا ہوتا رہتا ہے!

جاپان میں سیکس بزنس نے اتنی وسعت اختیار کرلی ہے کہ آپ کو کہیں ڈھونڈنے نہیں جانا ہے، سارا مسالہ آپ کے میل باکس میں ہی موجود ملے گا۔ My Love Is Free جیسے عنوانات سے وڈیوز کے ٹائٹل، پوسٹ کارڈ سائز کے مساج پارلرس کے اشتہارات، اسٹرپرس کے رنگین عریاں فوٹو سب آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ویسے تو شہوت رانی کا کاروبار ساری دُنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن جاپان میں اس نے جو وسعت اختیار کرلی ہے اُسے دیکھ کر دوسرے ملکوں کے پورنوگرافرس اور کٹنیاں رشک کرتی ہیں۔میل باکس کے یہ اشتہارات جو Pink Chirashi کہلاتے ہیں گراسری اسٹورس اور سب ویز پر مل جاتے ہیں۔ وڈیو شاپس پر فیملی فلموں کے ساتھ ہی "بالغوں کے لئے" ٹیپس کی بھی نمائش ہوتی ہے۔حالانکہ ان اشیاء کی اتنی بے باک نمائش کو سب ہی لوگ پسند نہیں کرتے اور کئی حلقوں سے یہ آواز اٹھائی جاچکی ہے کہ بچوں کی نظروں سے اس قسم کی اشیاء کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے چائلڈ پراسٹی ٹیوشن کو بڑھاوا ملتا ہے۔لیکن بیشتر افراد پراسٹی ٹیوشن کو زندگی کی ایک حقیقت تسلیم کرتے ہیں بلکہ غیر شادی شدہ عورتیں جو تنہا رہتی ہیں انہیں Promiscuous ہی سمجھا جاتا ہے۔ٹی وی پر عریانیت کے مظاہرے عام ہیں۔لیکن پبلک مقامات پر بوس وکنار کو شاکنگ سمجھا جاتا ہے۔

اڈلٹ وڈیو بزنس ملک کے عریانیت سے متعلق قوانین کا مذاق اُڑاتا ہے۔ ایک اخلاقی (Ethics) کمیشن ہے۔ یہ ہر سال پانچ ہزار ٹائٹل منظور کرتا ہے لیکن اس انڈسٹری کا سب سے تیزی سے بڑھتا ہوا سیکٹر غیر قانونی آزاد وڈیوز ہیں جو کامل برہنگی کے مظاہرے بے جھجک کرتے ہیں اور ایسے غیر قانونی ٹیپ ہر سال ایک ہزار سے زیادہ تیار

کئے جاتے ہیں۔قانون کی رُو سے یہ اخلاقی کمیشن کی مہر کے بغیر فروخت نہیں کئے جاسکتے لیکن فی الواقع یہ خوب فروخت ہوتے رہتے ہیں۔ جیک پروڈکشن کمپنی پانچ سوایسے وڈیو ٹیپ ہر سال تیار کرتی ہے اور ۴ بلین ین (Yen) (31.7 ملین ڈالر) نفع کماتی ہے! Kabukicho میں پچاسوں دوکانیں ایسے غیر قانونی ٹیپ فروخت کرتی ہیں اور خفیہ ڈلیوری کا بھی انتظام رہتا ہے۔حالانکہ یہ قانوناً جرم ہے لیکن پولیس کی نظریں بچا کر یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔(TOI 3-6-97)

ٹوکیو کے ایک ذمہ دار افسر کا کہنا ہے کہ یہاں جنس کو ایک تجارتی سامان کی طرح سمجھا جاتا ہے Sex Is Being Treated As Merchandis جو لڑکیاں اسے فروخت کرتی ہیں وہ بھی ایک بڑا مسئلہ ہیں جیسے کہ وہ مرد جو اسے خریدتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جنسی بے راہ روی (Licentiousness) حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہائی اسکول کی لڑکیاں پارٹ ٹائم پراسٹی ٹیوشن میں مصروف پائی گئیں جس پر کافی واویلا ہوا۔سیکس کلب میں کمپیٹیشن کافی تیز ہوجانے کی وجہ سے یہ کلب مزید وحشیانہ (Wild) پروگرام۔ وہ بھی ٹین ایج گرلس سے کم معاوضہ پر۔ پیش کرنے لگے ہیں۔ اسٹرپرس اور پارن ایکٹرس کو تربیت ٹریننگ دینے کے لئے اسکول قائم ہیں کیونکہ یہ کلب اب کوالیٹی آف گرلز پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔

جاپان میں جنسی خوش فعلی کے لئے ایسے ٹیلی کاسٹ Telecast کلب بھی قائم کئے گئے ہیں جہاں انجان مرد و زن کو متعارف کرایا جاتا ہے۔آپ اطمینان سے وہاں گفتگو کرسکتے ہیں اور آئندہ ڈیٹنگ کا پروگرام متعین کرسکتے ہیں۔ کمرشیل ڈسٹرکٹ میں بڑی عالیشان اُونچی عمارتوں میں ایسے ٹیلی کاسٹ بوتھ قائم ہوتے ہیں جہاں سیر و تفریح کے پروگرام طے کئے جاسکتے ہیں۔

سوشلسٹ ممالک بھی جنسی آزادی کی چپیٹ میں

سوشلزم میں شروع سے ہی فرائیڈ اور ہیولاک ایلس کے جنسی نظریات اور سائکو تھیراپی نیز جنسیات کو تیکھی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ فرائیڈ ازم دراصل آزادانہ جنسی زندگی گزارنے اور سرمایہ دار ملکوں میں پھیلی ہوئی جنسی بے راہ روی

پورنوگرافی، نیز دوسری اخلاقی برائیوں کے لئے صرف ایک توجیہہ ہے۔ لیکن اب روس اور چین میں بھی جنسی آزادی کی لہر آ گئی ہے اور نئے گلیس ناٹ (Glasnot) کو بڈ روم میں بھی نافذ کیا جا رہا ہے۔ چین میں اب بیجنگ اور شنگھائی میں سائکوتھیراپی کلنکس کھولنے کی قانونی اجازت دے دی گئی ہے اور دماغی امراض کے بارے میں اب کھل کر بات کی جانے لگی ہے۔ روس میں سنسرس سے دس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد پروفیسر ایگور ایس کان (Igor S. Kan) کو اپنی کتاب "An Introduction To Sexology" شائع کرنے کی اجازت مل گئی۔ پروفیسر کان نے عوام میں جنسی معاملات سے متعلق عدم واقفیت کے لئے روسی حکام کو ذمہ دار قرار دیا۔ روسی وزارت صحت ملک میں بڑھتے ہوئے اسقاط حمل، طلاق وتفریق کے واقعات نیز ایڈس کے کیسس سے متفکر ہے اور اسی لئے اب وہاں سیکس کلنکس کھولنے کی بھی اجازت دی جا رہی ہے۔ چین میں اسکولی بچوں کو جنسی تعلیم دئے جانے کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے کیونکہ ان اُمور سے ناواقفیت انہیں متعدد جنسی اُلجھنوں میں ڈال دیتی ہے۔

روسی ڈیموگرافر Victor I. Perevedentsev کا کہنا ہے کہ روسی معاشرہ اب تقریباً انہیں جنسی اُلجھنوں اور ازدواجی افراتفری میں مبتلا ہے جیسا کہ مغربی معاشرے پہلے ہی سے تجربہ کر رہے ہیں۔ اعداد و شمار کی روشنی میں انہوں نے بتایا کہ روس میں اب ہر سو شادیوں میں ۴۸ طلاق میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر دس پیدائشوں میں ایک ناجائز ولادت ہوتی ہے اور نوجوانوں میں شادی سے قبل نیز رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی اختلاط اب کوئی استثنائی واقعہ نہیں رہ گیا ہے بلکہ معمول بن گیا ہے اور بڑی تعداد میں نوجوان شادی سے ہی کترانے لگے ہیں کیونکہ شادی سے باہر انہیں آزادانہ ذواق کے بیشمار مواقع مہیا ہیں۔ ۵۲ فیصدی طلباء اور ۴۱ فیصدی طالبات کو ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے تک ہی پہلا جنسی تجربہ حاصل ہو جاتا ہے۔ باقی طلباء وطالبات ۱۹ سے ۲۱ سال کی عمر میں اس تجربے سے گزر چکتے ہیں۔

چین میں تقریباً پچیس سال قبل سوشلسٹ اخلاقیات کے زیر اثر امراض جنسی کا لگ بھگ بالکل خاتمہ کر دیا گیا تھا لیکن اب یہ بھی جنسی آزادی کے انقلاب کے لپیٹ میں ہے۔ تیس سال تک لوگوں کو پُرانی فیوڈل اخلاقی قدریں چھوڑ دینے اور نئی انقلابی خوبیوں کو اپنانے کی تلقین کی گئی لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد سے لوگوں نے اُن کمیونسٹ قدروں کو بھی پس

پست ڈال دیا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں بیجنگ یونیورسٹی میں طلباء نے ایک پوسٹر آویزاں کیا جس پر لکھا گیا: ”آزاد محبت کی اجازت دی جائے، ایک بلین افراد کی جنسی خواہشات پر لگائی گئی پابندیاں ہٹائی جائیں“۔

Allow Free Love: End The Sexual Repression Of One Billion People (کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ایسا ہی پوسٹر ۱۹۶۹ء میں آویزاں کیا گیا تھا)۔

جبکہ ایڈس جیسے مہلک مرض کے خوف سے مغرب میں پاکدامنی پھر سے اپنائی جانے لگی ہے۔ کمیونسٹ چین میں جنسی انقلاب تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ملک کے مشرقی شہروں میں آزادانہ جنسی اختلاط، بیسوائی اور ہم جنس پرستی تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے جس کے نتیجہ میں طلاق کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے اور امراض جنسی بھی بڑھ رہی ہے۔ پورنوگرافی اسکولی بچوں کو غلط راہوں پر ڈال رہی ہے۔ شہر کینٹن میں بیسوائی کھلم کھلا جاری ہے اور یہاں ایک ایسا شبینہ کلب بھی ہے جہاں ہم جنس پرستی کا ذوق رکھنے والوں کی تسکین کا بھی انتظام ہے۔ متعدد رکاوٹوں کے باوجود لاکھوں چینی شادی شدہ جوڑے ایک ساتھ رہ رہے ہیں اور بعض شہروں میں ۸۰ فیصدی تک اباراشن غیر شادی شدہ لڑکیاں کراتی ہیں! امراض جنسی کے کیسس ناقابل حد تک بڑھ گئے ہیں۔ ایک سماجی مبصر کا کہنا ہے کہ اس جنسی انقلاب کا اصل سبب وہ اخلاقی خلا "Moral Vacuum" ہے جو پورے ملک میں پھیل گیا ہے!

چین کی حکومت اب بھی اس آزاد جنسی لہر کے خلاف ہے اور شادی سے قبل جنسی اختلاط کو سخت معیوب مانتی ہے اسی لئے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے (مئی ۱۹۹۶ء میں) کہ جو جوڑے شادی سے قبل جنسی اختلاط میں مبتلا پائے جائیں گے اُن پر دو سو سے دو ہزار یوان (Yuan) (24 سے 240 ڈالر) تک جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ شادیوں کے رجسٹرار جنرل کا کہنا ہے کہ شادی سے قبل جنسی تعلقات پر کنٹرول عائد کرنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ چین میں شادی سے قبل طبی معائنہ کرایا جاتا ہے اور اگر ڈاکٹر کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ لڑکی کنواری نہیں رہی ہے تو وہ رجسٹرار آفس کو مطلع کر دیتا ہے جو جرمانہ کا نفاذ کرتا ہے۔ ایک یونیورسٹی کے پروفیسر قانون نے اسے عورت کے حقوق پرائیوسی (Privacy) کے خلاف

قرار دیا لیکن حکومت تحقیق سے اسپر عمل کر رہی ہے اور Trial Cohabitation کے طرزِ عمل کو چلنا چاہتی ہے۔

کیوبا (Cuba) میں جوان لڑکیاں سیکس کو بالکل کھیل کی طرح سمجھ رہی ہیں۔

سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۳ سے ۱۸ سال کی عمر کی 30 فیصدی لڑکیاں ایک ہفتہ میں تین تین مختلف بوائے فرینڈس سے جنسی مباشرت سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ دارالسلطنت ہوانا میں ایسے ہوٹل کھل گئے ہیں جہاں ایئر کنڈیشنڈ کمرے تین گھنٹہ کے لئے ۸ ڈالر میں مل جاتے ہیں۔ ایک لڑکی جب وہ ایسے ہوٹل سے نکل رہی تھی تو اُس نے کہا کہ اگر میری ماں کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ مجھے مار ڈالیں گی۔ میں کبھی اُن سے سیکس کے موضوع پر بات نہیں کر سکتی ہوں۔ انہوں نے مجھے صرف یہ بتایا ہے کہ اگر میں ایسا کروں گی تو حاملہ ہو جاؤں گی اور تب وہ مجبور ہو کر میری شادی کر دیں گی۔

ماہرین سماجیات 'فری لو' کے اس انقلاب سے فکر مند ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے ناجائز استقرارِ حمل اور طلاق کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ ۱۸ سے ۲۲ سال کی عمر کے بیشتر شادی شدہ جوڑوں کی شادیاں اوسطاً صرف ایک سال تک چل پاتی ہیں۔

ایشیائی ملکوں کے نوجوانوں نے بھی
روایتی قدروں کو پس پشت ڈال دیا

جس طرح ۱۹۶۰ء کے دہے میں پاپ کلچر کی لہر نے یورپ و امریکا کے نوجوانوں کو معاشرہ سے بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا اُسی طرح اب ایشیا کے ملکوں کے محفوظ معاشروں (Sheltered Socities) میں بھی قدیم قدروں سے بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں خواہ اُس کا سبب ملٹی کلر سٹیلائٹ ٹی وی کے پروگرام ہوں یا فری ٹریڈ کا فروغ۔ اب وہی نظریات اور قدریں جو مغربی ملکوں میں چھائی ہوئی ہیں یہاں بھی رائج ہو گئی ہیں۔ ایشیا کے نوجوان قدیم قدروں جیسے باہمی اتحاد، فرائض کی ادائیگی اور والدین کے ادب و احترام کو ترک کرتے جا رہے ہیں اور انہیں برائیوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں جنہوں نے مغرب کو گمراہ کر رکھا ہے یعنی جنسی انارکی، تلذذ بالمثل، نشلی ادویات کا ناروا استعمال اور راک اینڈ رال! ۱۹۹۱ء کے بعد سٹیلائٹ ٹی وی کے پھیلنے کے بعد یہاں کے متمول

گھرانوں کے نوجوانوں کی قدروں میں ڈرامائی انداز میں تبدیلیاں ہوئیں۔ سٹیلائٹ ٹی وی نے ان نوجوانوں کے جنسی ادراک کو بالکل مسخ (Distort) کر دیا ہے اب نوجوان جنس کے بارے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ضبطِ نفس اور حدود کے دائرہ میں رہ کر اپنی خواہشات کی تکمیل کرنا۔ یہ سارے تصورات اب فرسودہ قرار پا چکے ہیں۔

فلپائن کے نوجوان بگی پہنتے ہیں Hip Hop فیشن اختیار کرتے ہیں جس نے بہت سے امریکی والدین کو بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ ملاشیا کی کثیر مسلم آبادی والے ملک میں بیگنی رنگ کے بالوں والے نوجوان اپنے والدین سے قینچی کی طرح زبان چلاتے ہیں۔ اور بنگلا دیش و تھائی لینڈ کے نوجوان Ecstasy جیسی ڈیزائنر ڈرگس اور افیون کا شوق کرتے ہیں۔ تھائی لینڈ کے باشندوں میں Amphetamines کا شوق معاشرہ کے ہر طبقہ میں ـــ یہاں تک کہ اسکولی بچوں اور بدھسٹ مانکس میں پھیل گیا ہے۔ چین اور ویٹ نام جیسے ملکوں میں جہاں نسبتاً سخت ڈسپلن ہے وہاں بھی نوجوان اپنے بڑوں کی قدروں کا مذاق اُڑاتے ہیں اور سٹیلائٹ ٹیلیویژن پر پُرشہوت Babywatch ماڈل دیکھ کر اور پاپ میوزک سن کر خوشی سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ جاپان کے بڑھتے ہوئے تمول نے ۱۲-۱۳ سال کی کم عمر بچیوں کو "Lolita Complex" کے زیرِ اثر بردہ فروشی پر آمادہ کر دیا ہے اور ادھیڑ عمر کے لوگوں سے وصول کی گئی نقد رقم سے فیشن ایبل کپڑے اور دوسرے سامانِ تعیش کی خرید کی جاتی ہے۔

ہندوستان

عالمی ادارۂ صحت نے دہلی سوشل ویلفیئر بورڈ کے تعاون سے دہلی کے متمول خاندانوں کی طالبات کا ایک سروے کیا جو یہاں کے اونچے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتی ہیں تو نتائج بڑے ہی چونکا دینے والے سامنے آئے۔ معاشرہ کے اس اونچے طبقہ کے بیشتر والدین اپنی دختران کی 'کارگزاریوں' سے ناواقف ہوتے ہیں۔ پچاس فیصدی طالبات نے اعتراف کیا کہ وہ مستقل طور پر مانع حمل تدابیر اور گولیوں کا استعمال کرتی ہیں اور انکے چہروں پر شرم وندامت کے احساسات بالکل نہ تھے، اس کے برعکس انہوں نے فخر سے کہا کہ وہ ایک آزاد سوسائٹی کی آزاد چڑیاں (Free Birds) ہیں

اور عصمت آپی جیسے فرسودہ تصورات میں بالکل یقین نہیں رکھتیں۔ دہلی کے پانچ اسٹار ہوٹلوں میں کال گرل کے فرائض ادا کرنے والیوں میں اکثریت ان طالبات کی ہوتی ہے۔ بیشتر طالبات نے بے جھجک تسلیم کیا کہ وہ محض لطف (Fun) کے لئے اس بزنس میں شریک ہوتی ہیں اور اس سے انہیں کچھ پاکٹ منی بھی مل جاتا ہے۔ سولہ سے اکیس سال کی عمر کی طالبات ایسی فن پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں جو رات دو بجے تک چلتی رہتی ہیں۔ ہر ششم لڑکا یا لڑکی جنسی مرض میں مبتلا رہتا ہے۔ اِن نوجوانوں کے سامنے زندگی کا کوئی واضح نصب العین نہیں ہے اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ کدھر جا رہے ہیں؟

نوجوانوں کا یہ رُجحان اور کردار صرف دہلی تک محدود نہیں ہے بلکہ بمبئی، کلکتہ، بنگلور اور مدراس بلکہ ہر میٹرو پالیٹن شہر میں پھیل رہا ہے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش بے سود ہے۔ انڈین مارکٹنگ ریسرچ بیورو نے ملک کے چار بڑے میٹرو پالیٹن شہروں کی یونیورسٹیوں کے طلباء کا جائزہ لیا تو 22 فیصدی طلباء نے یہ تسلیم کیا کہ وہ جنسی اختلاط سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، لڑکیوں میں صرف ایک فیصدی نے یہ تسلیم کیا (سروے رس نے اسے لڑکیوں کے شرمیلی پن کی وجہ سے اخفاء پر محمول کیا) تیرہ فیصدی لڑکوں نے بیسواؤں کے پاس جانا بھی تسلیم کیا۔ مدراس میں یہ تعداد سب سے زیادہ یعنی ۲۲ فیصدی تھی۔ ڈاکٹر ڈی۔ نرائن ریڈی نے مدراس کے کالجوں میں ایسا ہی ایک جائزہ لیا تو انہیں حیرت ہوئی کیونکہ 52.2 فیصدی طلباء نے جنسی تلذذ کا اعتراف کیا۔ طلباء کی اکثریت نے یہ رائے ظاہر کی کہ سیکس پر کھل کر بات چیت ہونا چاہئے نہ صرف لڑکوں کے گروپس میں بلکہ لڑکوں اور لڑکیوں کے مشترکہ گروپس میں بھی۔ طلباء کی اکثریت (75.71 فیصدی) جنسی تعلیم کے موافقت میں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تعلیم اسکول میں ہی دی جانا چاہئے۔ 57.89 فیصدی طلباء نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اروٹک آرٹ اور پورنوگرافی سے اُن کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ایم دوبے اور ڈاکٹر آنند دوبے (رائے پور) نے اپنی تحقیقات میں طلباء میں قبل از ازدواج جنسی اختلاط 18.1 فیصدی پایا۔ سروے کئے جانے والوں میں 87 فیصدی اسکول جانے والے لڑکے و لڑکیاں تھیں۔ 59 فیصدی لڑکے اور 23 فیصدی لڑکیاں جو جنسی اختلاط میں مبتلا ہوئیں وہ کمسن تھیں۔

ڈاکٹر نرائن ریڈی ڈائریکٹر ڈیگا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس نے وہاں کے دس

ہزار نوجوانوں کی جنسی زندگی سے متعلق تحقیقات کیں اور اپنے نتائج ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس میں "Urban Sexuality" پیپر میں پیش کئے۔ ان کے اہم انکشافات حسب ذیل تھے:

* ۴۰ فیصدی نوجوان شادی سے قبل نیز رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی مباشرت کر چکتے ہیں 31.04 فیصدی نوجوان ۱۵ سے ۲۰ سال کی عمر میں اور 42.64 فیصدی نوجوان ۲۱ سے ۲۶ سال کی عمر میں اس مرحلہ سے گزر چکتے ہیں۔
* شادی سے قبل جن سے جنسی اختلاط کیا گیا اُن میں سرفہرست بیسوائیں تھیں اور اُس کے بعد خونی رشتہ دار، پڑوسی اور پھر دوسرے اجنبی افراد تھے۔ یہ تجربہ ہم جنسوں سے بھی رہا۔
* جائزے میں جن 3,948 افراد نے جنسی اختلاط کا اعتراف کیا اُن میں 66.59 فیصدی کے ۶ پارٹنر، 10.82 فیصدی کے ۱۳ پارٹنر اور 7.98 فیصدی کے ۲۰ تک پارٹنر تھے اور 0.94 فیصدی کے پارٹنرس کا شمار 100 سے 200 تک تھا!
* جنسی اختلاط کرنے والوں میں 97.21 فیصدی لوگوں نے تحفظ کے لئے کنڈوم بھی استعمال نہیں کئے جسکا نتیجہ جنسی امراض اور ایڈس کی شکل میں سامنے آچکا ہے اور بڑی تعداد میں لوگوں نے اعتراف کیا کہ وہ ان امراض میں مبتلا ہیں یا رہ چکے ہیں۔ ایک دوسرے جائزے سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ 13.45 فیصدی نوجوان جنسی امراض میں ملوث ہیں۔
* بڑی تعداد میں نوجوانوں نے بتایا کہ انہیں جنسی معاملات کا علم اپنے دوستوں یا کتابوں سے ہوا اور چونکہ اُن کے دوست خود ان اُمور سے ناواقف تھے، اس لئے وہ ان امراض میں مبتلا ہو گئے۔ (Tol 13-12-94)

ہندوستان کے تعلیم یافتہ شہریوں کی جنسی زندگی سے متعلق ایک مطالعہ جرنل آف فیملی ویلفیئر (مارچ ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا جس سے یہ انکشاف ہوا کہ ۱۴۲۴ اشخاص سے جب ایک سوالنامہ کے ذریعہ انکے جنسی کردار کے بارے میں دریافت کیا گیا تو یہ معلوم ہوا۔

* 81 فیصدی افراد نے یہ اعتراف کیا کہ انہوں نے شادی سے قبل جنسی اختلاط کیا۔
* 55 فیصدی شادی شدہ افراد نے بتایا کہ انہوں نے اپنی ساتھیوں، دوستوں اور

دوسری جاننے والیوں سے یہ تعلق قائم کیا۔

* 39 فیصدی افراد نے کم از کم پانچ ایسے پارٹنر سے، 28.2 فیصدی نے پانچ سے دس پارٹنر سے، اور 29 فیصدی نے دس سے بھی زیادہ پارٹنر سے یہ تعلق قائم کیا۔

(TOI 25.8.94)

جنسی آزاد معاشرہ کی تشکیل کی حمایت

سابق مرکزی وزیر شری وسنت ساٹھے نے اپنے ایک مضمون (السٹریڈ ویکلی آف انڈیا ۲۱۔۲۷ رجون ۱۹۸۷ء) میں جنسی تعلق اور ماں کے تصور کو علیحدہ کرنے کی پُرزور حمایت کی اور لکھا کہ ہمارے معاشرہ میں ناجائز اولاد کی پیدائش سے کلنک لگنے کا جو تصور وابستہ ہے اُسے بھی ختم کیا جانا چاہئے۔ ہزاروں سال سے لوگوں کے ذہن میں یہ پیوست کر دیا گیا ہے کہ سیکس گناہ ہے جس کا اثر ہمارے نوجوانوں پر اچھا نہیں پڑا۔ ضرورت ہے کہ انہیں سیکس کے دبائے جانے کی فرسودہ تعلیمات سے چھٹکارا دلایا جائے۔ انہوں نے اسقاطِ حمل کی بھی موافقت کی اور کہا کہ عورت کو یہ اختیار دیا جانا چاہئے کہ اگر وہ چاہے تو اُسے ضائع کر دے۔ انہوں نے بیسوائی کو بھی سراہا اور پوچھا کہ اس میں غیر اخلاقی کیا ہے؟ آج کل لوگوں کو اپنے گھروں سے دور سفر کرنا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں وہ جنسی آسودگی کہاں حاصل کریں؟ ہمیں ایسے معاشرہ کی تشکیل کرنا چاہئے جہاں دو مذکر و مونث افراد آپس میں جسمانی اتصال سے خط اٹھا سکیں اور دو جسموں کے اس حسین اتصال کا (Beautiful Act Of Togetherness) شادی سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے''۔

نیپال

ڈاکٹر بجے لال گروبھا چاریا نے نیپال کے گھنی آبادی والے تین اضلاع میں نوجوانوں کا ایک جائزہ لیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نیپال میں شادی سے قبل اور رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلقات کے واقعات کثرت سے بڑھ رہے ہیں۔ ایک سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے موصوف نے بتایا کہ کاٹھمنڈو، چتون اور سنساری کے ضلعوں میں ۱۹ فیصدی نوجوان شادی سے قبل جنسی اختلاط میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ ۵ فیصدی تو ۱۴ سال کی عمر سے ہی جنسی طور پر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ ۱۶ فیصدی افراد شادی کے بعد بھی

باہر جنسی تعلق بنائے رکھتے ہیں۔ اسکے نتیجہ میں ٹین ایج حمل اور جنسی امراض میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ کم عمری کے یہ حمل غیر منصوبہ بند اور اَن چاہے (Unwanted) ہوتے ہیں لہٰذا معاشرہ پر اس کے اور بھی دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں، کیونکہ ملک کی آبادی جو اس وقت ۲۱ ملین ہے، آگے مزید تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

جنس کے متعلق قوانین میں تبدیلیاں

موجودہ آزاد معاشرہ آزادی نیز بے راہ روی پر کس حد تک گامزن ہو چکا ہے اس کا اندازہ قانون میں کی گئی اُن تبدیلیوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو کئی مغربی ملکوں میں عمل میں آئیں۔ مغرب کا آزاد معاشرہ پہلے وضع کئے گئے قوانین کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھتا ہے لہٰذا تیزی کے ساتھ ان قوانین میں تبدیلیاں کی جا رہی ہیں تا کہ آزادانہ ذواتی کی راہ پر بغیر قانونی رکاوٹ کے چلا جا سکے۔ برطانیہ کی والفنڈن کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''شہریوں کی نجی زندگی میں قانون کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ یہ قانون کا دائرۂ عمل ہے کہ وہ شہریوں کے لئے کوئی متعین راہِ عمل 'Pattern Of Behaviour" طے کرے سوا اس صورت میں جہاں مفادِ عامہ یا شہریوں کے تحفظ کا سوال ہو''۔ اسی کمیٹی نے مزید لکھا کہ:

> ''ہماری منشا ہے کہ قانون ہر ایسے فعل کو جرم قرار دیتا ہے جسکا ارتکاب ایسے کھلے مقامات پر کیا جائے جہاں پبلک کے عام افراد اُسے دیکھ کر ناگواری محسوس کریں۔ لیکن جہاں ایسی عام ناگواری کا امکان نہ ہو وہاں یہ افراد کی ذاتی ذمہ داری کا معاملہ ہو جاتا ہے اور ہماری رائے میں یہ قانون فوجداری کی مناسب حدود سے باہر ہے''۔

مغربی جرمنی میں بھی جنسی زندگی سے متعلق قوانین میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ حکومت کی یہ رائے ہے کہ شہریوں کی پرائیوٹ لائف میں حکومت کو مداخلت نہ کرنا چاہئے اور وہ جس طرح بھی اپنی زندگی گزارنا چاہیں انہیں مکمل آزادی ہونا چاہئے۔ وہاں بیویوں کو بدلنا اور گروپ سیکس کو بھی برداشت کیا جانے لگا ہے، البتہ جو شوہر اپنی بیوی کو اس کے لئے مجبور کرے گا یا پیسہ وصول کرے گا وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

حکومت برطانیہ نے ملک میں جنس سے متعلق جرائم کا جائزہ لینے کے لئے جو کرمنل لا رویزن کمیٹی (Criminal Law Revision) تشکیل کی اس نے بعض ایسی تجاویز پیش کیں جو انتہائی مذموم ہیں۔ اُن میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ اگر بھائی بہن بدکاری میں ملوث ہوں اور اُن کی عمر ۲۱ سال سے متجاوز ہو تو اسے جرم نہ قرار دیا جانا چاہئے۔ ایک دوسری تجویز یہ تھی کہ باہمی رضامندی سے سوڈامی کی عمر ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۶ سال کر دی جانا چاہئے۔ (۱) سکشول لا ریفارم سوسائٹی نے 'لولیٹا چارٹر' (Lolita Charter) کی مانگ کی جس میں رضامندی کے لئے لڑکیوں کی عمر ۱۶ سال سے گھٹا کر ۱۴ سال کر دینے کی مانگ کی گئی۔ نیشنل کاؤنسل فار سول لبریٹز نے اِسے مزید گھٹا کر ۱۰ سال کر دینے کی تجویز رکھی لیکن ہوم آفس کی پالیسی ایڈوائزری کمیٹی نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ رضامندی کی عمر کو کم کر دینے سے والدین کی نگرانی کمزور پڑ جائے گی اور لڑکیاں یہ کہنے لگیں گی کہ 'اب ٹھیک ہے قانون ہمیں رُوک نہیں سکتا' مزید یہ کہ لڑکیوں کا استحصال کرنے والوں کو بھی اس سے بڑھاوا ملے گا۔

یونان کی پارلیمنٹ نے (۱۹۸۲ء میں) یہ قانون وضع کر دیا کہ اب زنا کاری پینل جرم نہیں رہے گا! قدیم دستور جس میں زنا کاروں کو پبلک میں شرمندہ کیا جاتا تھا اب اسے ختم کر دیا گیا۔ ملک میں ابتک رائج پینل کوڈ میں زانی کو ایک سال تک کی سزا دی جاتی تھی اور آرتھوڈاکس چرچ ایسے ملزم افراد کو شادی کی بھی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن اب یہ تمام اُمور ختم کر دیئے گئے۔ زنا کاری طلاق کے لئے معقول وجہ تسلیم کی گئی ہے لیکن اب یہ پینل جرم نہیں رہے گا۔

سوئیڈن نے اپنے ملک کے جنسی جرائم سے متعلق قوانین کو بہت ہی لبرل بنا دیا ہے۔ یہاں جنسی افعال میں ملوث ہونے والوں کے لئے رضامندی کی عمر ۱۵ سے کم کر کے ۱۴ سال کر دی گئی ہے۔ قریبی رشتہ داروں میں زنا کاری (Incest) کو غیر مجرمانہ فعل قرار دے دیا گیا ہے اور استاد و شاگردہ کے جنسی تعلق کو غیر مجرمانہ فعل قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار اداروں اور افسران نے اس کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے تو ہمارے تعلیمی اداروں میں بیسوائی اور زیادہ بڑھ جائے گی اور اونچے گریڈ

(۱) ریڈینس ویکلی دہلی۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۸۶ء

حاصل کرنے کے لئے لڑکیاں اپنے کو بہ آسانی سپرد کر دیں گی لیکن حکومت اپنی بات پر جمی ہوئی ہے۔ محکمۂ انصاف کے ایک ترجمان نے کہا کہ ایک ۲۰ سال کے ٹیچر اور ۱۷ سال کی شاگردہ کے درمیان جنسی تعلق کو مجرمانہ سمجھنا احمقانہ ہوگا۔ حیرت اس پر ہے کہ لیوتھرن اسٹیٹ چرچ نے بھی اِن تجاویز کی مخالفت نہیں کی۔ ہم جنس پرستوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے سلسلہ میں سوئیڈن دوسرے ملکوں سے آگے ہے۔ یہاں اس تجویز پر بھی غور کیا جا رہا ہے کہ دوسرے ملکوں میں اگر انکی جنسی پسند کی بناء پر انہیں ستایا جا رہا ہے تو سوئیڈن انہیں پناہ دے۔ وہاں آئین میں مناسب ترمیم کر کے ہم جنس پرستوں کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے انہیں دوسرے سوشل فوائد دیئے جانے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔

ہانگ کانگ میں قانون میں ترمیم کرنے والے کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ۲۱ سال کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد قانون کو افراد کی جنسی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنا چاہئے۔ اس کی رُو سے ۲۱ سال کی عمر کے افراد اگر سوڈمی ناشائستہ حرکات وغیرہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو اسے جُرم نہیں مانا جانا چاہئے۔ نیویارک میں اب ہم جنس مذاق رکھنے والوں کے لئے اپنے 'محبوب' (Lover) کو Adopt کرنا جائز ہو گیا ہے اور وہ دونوں ایک فیملی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ اسٹیٹ اپیل کورٹ نے کہا کہ اب امریکا میں نیوکلیر فیملی ہی خاندان کا واحد طرز زندگی نہیں رہ گیا ہے۔

اسپین میں حقیقی بھائی بہن ڈینیل (Daniel) اور روزا (Rosa) بچپن میں ہی علیحدہ ہو گئے تھے اور ان کی پرورش مختلف یتیم خانوں میں ہوئی۔ اٹھارہ سال قبل وہ اجنبی کی حیثیت سے میڈرڈ کے ایک ڈسکوتھ میں ملے اور آپس میں محبت کرنے لگے لیکن جب اُن پر حقیقت منکشف ہوئی تو وہ علیحدہ ہو گئے کیونکہ اسپین جیسے سخت کیتھولک ملک میں وہ شادی نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ Incest کو وہاں انتہائی معیوب مانا جاتا ہے اور ملک میں اب بھی کامن لا میرج کو تسلیم نہیں کیا جاتا لیکن یہ دونوں ایک ساتھ رہتے رہے اور اب ڈینیل کی عمر ۴۳ سال اور روزا کی ۳۸ سال ہو گئی اور اُن کے بچے بھی ہو گئے جن کی عمر ۱۱ اور ۵ سال کی ہے۔ انہیں اس قانونی کشمکش سے چھٹکارا دلانے کے لئے کیمبر (Cambre) شہر کے رجسٹرار نے ان کا نام ایک مخصوص رجسٹر پر درج کر لیا تا کہ انہیں اور اُن کے بچوں کو قانونی حیثیت سے جائز تسلیم کر لیا جائے۔ ایسا ہوتے ہی پورے ملک میں اس موضوع پر

بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں اس قسم کے سوالات اُٹھائے گئے: کیا خونی رشتوں میں بھی رشتۂ ازدواج کو تسلیم کیا جائے گا؟ کیا ایک ہی جنس کے افراد میں شادی کو جائز سمجھا جائے گا وغیرہ۔

کیمبر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جس کی کل آبادی پندرہ ہزار ہے وہاں کی سوشلسٹ لوکل باڈی نے یہ قانون پاس کردیا کہ ایسے باہمی صحبت کرنے والے گروپس (Cohabiting Groups) کو جو بالغ ہوں اور ایک ہی گھر میں رہ رہے ہوں انہیں اور ان کے بچوں کو حکومت کی طرف سے وہ جملہ مراعات دی جائیں گی جو رواجی خاندانوں کو دی جاتی ہیں۔ کیمبر کے میئر نے اس بائی لا کا مسودہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایسے گروپس کو صرف یہ دکھانا پڑے گا کہ میونسپل کاغذات میں انہوں نے Cohabiting کو درج کرا رکھا ہے اور ان کے پاس سرکاری کاغذات مہیا ہیں!

کیتھولک چرچ نے اس کی پُر زور مخالفت کی اور سینگیو کے ارچ بشپ نے کہا کہ یہ تمام اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی روایات کے سراسر خلاف ہے اور خونی رشتوں میں شادی نیز ایک ہی جنس کے افراد میں شادی کو جائز تسلیم کرلینا اسٹیٹ اور چرچ کے تسلیم شدہ ازدواجی رشتوں کے تقدس کے تصور کے منافی ہے۔ آرچ بشپ Barrio نے کہا کہ اس طرح رشتۂ ازدواج کا تقدس بالکل پامال ہو جائے گا۔ انھوں نے ایوان ساز کے ممبران سے اپیل کی کہ شادی کے رشتہ سے جو اعلیٰ قدریں وابستہ ہیں اور خاندان کے استحکام کا جو خوبصورت تصور قائم ہے اُسے برقرار رکھیں اور انارکی کی طرف لے جانے والے اقدامات سے گریز کریں۔

سوئڈن میں کئی سال سے صحبت کرتے ہوئے ایک ساتھ رہنے کا دستور (Cohabitation) ہے جسے وہاں کی زبان میں Sambo کہا جاتا ہے اور یہ لفظ وہاں کی ڈکشنری میں بھی موجود ہے اور یہاں کے باشندے اپنے Sambo کو اُسی طرح متعارف کراتے ہیں جیسے شوہر یا بیوی کو۔ ۱۹۸۸ء میں وہاں نیا قانون وضع کردیا گیا جسے Cohabitees Law کہا گیا اس کے مطابق Live In جوڑوں کو خواہ وہ ہوموسکشول ہوں یا ہیٹروسکشول ویسے ہی حقوق حاصل ہوں گے جیسے کہ اُن جوڑوں کو حاصل ہوتے ہیں جنہوں نے چرچ یا اسٹیٹ کے ذریعہ شادی کی ہو۔ شکستہ دلوں کے ڈائیگرام بنا کر نیچے یہ

سلوگن لکھا گیا: Read The Law Before Your Love Ends

حکومت پبلسٹی کرکے اس کی خوب تشہیر کر رہی ہے، بیشتر سویڈش جوڑوں نے اس قانون کی موافقت کی اور کہا کہ اپنے رشتے کو بنائے رکھنے کے لئے ہمیں چرچ یا سماج کی دُعاؤں Blessings کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ایسے ہی جوڑے نے کہا کہ ''گذشتہ چھ سال میں میں نے اور میرے پارٹنر نے ویسا ہی رشتہ بنالیا ہے جیسا کہ شادی شدہ جوڑے بناتے ہیں اور ہمیں ویسے ہی حقوق حاصل ہونا چاہئیں جیسے کہ شادی شدہ جوڑوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

افراد اور معاشرہ پر جنسی بے راہ روی کے اثرات

مندرجہ بالا تحقیقاتی جائزوں سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ شادی سے قبل مباشرت اور رشتۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلقات میں گذشتہ پچاس سال میں امریکا اور یورپ میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ امریکا کے میرج کاؤنسلر لسٹر ڈیربارن (Lester Dearborn) کہتے ہیں کہ میں اس موضوع پر ہونے والی بحث سے متفق نہیں ہوں جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ نوجوانوں میں شادی سے قبل مباشرت کے برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ میرا تجربہ اس سے زیادہ بتاتا ہے۔ میرے کلنک میں بھرے جانے والے کارڈ پر ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے ''کیا آپ نے شادی سے قبل جنسی اختلاط کا تجربہ کیا ہے''؟ اس سوال کا جواب بھاری اکثریت نے مثبت میں دیا۔ ڈیوڈ میس (David Mace) کا کہنا ہے کہ اگر شادی سے قبل مباشرت کے واقعات میں اضافہ نہیں ہوا ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ نشانیاں صحیح نتائج کی طرف اشارہ نہیں کر رہی ہیں۔ سوسائٹی میں جذبات کی برانگیختگی کے محرکات بڑھے ہیں اور ہر طرف معاشرتی زلزلہ (Upheaval) کے آثار نمایاں ہیں اس کے باوجود اگر کردار میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے تو ہمیں خود کردار میں تبدیلی لانے والے عوامل کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ ہیرولڈٹی کرسچین Haroldt Christensen کا کہنا ہے کہ ''میرے پاس رُجحانات (Trends) کا پتہ لگانے کے لئے رائے (Opinion) کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ میری رائے اور تحقیقاتی جائزوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شادی سے قبل جنسی اختلاط کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے''۔

برطانیہ کے ماہر صحت ڈاکٹر ارنسٹ کلیکسٹن (Ernest Claxton) لکھتے ہیں کہ:

"مجھے یقین ہے کہ صحت، قوت اور کارکردگی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ فرد اپنی زندگی کس طرح گزار رہا ہے اور کس مقصد کے لئے گزار رہا ہے۔ اخلاقی قوانین کو نظر انداز کرنے کے بے شمار مضرت رساں اثرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو قوم زندگی کے بنیادی اصولوں سے انحراف کرتی ہے اُس کا کیا انجام ہوتا ہے"۔

مشہور فلسفی و مؤرخ ول ڈورنٹ (Will Durant) لکھتے ہیں کہ "ہمارے جدید تمدن نے غیر دانشمندانہ طور پر انسان کے سفلی جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے اسلاف خوب جانتے تھے کہ جذبات بغیر کسی تحریک کے خود ہی کافی قوی ہوتے ہیں اور اس لئے اُن پر پوری گرفت قائم رکھی لیکن ہم نے ترغیب کے بے شمار طریقوں مثلاً اشتہارات زور بیان اور نمائش سے اُسے اور بھڑکا دیا ہے۔ مزید برآں اُسے اس نظریہ سے مسلح کر دیا ہے کہ رُکاوٹ پر عمل کرنا غلطی ہے حالانکہ رکاوٹ یعنی جذبات پر قابو۔ تمدن کا بنیادی اصول ہے"۔

مشہور و معروف انتھروپالوجسٹ جے۔ ڈی۔ اُون ون (J.D. Unwin) نے اسّی پریمیٹو سوسائٹیوں اور سولہ تہذیبوں کا تفصیلی تحقیقاتی جائزہ لیا اور انہیں اپنی معرکۃ الآرا تصنیف (Sex And Culture) (۱۹۳۴ء) میں پیش کیا۔ موصوف نے ٹھوس سائنٹفک انداز سے اس تاریخی حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ کسی بھی معاشرہ کی تخلیقی معاشرتی قوت Productive Social Energy اُسی تناسب میں ہوتی ہے جس حد تک اُس سے قبل کی دو نسلوں نے جنسی نظم (ڈسپلن) برتا ہو۔ ڈیوڈ میس (Davidmace) بھی اس تحقیق سے متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے نکالے ہوئے نتائج ٹھوس بنیادوں پر قائم ہیں۔

ماہر سماجیات پروفیسر پی۔ سوروکن (P. Sorokin) اُن کے نظریہ سے متفق ہیں کہ کسی بھی معاشرہ میں جنسی کردار کا طرز (Pattern Of Sexual Behaviour) اُس معاشرہ کے کلچر کے عروج یا زوال کا اہم سبب ہوتا ہے اور عظیم کلچر وہیں پنپتے ہیں جہاں شادی سے قبل پاکدامنی اور شادی کے بعد منکوحہ بیوی سے وفاداری کا تصور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ برطانوی مورخ اے۔ جے۔ ٹوئین بی (A.J. Toynbe) بھی اس

تاریخی حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ جتنا زیادہ ہم جنسی شعور کی بیداری (Sexual Conciousness) کو ملتوی کر سکیں گے۔ اتنا ہی زیادہ ہم اپنے کو زندگی کے مراحل سے کامیابی سے گزرنے کے قابل بنا سکیں گے۔

جنسی بے راہ روی کی وکالت کرنے والے اپنی بنیاد فرائڈ کے اس نظریہ پر رکھتے ہیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جنسی خواہشات کو دبانے سے مختلف دماغی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ خود فرائڈ نے اپنی تصنیف (Introductory Lectures On Psychoanalysis) میں یہ اعتراف کیا ہے کہ عظیم شخصیتیں اُسی معاشرہ میں جنم لیتی ہیں جہاں لوگ اپنے سفلی جذبات پر قابو پانے میں کامیاب رہتے ہیں اور عظیم کلچر کی تشکیل بھی وہیں ممکن ہوتی ہے جہاں افراد اپنی حیوانی خواہشات پر ضبط کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اِن حیوانی خواہشات میں سب سے پُرقوت شہوانی خواہشات ہوتی ہیں، جب ان کا رُخ اعلیٰ مقاصد کی طرف موڑ دیا (Sublimate) جاتا ہے تب افراد اپنی زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے قابل ہو پاتے ہیں۔ Oscar Sternbach کا کہنا ہے کہ اگر فرائڈ کی تصانیف کا غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ خود فرائڈ کا خیال یہ تھا کہ جذباتی اعتبار سے صحتمند رہنے کے لئے Instincts کی رو میں بہہ نہیں جانا چاہئے بلکہ اُن پر قابو پانے کا ملکہ پیدا کرنا چاہئے تب ہی اُن شہوانی قوتوں کو زیادہ بہتر تعمیری فلاح و بہبود کے کاموں میں لگایا جا سکتا ہے جس سے معاشرہ میں اعلیٰ قدریں پنپ سکیں۔ موصوف نے فرائڈ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جب وہ (فرائڈ) وائنا یونیورسٹی میں ایک لکچر دے رہے تھے۔ لکچر کے اختتام پر ایک طالب علم نے اُن سے برجستہ یہ سوال کر دیا کہ "پروفیسر آپکا کہنا ہے کہ جنسی خواہشات کو دبانے سے دماغی مرض (Anxiety Neurosis) پیدا ہو جاتا ہے تو آپ ہم طلباء کو کیا مشورہ دیں گے کہ ہمیں اِن جنسی کارگزاریوں سے احتراز کرنا چاہئے یا نہیں؟ تھوڑی دیر کے لئے فرائڈ ایک دم سکتہ میں پڑ گئے اور پھر سنبھل کر بولے: "میری رائے میں آپ کو ضبط سے کام لینا چاہئے"۔ لیکن فوراً بعد میں یہ مزید کہا کہ "لیکن احتجاج (Protest) کے بغیر نہیں"۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فرائڈ کا صحیح نظریہ اس معاملہ میں کیا تھا۔

برطانیہ کے معروف ماہر صحت ڈاکٹر ارنسٹ کلیکسٹن (Ernest Claxton)

لکھتے ہیں کہ ''عفت مآبی ایک ایسا ہتھیار ہے جسے ہمیں مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا چاہئے کیونکہ یہ نہ صرف امراض اور اخلاقی کرپشن سے مدافعت کے لئے ایک ڈھال ہے بلکہ یہ افراد اور قوموں کے لئے قوت کا خزانہ بھی ہے۔ یہ افراد کو ضبطِ نفس اور اخلاقی ڈسپلن کا سبق سکھاتا ہے اور اس طرح انکے کردار کو مضبوط کر کے اس میں جلا پیدا کرتا ہے۔ اس کا نہایت سازگار اثر خاندان کے ماحول پر نیز بڑھتے ہوئے بچوں پر پڑتا ہے۔ اس سے حاصل کی ہوئی قوت ہماری اقتصادیات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ ہر وقت کی جنسی اُلجھن سے چھٹکارا حاصل کر کے انسان اپنی صلاحیتوں کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں لگانے کے علاوہ دوسرے اعلیٰ مقاصد کے حصول میں بھی لگا سکتا ہے۔''

پوپ جان پال دوئم نے دنیا کے تمام عیسائی نوجوانوں سے پاکدامنی کے تصور کو پھر سے بحال کرنے کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا کہ جو نوجوان ہر وقت جنسی لذتوں میں منہمک رہتے ہیں وہ زندگی کے میدان میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بخوبی انجام نہیں دے پاتے اگر وہ ضبطِ نفس سے کام لیں تو اُن کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگی اور پاکدامنی اس جدوجہد میں معین ثابت ہوگی۔ بُرائی نہ جسم میں ہے نہ جنسیت میں بلکہ جسم کی (Dignity) کو نہ سمجھنے اور جنسیت کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا ہونے میں ہے۔

ماہرِ نفسیات پروفیسر اُو۔ ہوبرٹ ماورر (O. Hobert Mowrer) Illinosis یونیورسٹی کا کہنا ہے کہ آج کل جو اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ ''فرد جو کچھ سوچتا ہے یا جو کرتا ہے وہ ٹھیک ہے، اس سے تو اخلاقی نراج (Moral Anarchy) ہی بڑھے گی ہر سوسائٹی اپنے افراد کے لئے کچھ اصول وضوابط مقرر کرتی ہی اور اُسی میں جنسی برتاؤ بھی شامل ہے جس سوسائٹی میں اِن اصول وضوابط پر عمل نہیں کیا جاتا وہاں افراتفری (Chaos) پھیل جاتی ہے''۔ جنسی خواہشات کو بالکل بے لگام چھوڑ دینے سے افراد کو جسمانی و دماغی اذیتیں پہنچنے کے علاوہ معاشرہ میں بھی افراتفری مچ جاتی ہے، لہٰذا خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دینا معاشرہ کے بہتر مفاد کے پیشِ نظر نہایت ضروری ہے۔ انسان نے گذشتہ ہزاروں سال کے تجربہ سے جو فہم و دانش حاصل کی ہے اُن سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ معاشرہ میں برتاؤ کے لئے قواعد اور اصول وضع کرنا لازمی ہے تاکہ معاشرہ میں صالح نظام (Sane Order) برقرار رہے۔

پروفیسر پی۔ سوروکن بھی عصمت مآبی کے تصور میں انحطاط پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں (۱) کہ اگر شادی سے قبل باکرہ رہنے کا تصور اسی طرح دھندلا ہوتا گیا تو کچھ نسلوں کے بعد اُسے ماضی کی خرافات (Myth) سمجھا جانے لگے گا۔ بسا اوقات سماجی بُرائیوں (Maladies) کا مقابلہ کرنے میں کثیر دولت، قوت اور وقت صرف کیا جاتا ہے لیکن جنسی آزادی کو روکنے کے لئے کوئی سعی وجدوجہد نہیں کی جا رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مغربی سوسائٹی کو اس زیاں کا کوئی احساس ہی نہیں ہے، اس لئے صورتحال اور زیادہ مایوس کن ہو گئی ہے۔ اگر ہم اصل صورت حال سے ناواقف ہیں تو یہ موقع ہے کہ ہم اپنی غفلت سے بیدار ہوں۔ اگر ہم جنسی نراج سے فوائد کی اُمید رکھتے ہوں تو یہ وقت ہے کہ ہم ایسے افسوسناک حالات کا جائزہ لیں کیونکہ افق پر خطرناک علامتوں کا ظہور ہو چکا ہے۔ ہماری جنسی آزادی تحفظ کی حدود کو پار کر کے انارکی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے۔''

"If we are unaware of the real situation it is high time we are awakened from our ignorance. If we have lost the capacity to resist, it is urgent that we regain it. If we expect blessings from sex anarchy, it is vital that we cast aside this foolishness and look soberly at the sorry state of affairs. For there is a dangerous hue of serious trouble on the horizon. Our sex freedom is beginning to expand beyond the limits of safety, beginning to degenerate into anarchy."

- Prof. Sorokin

باب ششم

بردہ فروشی

بیسوائی کے متعلق ایک عام خیال یہ رائج ہے کہ یہ دُنیا کا سب سے پُرانا پیشہ ہے لیکن جین فرنارڈ لارنٹ (Jean Fernard Laurent) نے حال میں اقوامِ متحدہ کے لئے جو رپورٹ تیار کی اس میں تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ بیسوائی کا وجود پریمٹیو (Primitive) سوسائٹی میں نہ تھا بلکہ اس کی ابتدا ایتھنس اور روم اور اس کے بعد کی تہذیبوں میں ہوئی۔ صنعتی انقلاب کے بعد بڑے شہروں کے وجود میں آجانے اور عالمگیر سیاحتی میں اضافہ نے اس مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیا اور جنسی استحصال Sex Exploitation نے ساری دُنیا میں منفعت انڈسٹری کی شکل اختیار کرلی ہے اور اس بُرائی کو پوری طرح کمرشلائزڈ کردیا گیا ہے۔ جرائم کے بین الاقوامی منظم سنڈیکٹس، قمار، شراب اور ڈرگس، نارکوٹکس اور ٹورازم سے وابستہ ہوجانے سے یہ پرابلم اور بھی زیادہ سنگین بن گئی ہے۔ بڑی تعداد میں عورتوں کو ملازمت کی لالچ دے کر ایشیا، افریقہ کے پسماندہ ملکوں سے ترقی یافتہ ملکوں، گلف کے علاقوں میں لے جایا جاتا ہے جہاں انہیں کچھ دنوں تک ویٹرس، ماڈل، ریسپشنٹ اور گورنس کے کاموں میں لگا کر آہستہ آہستہ بیسوائی کی طرف راغب کردیا جاتا ہے۔ اس بزنس میں باقاعدہ سفری ایجنٹ، دلال کام کرتے ہیں جو منصوبہ بند طریقوں سے ان لڑکیوں کو اُن "منڈیوں" میں پہنچادیتے ہیں جہاں سے پھر نکلنا دشوار ہوجاتا ہے۔

International اور International Abolitionists Federation Association of Democratic Lawyers نے اپنے وائنا کے اجلاس میں جو

رپورٹ پیش کی اس میں کئی حیرت انگیز انکشافات تھے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ "تیسری دُنیا کے پسماندہ ملکوں سے لاکھوں عورتیں جن میں کمسن بچیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ مغربی ملکوں اور جاپان میں جہازوں سے پہنچائی جاتی ہیں جہاں وہ غیر ملکی سیاحوں کے لئے بیسوائی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ چائلڈ پورنوگرافی، چائلڈ پراسٹی ٹیوشن، اور سیکس ٹورازم درحقیقت جنسی استحصال کے نئے میدان ہیں"۔

بدچلن عورتوں کی تنظیم (Coyote) نے واشنگٹن میں بیسوائی کی پہلی ورلڈ کانفرنس ۱۹۷۶ء میں منعقد کی جس میں کہا گیا کہ بیسوائی ایک سماجی ضرورت ہے لہٰذا اس پیشہ کو قانوناً جائز قرار دیا جانا چاہئے اور اُن قوانین کو بدلا جانا چاہئے جس میں بیسوائی کو ایک جرم قرار دیا گیا ہے۔ ایمسٹرڈم میں بیسواؤں کا جو کنونشن منعقد ہوا اس میں بھی یہ قرارداد منظور ہوئی کہ بیسوائی بھی دوسرے پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے، اس کنونشن کی صدر (جو ہالینڈ کی یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں) نے مانگ کی کہ بیسوائی سے امتیازی سلوک برتنے والے قوانین کو ختم کیا جانا چاہئے اور جو عورتیں اس پیشہ میں داخل ہوں اُنکے حقوق کا ویسے ہی تحفظ کیا جانا چاہئے جیسے دوسرے ورکرس کا اور مزید یہ کہ انہیں سیکس ورکرس (Sex Worker) کہا جانا چاہئے نہ کہ پراسٹی ٹیوٹ!

حالانکہ بڑی تعداد میں عورتیں اقتصادی پریشانیوں سے مجبور ہوکر ہی اس پیشہ میں داخل ہوتی ہیں لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ بہت سی اچھی خاصی خوشحال نیز برسرکار عورتوں نے شوقیہ اس پیشہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ برٹش سوشل بیالوجیکل کاؤنسل بھی برطانیہ میں ایسی فاحشہ عورتوں کا ایک مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ "یہ ایک طرزِ زندگی ہے جسے بیشتر عورتیں اپنے پورے شعور کے ساتھ اختیار کرتی ہیں اور جو اُن کی شخصیت سے میل کھاتا ہے (Suits A Woman's Personality) اور جب تک اُن کی شخصیت یا حالات میں اچانک کوئی بدلاؤ نہیں آتا وہ اپنے حالات کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں"۔ والفنڈن کمیٹی نے بھی اس عام نقطۂ نظر کی تردید کی کہ حالات سے مجبور ہوکر عورتیں اس پیشہ میں گرفتار ہوجاتی ہیں، کمیٹی کا کہنا ہے کہ "بیسوائی کے محرکات میں طمعِ زر بھی یقیناً شامل ہے لیکن بہرحال لڑکیاں اور عورتیں اس پیشہ میں اپنے پورے ارادے سے ہی داخل ہوتی ہیں"۔

Women And Girls Were Usually Willing To Enter A Life Of Vice

چائلڈ پراسٹی ٹیوشن کو ختم کرنے کی تدابیر پر غور و خوض کرنے کے لئے فرانس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد ہوا، اُسے خطاب کرتے ہوئے انٹرنیشنل جیورسٹ ایسوسی ایشن کے صدر رینے برائڈل (Rene Bridel) نے کہا کہ:

''ترقی یافتہ ملکوں میں خوشحالی اور فارغ البالی نے لوگوں کو عیاشی کی طرف مائل کر دیا ہے اور وہ ہارڈ پورنوگرافی سے لے کر چائلڈ پراسٹی ٹیوشن تک میں شدید طور پر منہمک ہوگئے ہیں اور یہ Sadistic Trend اُن کی لائف اسٹائل کا اہم جُز بن گیا ہے''۔

ترقی یافتہ ملکوں میں جس صارفی معاشرہ نے جنم لیا ہے اُس کے نتیجہ میں لوگوں کا جنسی برتاؤ بھی خاصی بڑی حد تک کمرشلائزڈ ہوگیا ہے اور عورتوں کا Commodification ہوگیا ہے جس کے نتیجہ میں اُن کے عریاں و نیم برہنہ فوٹو اشتہارات اور گلیزڈ میگزین کی زینت بنتے ہیں اور جنسی بھوک مٹانے کے لئے اُن کا ہر طرح سے استحصال کیا جاتا ہے اور اسی لئے چائلڈ پورنوگرافی اور پراسٹی ٹیوشن کی لعنت ساری دُنیا میں بڑھتی جارہی ہے۔

جنسی انقلاب نے عصمت مآبی کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اٹلانٹک سے لے کر سویٹ بلاک تک بدچلنی کا دور دورہ ہے۔ ویانا میں بیسوائیں شناختی گرین کارڈ لئے پھرتی ہیں۔ پیرس میں ایلائسس پیلس کے دوسری جانب کیفے اور بارس میں بیسوائی کا کاروبار جاری ہے۔ بیشتر یوروپی ملکوں میں عصمت فروشی قانوناً جرم ہے لیکن خوبصورت عورتوں کا محبوب مشغلہ ہی عصمت فروشی ہے۔ لندن کا سب سے بدنام علاقہ پیکڈ لی نہ صرف بیسوائی کا بلکہ ظلم و معصیت کا گڑھ ہے۔ دن اور رات کا کوئی حصہ ایسا نہیں جب کہ یہاں شراب کے جام نہ کھنکتے ہوں اور طوائفوں کا ہجوم نہ رہتا ہو۔ پیرس کی سڑکوں پر افریقہ اور عرب ملکوں کے مزدوروں کو خوش کرنے کا کام یہی کرتی ہیں۔ اوسلو کی بندرگاہ پر جہاز سے سامان اُتارنے والی یہ شپ گرلز، جہاز کے عملہ کی دلبستگی کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔ اٹلی میں سیاحوں کے ساتھ رفاقت کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ہی یہ اُن کی ضیافت بھی کرتی ہیں۔

نیویارک کی بیالیسویں اسٹریٹ بیسواؤں کا پریڈ گراؤنڈ ہے۔ پی. بی گپتے لکھتے ہیں کہ یہ علاقہ دونوں جنسوں کی بیسواؤں سے بھرا پڑا ہے۔ آپ اُن کی چہرہ مہرہ اور لباس سے ہی پہچان سکتے ہیں۔ چونکہ یہاں بیسوائی قانوناً جرم ہے لہٰذا وہ براہِ راست آپ کو متوجہ کرنے (Overt Advance) کی کوشش نہیں کرتیں لیکن اگر آپ سنسان سڑک پر گزر رہے ہوں تو ذرا تعجب نہ کریں، اگر وہ آپ کو اپنی گرفت میں لے کر اپنی خدمات کی پیشکش کر دیں۔ بیشتر بیسوائیں ۱۶-۳۰ سال کی درمیانی عمر کی ہوتی ہیں۔ اکثریت نیگرو اور پیوٹرو ریکن لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ ان کو گرفتاری کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ ۱۹۶۷ء میں بنائے گئے قانون کی رُو سے پراسٹی ٹیوشن کی سزا صرف پندرہ دن جیل ہے پھر مقدمہ درج کرنے کے لئے پولیس کو ثبوت ملنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک ذمہ دار پولیس افسر کا کہنا ہے کہ اگر صرف شکل و شباہت ثبوت کے لئے کافی ہو تو ہر لڑکی جو اس اسٹریٹ پر گزرے گرفتار کی جاسکتی ہے۔ کتنیاں مسلسل راہ گیروں کو پریشان کرتی رہتی ہیں اور ہم صرف دیکھتے رہ جاتے ہیں!

شکاگو میں پراسٹی ٹیوشن ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ متعدد جاب س زیر نقاب بیسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ لڑکیاں اپنے ٹیلیفون پر توجہ مرکوز رکھتی ہیں اور کال ملتے ہی اپنی خدمات پیش کرنے چل دیتی ہیں۔ یہیں Everleigh کلب ہے جسے ''تاج محل آف سیکس'' کہا جاتا ہے، جہاں نہایت نفیس آراستہ کمروں میں جملہ تکلفات کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی بیسوائیں معاشرہ کے متمول ترین افراد کو محظوظ کرتی ہیں۔ کلائیو بارنس لکھتے ہیں کہ نیویارک میں Lust is for Sale ویسے اس شہر کی شہرت کبھی بھی پاکیزہ شہر کی نہیں رہی ہے۔ یہاں اسٹیچو آف لبرٹی کے نصب کئے جانے سے پہلے ہی قحبہ خانوں کا وجود تھا۔ یہاں ٹائمس اسکوائر کے علاقے میں پورنوگرافی اور پراسٹی ٹیوشن کے اتنے بھونڈے نظارے دیکھنے آتے ہیں کہ جو لوگ اِن کی مخالفت نہیں کرتے وہ بھی ان کریہہ مناظر سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ بے شمار مساج پالرس اس کی تشہیر کرتے ہیں کہ وہاں کام کرنے والیاں ٹاپ لیس ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہاں ہر قسم کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ''نیویارک ٹائمس'' نے اپنے کالموں میں لکھا کہ ملک کے ڈھیلے قوانین نے بیسوائی کو خوب فروغ دے رکھا ہے پورے ملک سے یہاں تک کہ الاسکا سے طوائفیں یہاں جمع ہوتی ہیں دلال ایک ہزار ڈالر ہر ہفتہ کماتے ہیں اور اس قانون کا مضحکہ اُڑاتے ہیں جو بہت ہلکی سزا نافذ کرتا ہے۔ بائی

کلاس طوائفیں منہٹن کے فیشن ایبل علاقے میں سرگرم رہتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق اپنی کتاب ''یہ ہے مغربی تہذیب'' میں لکھتے ہیں:

''امریکہ میں ۲۵ لاکھ نابالغ بچے غربت اور نشہ کی عادت کے باعث جسم فروشی کر رہے ہیں جبکہ رُوس بھی اس شرمناک دھندے میں اس حد تک پستی کا شکار ہے کہ صرف ماسکو میں ایک ہزار کمسن لڑکے، لڑکیاں جسم فروشی میں ملوث ہیں۔ امریکہ میں ہر سال ۲ لاکھ اسکول کی طالبات طوائفیں بن جاتی ہیں۔ ۶ لاکھ سے زائد طالبات مکمل طوائفیں بن چکی ہیں...... مغربی یورپ میں جسموں کی تجارت سے اربوں ڈالر آمدنی حاصل کی جارہی ہے۔ دلال انہیں آمادۂ گناہ کرنے کے لئے بجلی کے جھٹکے دیتے ہیں''۔ (ص ۲۵)

لندن کی (Twilight Girls) ''ٹوائیلائٹ گرلز'' کی روداد کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ نعمت اللہ لکھتے ہیں:-

''لندن آفاقی نوعیت کا شہر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سے ایسے لوگوں کے لئے کشش کا مرکز رہا ہے جو محنت سے تلاش معاش نہ کرکے دوسرے ذرائع استعمال کرکے جلد سے جلد دولتمند بن جانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ سوہو کے علاقہ میں جہاں متعدد اسٹرپ ٹیز کلب قائم ہیں سارے ملک سے جوان لڑکیاں اس شوق میں بھاگی چلی آتی ہیں کہ چندمنٹ کے لئے عریاں ہوجانے سے اگر اچھی آمدنی ہوجاتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ یہاں ایسی بے سہارا لڑکیوں کو خوش آمدید کہنے والے مکانات کے مالک اپنے چھوٹے چھوٹے کمرے انہیں دے دیتے ہیں جہاں وہ اپنی زینت کی دوکانیں سجا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس راہ پر قدم نکالنے کے بعد پھر ڈرگ اڈکشن، ابارشن اور ناجائز ولادتیں۔ سب ہی منزلیں دھیرے دھیرے طے ہونے لگتی ہیں۔ نیشنل ایسوسی ایشن فار منٹل ہیلتھ نے ان گمراہ لڑکیوں کی مدد کرنے کے لئے پروجیکٹ بنایا اور کاؤنسلنگ کے ذریعہ انہیں اس راہ سے ہٹانے کی پوری کوشش کی لیکن یہ تجربہ ناکام ہوگیا اس کی رپورٹ پڑھ کر ہر حساس ضمیر رکھنے والا شخص تڑپ اٹھتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس راہ پر گامزن ۲۵ فیصدی لڑکیاں ناجائز اولاد ہیں اور ان کی پرورش ایسی ماؤں نے کی جو ان کی خیرخواہ نہ تھیں یا پھر ان کی پرورش کسی رفاہی ادارے میں ہوئی یا وہ ایسے گھروں سے آئیں جہاں خود ان کے

باپ نے انہیں اپنی ہوس کا شکار بنایا...... بہرحال یہ تمام کی تمام لڑکیاں شکستہ گھرانوں کی ہوتی ہیں۔ رپورٹ کے اختتام پر یہ تأسف سے بھرا جملہ ہے کہ انتہائی خلوص کے ساتھ انکی اصلاح کرنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور کوئی بھی تدبیر انہیں اس راہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ ستم ظریفی یہ کہ جس دن یہ رپورٹ شائع ہوئی اُسی دن یہ بھی خبر چھپی کہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۰ء تک ۱۵۰۰ ملین (ایک سو پچاس کروڑ) بائبل کی کاپیاں شائع ہوچکی ہیں!!

فرانس میں بردہ فروشی کا بازار گرم ہے۔ یہ پیشہ قانوناً ممنوع ہے لیکن عملاً عام ہے۔ کچھ ہوٹل یہی کاروبار کرتے ہیں۔ ہزاروں عورتیں پیشہ میں شامل ہونے کے لئے افریقہ، الجیریا اور دوسرے بیرونی ممالک سے منگائی جاتی ہیں۔ پال بیورو نے بہت قبل یہ لکھا تھا کہ یہ ایک زبردست نظام ہے جو پورے منضبط طریقے سے تنخواہ یاب عہدہ داروں اور کارکنوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ریوٹر نیوز ایجنسی نے حال میں یہ اطلاع دی کہ فرانس میں بہت سی ایسی خواتین ہیں جو دن میں ماڈل، سکریٹری یا یونیورسٹی کی طالبات ہوتی ہیں اور رات میں وہی ہائی کلاس کال گرل بن جاتی ہیں اور لندن وجینوا تک کے شہروں میں طلب کی جاتی ہیں جہاں کے دولتمند تاجر پانچ ہزار فرانک تک دے کر شب باشی کے لئے ان کو مدعو کرتے ہیں۔ صرف پیرس میں ایسی پانچ سو خواتین ہیں۔ یہ راز اس وقت فاش ہوا جب پولیس نے کچھ خواتین سے جانچ پڑتال کی تب انہوں نے حکومت سے یہ اپیل کی کہ ان کی قانونی حیثیت کی وضاحت کی جائے تاکہ پولیس انہیں پریشان نہ کرے، اس Judicial Vaguness کی وجہ سے انہیں ستایا جاتا ہے!

پولیس کے حکام کا کہنا ہے کہ وہ قوانین کا نفاذ کرنے میں اپنے کو بے بس پاتے ہیں کیونکہ کٹنیوں کو گرفتار کرنے پر ہوٹل والے انکی ضمانت کے لئے آجاتے ہیں اور بہت سے معاملوں میں اونچے سرکاری حلقہ سے دباؤ پڑتا ہے۔ پرائیوٹ اپارٹمنٹس میں جو کارگزاری جاری رہتی ہے اس کی گرفت کرنا بھی مشکل ہے، نتیجہ یہ ہے کہ قانون کی سراسر خلاف ورزی کرتے ہوئے بیسوائیں اپنا کاروبار جاری رکھتی ہیں اور دس سے پچاس ہزار فرانک (۲۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے) ہر ماہ کماتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے وہاں کی حکومت نے طوائفوں کی آمدنی پر ٹیکس بھی عائد کردیا۔ فرانس کے مشہور اخبار Liberation کا کہنا ہے

کہ قومی برائیوں (Natioal Vice) سے فرانس کے خزانے کو ۹ ہزار کروڑ روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے :-

لاٹری گھوڑ دوڑ سے	۱۲ بلین فرینک	
الکحل سے	۲۵ بلین فرینک	
کیسینو جوا سے	۱۰۰ بلین فرینک	(TOI 16-8-1988)

اٹلی میں تقریباً دس لاکھ عورتیں عصمت فروشی کا باقاعدہ کاروبار کرتی ہیں، انکی عمریں ۱۵-۴۰ سال تک ہوتی ہیں۔ ملک کا کوئی شہر اُن سے خالی نہیں۔ نیپلز وغیرہ میں بیرونی سیاحوں کا استقبال بڑھ کر کرتی ہیں۔ اخباری اشتہارات میں بند الفاظ میں دعوت دی جاتی ہے۔

جرمنی میں بیسوائی کا کاروبار پورے شباب پر ہے۔ ہر روز تقریباً ۶۰ ہزار بیسوائیں اپنے دھندے میں مصروف رہ کر ($8 Billion) (800 کروڑ) کا ٹرن اور کرتی ہیں لیکن خود قحبہ خانوں میں بلائے جانے سے جو رقم ملتی ہے وہ بہت قلیل ہوتی ہے اس کاروبار میں نفع کا بڑا حصہ کٹنیوں، قحبہ خانوں کے مالکوں، مجرمانہ کارگزاریوں جیسے ڈرگ اور اسلحہ کی اسمگلنگ کا ٹھیکہ لینے والوں اور جوئے کے اڈوں کو چلائے جانے والوں کو ملتا ہے۔ عورتوں کے اس استحصال میں حکومت بھی برابر کی شریک ہے۔ (TOI 11.7.1995)

برلن کے ایک جرنلسٹ Joachim Riecker نے اپنی کتاب Love For Sale : Prostitution As A Factor Of Economics میں ان اُمور کا انکشاف کیا ہے جو جرمنی کے ریڈ لائٹ ایریا میں تحقیق کرنے کے بعد لکھی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''چھوٹے چھوٹے سیکس کلب یا کرایہ پر کمرے مہیا کرانیوالے مالکان ان بیسواؤں سے اچھی خاصی رقمیں وصول کرتے ہیں اور بعض سیکس کلب تو اعلیٰ درجے کے آراستہ اپارٹمنٹ مہیا کرتے ہیں جن کے لئے خاصی بڑی رقمیں گاہکوں سے بھی اور بیسواؤں سے بھی الگ الگ وصول کرتے ہیں۔ اسی لئے فیڈرل سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ ''اونچی سطح کے آراستہ اور پُرسکون ماحول کا مہیا کیا جانا دراصل بیسوائی کو بڑھاوا دینا ہے کیونکہ اس پُرکشش ماحول میں ایسے چکر میں پھنس جانے کے بعد پھر بیسوائیں اپنا پیشہ ترک کرنے کو

تیار نہیں ہوتیں'' دوسری طرف وہاں بڑے بڑے قحبہ خانے بھی ہیں جن میں کمیونسٹ مشرقی بلاک اور ایشیائی ملکوں کی عورتیں مصروف کار رہتی ہیں۔ مصنف ریکر (Riecker) کا کہنا ہے کہ تجارت کے کسی اور شعبہ میں مارکیٹ فورسس اتنی بے رحم (Brutal) و بے لگام (Unbridled) نہیں ہیں لہٰذا انہوں نے پراسٹی ٹیوشن کو قانوناً جائز کئے جانے کی پرزور وکالت کی ہے۔ یہ نہ صرف عورتوں کے حق میں مفید ہوگا بلکہ حکومت کو منظم جرائم کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک قانونی ڈھانچہ بھی مل جائے گا۔ حالانکہ بیسواؤں کی فیس مختلف علاقوں میں الگ الگ ہوتی ہے، پھر بھی انہیں بہت قلیل حصہ مل پاتا ہے۔ اس کاروبار کا بڑا حصہ امیر کٹنیوں اور دولتمند مالکان مکان کو ملتا ہے جنہیں کاروں کی چوری اور نشیلی ادویات کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی کا حصہ بھی ملتا ہے۔ اگر بیسواؤں کو دو ہزار ڈالر ماہوار کی آمدنی ہوتی ہے تو بیسواؤں کے سوداگروں کو لاکھوں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد بھی ایک اوسط درجہ کی کٹنی کے پاس 55 ہزار ڈالر بچ جاتے ہیں جسے وہ انوسٹ کرکے بھاری نفع کما لیتی ہیں۔ بیسوائیں پھر مقروض ہی رہ جاتی ہیں! جرمنی میں بیسواؤں کی ایک باہمی امدادی تنظیم Hydra کے نام سے قائم ہے جو ایسی مصیبت زدہ بیسواؤں کو مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ حال ہی میں اس فنڈ کی طرف سے برلن میں بین الاقوامی پراسٹیٹوٹس بال منعقد کیا گیا جس میں دُنیا بھر کے ملکوں سے تقریباً دو ہزار بیسواؤں نے شرکت کی اور ارباب سیاست نے بھی اس میں حصہ لیا۔ فنڈ کے ترجمان نے بتایا کہ وہ ایسی ہم پیشہ خواتین کی مالی امداد کرتا ہے جو اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہوں یا اپنا پیشہ بدلنا چاہیں۔

جاپان میں ڈیٹنگ کلب چائلڈ پراسٹی ٹیوشن کے مرکز بن گئے ہیں۔ ٹوکیو کے میٹروپالیٹن بلدیہ کی طرف سے ٹیلیفون کلب کا ایک جائزہ لیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ٹوکیو کے مڈل اور ہائی اسکول کلاسوں میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں بڑی تعداد میں تجسس کی بنا پر ان ڈیٹنگ کلب میں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی ملاقات ایسے نوجوانوں سے ہوجاتی ہے جو تحفہ تحائف دے کر یا نقد رقم دے کر اُن سے جنسی تلذذ حاصل کرتے ہیں۔ جب ان لڑکیوں سے یہ پوچھا گیا کہ وہ ایسے کلب میں کیوں جاتی ہیں تو ۴۱ فیصدی لڑکیوں نے جواب دیا کہ وہ تجسس (Curiosity) اور جوش (Thrill) میں وہاں چلی جاتی ہیں اور ۳۰ فیصدی لڑکیوں

نے یہ کہا کہ وہ پُرلطف ماحول میں وقت گزاری کے لئے چلی جاتی ہیں۔

دوسری عالمگیر جنگ میں دولاکھ سے زیادہ ایشیائی ملکوں۔ کوریا، فلپائن، تائی وان، ملائشیا اور انڈونیشیا کی لڑکیوں کو جاپانی فوجیوں کیلئے "کمفرٹ گرلز" کی حیثیت سے جنسی غلامی پر مجبور کیا گیا تھا۔ جنگ کے اختتام کے بعد اِن لڑکیوں نے اپنے حقوق کے تحفظ اور حکومت سے مالی معاوضہ اور معافی کی مانگ اٹھائی، جب پبلک کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا تب اگست ۱۹۹۳ء میں جاپانی حکومت نے اِن عورتوں سے Blanket Apology مانگی اور ایک پرائیوٹ فنڈ قائم کردیا گیا جس سے انہیں مالی معاوضہ دیا گیا لیکن حکومت خود کوئی معاوضہ دینے پر رضامند نہ ہوئی۔ ان عورتوں نے منیلا میں ایک کانفرنس کرکے اپنی مانگ پُرزور طریقے سے دُہرائی اور کہا کہ چونکہ جاپانی حکومت نے براہِ راست انہیں اس کام پر تعینات کیا تھا لہٰذا حکومت خود معاوضہ ادا کرے!

ہالینڈ نے اپنے ملک میں قحبہ خانوں کو سرکاری منظوری دے دی اور ان کے لئے ایک گائیڈ لائن تیار کردی گئی جس میں اس قسم کی ہدایتیں دی گئی ہیں کہ کیسے قحبہ خانوں کو صاف ستھرا رکھا جائے، بستر اور تولیہ صاف رکھے جائیں، بیسوائیں اپنی طبی جانچ کراتی رہیں اور اپنے مکانوں پر E for Erotic کا سرخ نشان پہچان کے لئے لگائیں۔ کوئی کمسن بچی اس کام پر نہ لگائی جائے اور بغیر کنڈوم کے بیسوائیں اپنے گاہکوں سے مباشرت نہ کریں۔ سرکاری انسپکٹران ہدایتوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے مامور کئے گئے ہیں!

ارجنٹائنا کی حکومت نے بھی نئی اقتصادی پالیسی کے تحت بیسوائی کے پیشہ کو قانوناً جائز قرار دے دیا۔ ملک میں تقریباً دس ہزار بیسوائیں اس پیشہ میں سرگرم عمل ہیں جس میں مرد بیسوائیں بھی شامل ہیں جو عورتوں کا لباس پہن کر اس پیشہ میں مصروف رہتے ہیں۔

برازیل کی بیسواؤں نے اپنا ایک ترجمان رسالہ بھی نکالنا شروع کردیا جس کا نام Kiss From The Street رکھا گیا۔ ایک سابق بیسوا (جواب ماہر سماجیات ہوگئی ہیں) نے اس کے ایڈیٹر کے فرائض سنبھال لئے، انہوں نے کہا کہ مسرت (Pleasure) انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے لوگ ویسے اس کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتے لیکن بیسواؤں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ سب ہی لوگ شادمانی کو پسند

کرتے ہیں"۔

کیوبا کا ساحلی تفریح گاہ Varadero بیسوائی کا مرکز بن گیا ہے۔ حال میں یہاں تقریباً چار سو مکانوں پر چھاپے ڈالے گئے اور فحاشی کے پیشہ میں مصروف سات ہزار عورتوں کی گرفت کرکے انہیں ان کے گھروں کو واپس بھجوا دیا گیا۔ اس ساحلی مرکز پر غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں، لہٰذا اسٹیشنوں، پارکوں اور Tunnels میں بھی یہ اپنے دھندے میں مصروف پائی گئی ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اس کام میں تعاون دیتے پائے گئے۔

ہرارے میں بیسوائی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ جنسی امراض میں معتد بہ اضافہ ہونے لگا تب ملک کے سو ممبران پر مشتمل اسمبلی میں حکومت سے پُرزور انداز میں مانگ کی گئی کہ بیسواؤں کا لازمی طور پر رجسٹریشن کرایا جائے اور انکی طبی جانچ مستقل طور پر کرائی جائے تاکہ ان امراض خبیثہ کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔

نیسٹر کرونیٹس (Nestor Cervnates) لکھتے ہیں کہ حالانکہ **جاپان** نے Institutional Prostitution کو ممنوع قرار دینے والا قانون ۱۹۵۶ء میں ہی پاس کردیا تھا لیکن اس کے باوجود Contract Basis Prostitution میں نہ صرف یہ کہ اضافہ ہوا ہے بلکہ اُس نے انتہائی گھناؤنی شکلیں اختیار کرلی ہیں اور پولیس کو اُس کی روک تھام کرنے میں سخت جدوجہد کرنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں یہ فری پرائیوٹ ٹیوشن جیسا لگتا ہے لیکن دراصل یہ زبردستی کا پرائیوٹ ٹیوشن ہوتا ہے جس میں گھروں سے فرار ہونے والی لڑکیاں، دماغی خلل رکھنے والیاں، نیز مقروض گھر گرہست عورتیں اپنے کو لوگوں کے سپرد کردیتی ہیں۔ قریبی رشتہ داروں کی ہوسناکی کا شکار ہونے والی لڑکیاں، گھریلو تشدد یا پڑھائی لکھائی سے تنگ ہوکر بھاگ کھڑی ہونے والی لڑکیاں یا اپنے بوائے فرینڈ سے لڑجھگڑ کر علیحدہ ہوجانے والی لڑکیاں اس پیشہ کو اختیار کرلیتی ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں 56,513 ایسے نابالغ لڑکے و لڑکیاں ملک میں تھے جن میں 54.1 فیصدی لڑکیاں تھیں انیشنل چائلڈ کنسلٹیو انسٹی ٹیوشن کے ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ 55.5 فیصدی لڑکیوں کو خود ان کے سگے باپ نے اور 29.6 فیصدی کو ان کے سوتیلے باپوں نے اپنی ہوسناکی کا شکار بنایا۔ جنسی آزادی اور نابالغ بچیوں کو حاملہ کرنے میں بھی 17.4 فیصدی سگے باپوں کا ہاتھ تھا! فلپائن

اور دوسرے ایشیائی ملکوں کی جو عورتیں جاپان کے شہروں Base Towns میں کام کرتی ہیں انہیں اور بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف ان کے مالکان اور دوسری طرف امیگریشن ایجنٹس ان کا استحصال کرتے ہیں، ان عورتوں کو اپنی آمدنی کا معقول حصہ مکان مالکان کو دینا پڑتا ہے۔ پراسٹی ٹیوشن کی ایک نئی ترکیب (Trick) یہ نکلی ہے کہ ان لڑکیوں کو اسٹرپ شو کے بہانے ۱۲ ڈالر گاہک سے چارج کر کے ان کی جنسی تشنگی بجھانے کے لئے سپرد کر دیا جاتا ہے! Okinawa جب جاپانی حکومت کے زیر اقتدار آیا تو وہاں بھی جاپانی قوانین نافذ ہوئے جن کی رُو سے بیسوائی ممنوع ہے لیکن یہاں کی دس ہزار بیسوائیں بدستور سابق اپنی کمائی اسی پیشہ سے حاصل کرتی ہیں۔ یہاں بیسوائیں قحبہ خانوں کے مالکوں کو دوسو سے لے کر آٹھ ہزار ڈالر تک اپنا قرض چکانے کے لئے دیتی رہتی ہیں۔ ٹوکیو پولیس کے ایک سروے سے یہ معلوم ہوا کہ وہاں کی سڑکوں پر بیسوائی کے الزام میں پکڑی جانے والی عورتوں میں بیس فیصدی ایسی خانگی عورتیں تھیں جن کے شوہر اچھے عہدوں پر کام کرتے تھے اور بعض سرکاری افسران کی حیثیت سے تعینات تھے۔ ان عورتوں نے اعتراف کیا کہ وہ اپنی آرائش وزیبائش کے سامان خریدنے، پیانو یا ایئر کنڈیشنڈ وغیرہ خریدنے کے لئے اکسٹرا منی حاصل کرنے کے لئے اس پیشہ کو اپناتی ہیں۔ ساٹھ فیصدی عورتوں نے یہ بھی بتایا کہ فیملی بجٹ بنانے کے سلسلہ میں ان کا اکثر جھگڑا اپنے شوہروں سے ہو جاتا ہے۔

کنزیومر ویلوز نے **ہانگ کانگ** میں بردہ فروشی کو بے انتہا فروغ دے دیا ہے جوان لڑکیوں نے یہ جان لیا ہے کہ سرعت سے دولت حاصل کرنے کا ذریعہ جسم فروشی ہے۔ تجن پریچا لکھتے ہیں کہ یہاں کنزیومر اشیاء سے پٹی ہوئی دوکانوں پر دوسرے سامان کے ساتھ سیکس بھی ایک بکاؤ شے ہوگئی ہے۔ ہانگ کانگ کی کنزیومر سوسائٹی میں عورتوں کو Sex Object سمجھا جاتا ہے۔ اکنامک اینڈ سوشل کمیشن فار ایشیا اینڈ پے سے فک (Escap) کے ایک اجلاس میں پڑھے گئے ایک پیپر میں بتایا گیا کہ ''انتہائی مادی نقطہ نظر اور خوشحال سوسائٹی میں غریبوں کا وجود، آزادانہ جنسی روش، ماس میڈیا میں کمرشلائزڈ سیکس کی نمائش، خاندانی قدروں میں انحطاط۔ ان سب عوامل نے مل کر یہ صورتحال پیدا کردی ہے''۔ حالانکہ حکام برائی کے ان مرکزوں پر چھاپے ڈالتے رہتے ہیں لیکن بیسوائی درپردہ

جاری رہتی ہے۔ اب قحبہ خانوں کی جگہ Fish Ball Stalls تفریحی مرکزوں، سوشل کلب اور مساج پارلرس نے لے لی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد سے یہ مرکز بہت مقبول ہوگئے اور جوان لڑکیوں کے لئے اچھی آمدنی کا ذریعہ جو پانچ ڈالر فی گھنٹہ کی کمائی کرنے لگیں۔ یہ لڑکیاں جن میں اکثر طالبات ہوتی ہیں، گاہکوں کے ساتھ ''رفاقت'' کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ ان کے علاوہ کیبرے، رقص گاہیں اور گرلی بارس بھی کمائی کے اڈے بن گئے ہیں۔ رہائشی مکانوں کے درمیان ایسے مرکزوں کا ہونا انتہائی مخرب اخلاق ثابت ہو رہا ہے اور پاکدامن لڑکیوں پر اس کے خراب اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

حال ہی میں وہاں فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن کی طرف سے کئے گئے ایک سروے سے یہ معلوم ہوا کہ ۱۸-۲۷ سال کی عمر کے ۲۸ فیصدی مرد بیسواؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی اکثریت شادی سے قبل بھی جنسی تعلق قائم کرنے والے پائے گئے۔ ''ون چائی'' ضلع کی شہرت اپنے قحبہ خانوں کی وجہ سے دور تک پھیلی ہوئی ہے جہاں یورپین ملکوں کے سیاح بڑی کثرت سے آتے ہیں۔ یہاں کے ہوٹل اور Resorts میں ان سیاحوں کی ضیافت کے لئے بڑی تعداد میں لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر فلپائن سے لایا جاتا ہے، پہلے انہیں Hospitality سے متعلق پیشوں جیسے ری شپ سنشٹ، ویٹرس، بارگرلس اور ٹورسٹ گائڈ میں لگا دیا جاتا ہے اور بالآخر وہ بیسوائی کے دھندے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ ہوموسکوشلٹی سے متعلق قوانین یہاں کافی سخت ہیں اور ہر قسم کے غیر فطری عمل قانوناً ممنوع ہیں لیکن اندر اندر یہ ذوق لوگوں میں سرایت کر رہا ہے اور ایڈس کے خطرے کے پیش نظر حکومت اس پر کڑی نظر رکھ رہی ہے۔

فلپائن ''لینڈ آف ملٹی نیشنل'' کہلاتا ہے۔ یہاں عورتوں کا استحصال بھی اُسی نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے تاکہ حکومت کو زیادہ سے زیادہ فارن ایکسچینج حاصل ہو سکے۔ منیلا میں چائلڈ پراسٹی ٹیوشن اپنے شباب پر ہے۔ جہاں چھوٹی بچیاں اس دھندے میں ڈال دی جاتی ہیں۔ یہاں کے ٹورسٹ ریزارٹ سیاحوں کی خاطر مدارات کے لئے پھول کے گلدستے اور سگریٹ فروخت کرنے کی آڑ میں ان کم عمر بچیوں کو لگا لیتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ یہ کم عمر لڑکیاں اس کاروبار میں مصروف ہیں۔ بسا اوقات غریب والدین خود اپنی بچیوں کو ان غیر ملکی سیاحوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ غربت اور حکومت کی لاپروائی نے

اس مسئلہ کو اور سنگین بنا دیا ہے۔ کچھ غیر ملکی سیاح ان لڑکیوں سے برائے نام شادی کر لیتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں لے جا کر انہیں چھوڑ دیتے ہیں جہاں وہ بیسوائی کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہیں۔

جب پانی سر سے اُونچا ہو گیا تب ۱۹۹۵ء میں فلپائن پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا جس میں چائلڈ پراسٹی ٹیوشن کو اتنا ہی سنگین جرم قرار دیا گیا جتنا کہ نشلی ادویات کا کاروبار سینٹ کے ایک رُکن نے اس کی موافقت کرتے ہوئے کہا کہ جو کٹنی (Pimp) ۱۲ سال سے کم عمر کی بچی کو بیسوائی کی ترغیب دے گی یا بہلا پھسلا کر اس پیشہ میں داخل کرنے کی کوشش کرے گی، اسے سزائے موت دی جائے گی! موصوف نے کہا کہ ''جو فرد بھی کمسن بچی سے جنسی طور پر ملوث ہوتا ہے وہ اُس کے وقار کو سخت صدمہ پہنچاتا ہے اور اُسے نارمل زندگی گزارنے کے حق سے محروم کر دیتا ہے''۔

اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ فلپائن کی پندرہ لاکھ بیسواؤں میں ایک لاکھ چائلڈ پراسٹی ٹیوٹس ہیں۔ عورتوں کی ایک تنظیم Gwa کا کہنا ہے کہ ملک میں دو لاکھ سے زائد چائلڈ بیسوائیں ہیں جن میں کچھ تو پانچ سال تک کی بچیاں ہیں!

تھائی لینڈ کو Land Of Smiles اور Sex Paradise بھی کہا جاتا ہے یہاں قحبہ خانے قانوناً ممنوع ہیں لیکن بیسوائی اپنے پورے شباب پر ہے۔ ساحلی تفریح گاہوں، ہوٹلوں، بار و ریسٹورنٹ اور مساج پارلرس میں مہمان نوازی کی آڑ میں ہزاروں بیسوائیں جن میں بڑی تعداد میں کمسن لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں، اس کاروبار میں مصروف رہتی ہیں۔ غیر ملکی سیاح جاپان، کوریا اور یورپ کے ملکوں سے بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں اور یہ اُن کی خاطر تواضع کے لئے خوش آمدید کہتی ہیں۔ ملک میں پانچ لاکھ سے زیادہ عورتیں اس کاروبار میں مصروف ہیں جسے نہایت نفیس و شائستہ ڈھنگ سے انجام دیا جاتا ہے۔ بنگکاک میں کئی پرائیویٹ اپارٹمنٹ خصوصی مہمانوں کی رہائش کے لئے، پاش (Posh) علاقوں میں قائم ہیں جہاں ''کنواری'' لڑکیوں کے لئے 385 سے 462 ڈالر تک چارج کئے جاتے ہیں۔ اوسط درجے کی لڑکیاں جو کماتی ہیں اس میں سے اپنی ''میڈم'' کو کمیشن ادا کرتی ہیں۔ مکان کا کرایہ دیتی ہیں اور پس انداز کی گئی رقم میں سے اپنے گھر والوں کو بھی بھیجتی رہتی ہیں، لہٰذا اقتصادی اعتبار سے یہ دھندھا کچھ زیادہ نفع بخش نہیں لیکن

غربت کی مجبوری اور اپنے والدین کو سپورٹ کرنے کے لئے اس پیشہ سے بادلِ ناخواستہ وابستہ رہتی ہیں۔

تھائی لینڈ کی حکومت نے اس مسودہ قانون کو منظوری دے دی ہے جس کی رُو سے ایسے اشخاص کو جو لڑکیوں کو اُن کی مرضی کے خلاف بیسوائی پر آمادہ کریں گے، انہیں پندرہ ماہ جیل کی سزا اور 3,460 ڈالر جرمانہ عائد کیا جا سکے گا۔ وہاں کی وزارت داخلہ نے ایسے والدین کے لئے جو اپنی لڑکیوں کو فروخت کر دیتے ہیں شاک ٹریٹمنٹ دینے کی غرض سے ایک نیا طریقہ شروع کیا ہے تا کہ اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر انہیں اپنی لڑکیوں کو بیچنے سے روکا جا سکے۔ ان والدین کو گروپ میں ایسے قحبہ خانوں اور Go Go Bars کا دورہ کرایا جاتا ہے تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ان کی لڑکیاں کس قسم کی زندگی گزارتی ہیں اور کیسے استحصال کا شکار ہوتی ہیں تا کہ انہیں ندامت ہو اور وہ اپنی لڑکیوں کو اس طرح فروخت کرنے سے باز آ سکیں۔

Mahidol یونیورسٹی کے پاپولیشن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ایک مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ تھائی لینڈ میں غیر شادی شدہ خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں ۳۰ سے ۳۴ سال کی عمر کی ایسی غیر شادی شدہ خواتین کی تعداد دُگنی ہوگئی ہے اور یہ تعداد دوسرے پڑوسی ملکوں جیسے انڈونیشیا، جنوبی کوریا، فلپائن اور جاپان سے بھی تقریباً دُگنی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۶ء کے درمیان سنسس رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب تھائی لینڈ کی عورتیں زیادہ عمر میں شادی کرتی ہیں، تعلیمی مصروفیات اس کا اہم سبب بتایا گیا۔

چین کے متعلق انٹرنیشنل ہرالڈ ٹریبون نے ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی جس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ وہاں ۱۹۴۹ء کے کمیونٹ انقلاب کے بعد بیسوائی کو بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۹ء کے اقتصادی اصلاحات کے بعد ملک میں بڑھتی ہوئی خوشحالی اور دولت کی فراوانی نے لوگوں میں جنسی عیاشی کا شوق پھر پیدا کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں اب وہاں بیسوائی پھر نمودار ہو گئی ہے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد وہاں بیسواؤں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا تھا کیونکہ حکومت نے بڑی سختی سے افیون کے مرکزوں، جوئے کے اڈوں اور قحبہ خانوں کو بند کرا دیا تھا لیکن گذشتہ ۱۵-۲۰ سال سے نئی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں کے تحت غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں یہاں آنے لگے اور ان کی ''ضرورتوں'' کو پورا کرنے کے

لئے یہاں کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں اور بارس نے پھر ان بیسواؤں کی خدمات کی پیشکش شروع کردی۔ رفتہ رفتہ ملک کے سب ہی پاش ہوٹلوں نے ایسی لڑکیوں کو اپنے یہاں ریسیپشنسٹ، ٹیلیفون گرل، ویٹرس کے عہدوں پر تعینات کرلیا جو در پردہ بیسوائی کے فرائض انجام دینے لگیں۔ شنگھائی۔ کینٹین، اور بیجنگ میں نوجوان لڑکیاں سنیما گھروں، ہوٹلوں، بارس اور کیفے کے ارد گرد گھومتی رہتی ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتی رہتی ہیں، اُن کی اُجرت ۱۹ سے ۴۰ ڈالر کے درمیان رہتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اس کاروبار میں پوری طرح شریک رہتے ہیں۔ چونکہ پولیس ایسی عورتوں پر کڑی نظر رکھتی ہے لہٰذا یہ گاہکوں کے ساتھ شب باشی سے احتراز کرتی ہیں اور ٹیکسی کے ذریعہ سنسان مقامات پر وقت گزاری کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس چلی جاتی ہیں۔ کچھ بیسوائیں سیاحوں کے ساتھ Companion کی حیثیت سے ہفتہ دو ہفتہ اُن کے تفریحی پروگراموں میں شریک رہتی ہیں اور شب باشی بھی کرتی ہیں جس سے پولیس کی گرفت سے بچی رہتی ہیں۔ ایک ہفتہ کی رفاقت کے لئے وہ چار سو ڈالر تک چارج کرتی ہیں!

چین میں بیسوائی کے لئے عورتوں کی خرید و فروخت خفیہ طریقوں سے اب بھی کی جارہی ہے لیکن حکومت سختی سے ایسے معاملات میں مداخلت کرتی ہے اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جاتی ہے۔ چین کے دیہی علاقوں سے بہلا پھسلا کر نوکری کی لالچ دے کر ایسی لڑکیوں کو شہروں میں لے آیا جاتا ہے جہاں وہ 300 سے ایک ہزار یین (120-36$) میں فروخت کردی جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہوٹلوں اور بیوٹی پارلرس میں کام پر لگا دیا جاتا ہے اور ناخواندہ لڑکیاں بیسوائی کے پیشہ میں داخل ہونے کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔

رُوس: کمیونسٹ نوجوانوں کے اخبار ''کوموسومولسکیا پرودا'' نے پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ ماسکو میں بھی بیسواؤں کا وجود ہے اور ایسی لڑکیوں پر سخت تنقید کی جو اس پیشہ سے سو ڈالر روزانہ کمانا پسند کرتی ہیں بجائے کسی ایمانداری کے کام کے۔ اخبار نے غیر ملکیوں پر بھی کڑی نکتہ چینی کی جو یہاں ایسی (Orgies) میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ پیشہ ور عورتیں ماسکو اور اُس کے اطراف میں بڑے ہوٹلوں کے ارد گرد چکر لگاتی ہیں جہاں غیر ملکی سیاح قیام کرتے ہیں کٹنیاں رابطہ کا کام انجام دیتی ہوئی بھی دیکھی گئی ہیں۔ پولیس نے کچھ

گرفتاریاں بھی کیں لیکن قلیل مدت کی سزا کاٹ کر وہ واپسی میں پھر اپنے دھندے میں مصروف ہوجاتی ہیں۔

پولینڈ: حالانکہ پولینڈ کی کمیونسٹ حکومت یہ تسلیم نہیں کرتی کہ وہاں بیسواؤں کا وجود ہے لیکن جب سے پولینڈ کے تجارتی تعلقات دوسرے ملکوں سے بڑھے یہاں کی نوجوان لڑکیوں نے اُن سے پینگ بڑھا کر عصمت فروشی شروع کردی۔ یہاں گذشتہ دس سال میں سیاحوں اور تاجروں کی تعداد میں بیس گنا اضافہ ہوا اور اب یہ تعداد دس لاکھ سالانہ تک پہنچ گئی ہے۔ پیشہ ور عورتوں کا تخمینہ ۱۹۷۵ء میں ۱۳ ہزار لگایا گیا تھا اور اب یقیناً اس میں دس گنا اضافہ ہوگیا ہوگا۔ دلال اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتے ہیں لیکن پھر بھی زبوں حالی کا شکار رہتے ہیں اور اپنے اخراجات پورا کرنے کے لئے جرائم کا بھی ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ طوائفوں کی اکثریت شکستہ گھرانوں سے آتی ہے جہاں شراب نوشی کی وجہ سے والدین آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ اسّی فیصدی لڑکیاں ناخواندہ ہوتی ہیں اور کوئی ہنر بھی نہیں جانتی جو تعلیم یافتہ لڑکیاں حالات سے مجبور ہوکر اس پیشہ میں داخل ہوتی ہیں اُن کی اتنی قدر افزائی ہوتی ہے اور گراں اُجرتیں ملتی ہیں کہ وہ اس پیشہ کو ترک کرنے کا خیال بھی نہیں لاتیں۔

آسٹریلیا کے شہر کینبرا نے اپنے یہاں قانوناً قحبہ گری کو جائز قرار دے دیا ہے اور Xrated اڈلٹ ویڈیو کا کاروبار بغیر کسی روک ٹوک کے دھڑلے سے جاری ہے۔ مجلس قانون کے ایک رُکن مائکل مُور (Moore) کا کہنا ہے کہ قانونی روک ٹوک بیمار معاشرہ کی نشانی ہے، یہاں ایچ آئی وی انفکشن پھیلنے کا ایک بھی واقعہ نہیں ہوا۔ ۱۹۹۳ء کے جس قانون کے ذریعہ ملک میں بیسوائی کو قانوناً جائز قرار دیا گیا اس میں کمرشیل سیکس کے وقت کنڈوم کا پہننا بھی لازمی قرار دے دیا گیا۔ اب اگر کوئی کلائنٹ کنڈوم پہننے سے انکار کرتا ہے تو بیسوا پولیس کو طلب کرسکتی ہے۔ کینبرا دُنیا کا واحد ایسا شہر ہے جہاں کے قانون میں یہ دفعہ رکھی گئی ہے۔ مسٹر مور کا کہنا ہے کہ اس قانون کو کمیونٹی کا پورا تعاون حاصل ہے۔ ایراس (Eros) فاؤنڈیشن جو بیسواؤں کے لے کام کا بہتر ماحول بنانے کی سعی میں سرگرم عمل رہتا ہے، کا کہنا ہے کہ پہلے بیسواؤں نے اس قانون کی مخالفت کی تھی لیکن جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں اپنے جسم کے تحفظ کا حق حاصل ہے تو انہوں نے اسے قبول کرلیا۔ تقریباً

سب ہی عورتیں اس پیشہ میں اپنی رضامندی سے داخل ہیں اور ایک گھنٹہ میں 150 سے 180 ڈالر تک کمالیتی ہیں۔ اس میں 20 فیصدی قحبہ خانوں کے مالکوں کو اور 20 فیصدی حکومت کو چلا جاتا ہے۔

یہاں کے قحبہ خانے رہائشی علاقوں میں نہیں بلکہ صنعتی علاقوں میں اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ سڑک پر چلنے والوں کو ترغیب دینے کی ممانعت ہے لیکن اخبارات میں اشتہارات دینے کی آزادی ہے۔ صنعتی علاقوں میں فحاشی کی نمائش کرنے والے وڈیوز کا کاروبار بھی خوب فروغ پر ہے اور ڈاک کے ذریعہ فحش میٹریل بھیجنے کا کام بھی تیزی سے ہورہا ہے۔ اِن وڈیوز کے پانچ لاکھ سے زیادہ Subscribers ہیں۔

سولی جے۔ سوراب جی لکھتے ہیں کہ :-

''قحبہ خانے بھی اب معزز ادارے بن گئے ہیں اور منافع کمانے (Investment) کا اچھا ذریعہ۔ ملبورن کا مشہور قحبہ خانہ ڈیلی پلینٹ (Daily Planet) اٹھارہ کمروں پر مشتمل ہے جس میں ڈیڑھ سو لڑکیاں شفٹ میں اپنا دھندھا جاری رکھتی ہیں۔ ایک ہزار ڈالر کے ابتدائی سرمایہ سے یہ سال میں 8.42 فیصدی کا منافع دیتا ہے۔ یہ جلد ہی آسٹریلیا کے اسٹاک ایکسچینج کا ممبر بننے والا ہے۔ جس کے شیئر ایک ڈالر کے ہوں گے۔''

موصوف سوال کرتے ہیں کہ کیا آسٹریلیا سے باہر کے ملکوں کے باشندے بھی اس میں سرمایہ لگاسکیں گے اور کیا بونس کی شکل میں بیسواؤں کی فری سروسز بھی حاصل ہونگی؟ اور پھر تاسف سے کہتے ہیں کہ واقعی ہماری دنیا بڑی پاگل اور خراب دنیا ہوگئی ہے!

"Ours is indeed a bad mad world"

(TOI, 13.X.2002)

ہندوستان میں بیسوائی پورے فروغ پر ہے اور یہ کئی شکلوں میں جاری ہے۔ فیوڈل بیسواؤں سے لے کر فائیو اسٹار فلش ٹریڈ کی کال گرلز تک وسیع ہو کر یہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ پُرانے زمانے کی گلیوں اور کوچوں سے نکل کر اب یہ پاش رہائشی علاقوں میں پہنچ گئی ہیں اور وہاں رہنے والوں کے لئے متعدد خطرات کا باعث بن گئی ہیں۔ بڑے شہروں میں متعدد ریکٹ دریافت ہوچکے ہیں۔ رقص اور موسیقی کے اسکولوں، کیبرے ہاؤس اور فائیو اسٹار ہوٹل میں یہ کاروبار خفیہ طور سے جاری ہے۔ نارکوٹک اسمگلرس، جرائم

سنڈیکٹس، اونچے تاجر، پولیس کے اعلیٰ افسران اور ارباب سیاست کی سرپرستی میں یہ کاروبار خوب پنپ رہا ہے۔ اندھرا یونیورسٹی کے سوشل ورکس ڈپارٹمنٹ کے ذریعہ کئے گئے ایک سروے سے یہ معلوم ہوا کہ وشاکھا پٹنم میں پراسٹی ٹیوشن کے سنڈیکٹس خوب پھیلے ہوئے ہیں جو بیسواؤں کی آمدنی کا ۴۰ فیصدی تک لے لیتے ہیں اور بیس فیصدی دلال لے جاتے ہیں۔ دلالی کا پیشہ Institutionlaised ہوگیا ہے۔ عورتوں کو قرض دے کر دلالوں کے ذریعہ اس پیشہ میں پھانس لیا جاتا ہے، جب وہ اس دام میں گرفتار ہوجاتی ہیں تب وہ اس ''چکر'' سے نکلنے کو سوچ بھی نہیں پاتیں جب تک کہ سنڈیکیٹ خود انہیں خارج نہ کردے۔

انڈین ہیلتھ آرگنائزیشن کے ایک سروے سے یہ معلوم ہوا کہ 58 فیصدی عورتوں نے مجبوری کے تحت ہی یہ پیشہ اختیار کیا لیکن اب چار میں صرف ایک بیسوا اس کام کو ترک کرنے کے لئے تیار ہے۔ ہر پانچ بیسواؤں میں ایک یا تو کمسن بچی ہے یا نابالغ لڑکی۔ جنس اور اس کے متعلق ناواقفیت کی بنا پر ان لڑکیوں کو سخت صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر دس میں نو بیسوائیں جنسی امراض میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر راجیشور پرشاد کا کہنا ہے کہ تازہ ترین اعداد کے مطابق ایک تہائی ہندوستانی امراض جنسی کا شکار ہیں اور اگر اسکول کالجوں میں جنسی تعلیم کا معقول انتظام نہ کیا گیا تو ۲۰۱۰ء تک یہ امراض ملک کے 92 فیصدی باشندوں کو اپنی چپیٹ میں لے لیں گے جو آئندہ نسلوں کے لئے ایک زبردست چیلنج بن جائے گا!

سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آن چائلڈ پراسٹی ٹیوشن نے ۱۹۹۴ء میں ملک میں بیسوائی کا ایک مفصل جائزہ لیا تو یہ اندوہناک انکشاف ہوا کہ ملک میں جو عورتیں ہر سال اس پیشہ میں داخل ہوتی ہیں اُن میں چالیس فیصدی ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ملک کے چھ بڑے شہروں بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، بنگلور اور حیدرآباد میں بیسوائی اپنے پورے شباب پر ہے، ہر شہر میں ستر ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان بیسوائیں ہیں جن میں پندرہ فیصدی ۱۵ سال سے کم عمر کی اور 24.5 فیصدی ۱۶ سے ۱۸ سال کے درمیان عمر کی لڑکیاں ہیں۔ اِن عورتوں سے اس پیشہ میں داخل ہونے کے اسباب کے بارے میں جو معلومات حاصل کی گئیں اُن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

- ۴۴ فیصدی عورتیں اقتصادی مشکلات سے مجبور ہو کر اس پیشہ میں داخل ہوتی ہیں۔

- ۲۴.۵ فیصدی عورتوں کے شوہر انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔
- ۹.۱۱ فیصدی عورتیں کسی کے ورغلانے سے گمراہی کے اس راستہ پر چل پڑتی ہیں۔

بہت سی لڑکیاں دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی اس پیشہ میں داخل ہو جاتی ہیں جنہیں وہ ٹھاٹھ باٹ سے رہتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان بڑے شہروں میں 86 فیصدی عورتیں اندھرا پردیش، کرناٹک، تامل ناڈو، مغربی بنگال، مہاراشٹر اور اتر پردیش سے آئی ہوئی ہیں۔ دہلی اور بمبئی بیسوائی کے بڑے مرکز ہیں جہاں ملک کے ستر اور چالیس ضلعوں کی عورتیں بردہ فروشی کے کاروبار میں مصروف ہیں۔

''بیسوائی کے نئے مواقع'' کے عنوان سے دہلی میں ایک سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے سابق جج وی۔ آر۔ کرشنا آئر نے کہا کہ ایک نئے دولت مند طبقہ کے وجود میں آ جانے نیز غیر ملکی سیاحوں کے بڑی تعداد میں آنے سے ملک میں ''ہائی سوسائٹی کال گرلز'' کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا ہے جس نے بیسوائی کے مسئلہ میں ایک نیا پہلو پیش کر دیا ہے۔ یہ دولتمند افراد ریڈ لائٹ علاقوں میں نہیں جاتے بلکہ پاش ہوٹلوں اور دوسرے معزز مقامات پر قیام کرتے ہیں اور وہیں ان ہائی سوسائٹی کال گرلس کو طلب کر لیا جاتا ہے۔ پولیس کو ان کارگزاریوں کا علم بھی نہیں ہو پاتا۔ ٹورسٹ کے بڑی تعداد میں آنے سے ایسی لڑکیوں کیلئے آمدنی کے نئے مواقع کھل گئے ہیں جہاں انٹرٹیمنٹ کیلئے پاش ہوٹل ایسی لڑکیوں کو اپنے یہاں لگا لیتے ہیں۔ این۔ آر۔ مادھومین ڈائریکٹر نیشنل لا اسکول آف انڈیا نے کہا کہ اسمگلنگ کی وجہ سے ملک میں بے حساب دولت ہو گئی ہے جس نے کمرشلائزڈ پراسٹی ٹیوشن کو زبردست بڑھاوا دیا ہے۔ بیسوائی کا یہ کاروبار اتنے شائستہ طریقے سے کیا جا رہا ہے اور دولت کا اتنا ہیر پھیر ہوتا ہے اور Victim کو بھی اتنی کثیر رقم ملتی ہے کہ ارباب سیاست، ماہرین قانون، اعلیٰ حکام اور ارباب فہم و دانش سب اس کی سرپرستی کرتے رہتے ہیں اور اس پیشہ کو اتنا معزز بنا دیا گیا ہے کہ اُسے تقریباً جائز ہی سمجھا جانے لگا ہے۔

Tended To Develop Sophistication Bordering On Legitimacy

انہوں نے مزید کہا کہ اب تو ایسی کانفرنس اور سیمینار کے پلیٹ فارم سے بھی تعلیم یافتہ حضرات کی زبان سے اس قسم کی مانگ اٹھائی جانے لگی ہے کہ حکومت کو اس پیشہ کو نیشنلائزڈ کر دینا چاہئے یا بیسواؤں کو لائسنس مہیا کر دینا چاہئیں۔ جو معاشرہ اور Victim

دونوں کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا!

اسی سیمینار میں سرلائڈ گٹ نے بتایا کہ اقوامِ متحدہ نے اپنی ایک رپورٹ میں دُنیا کے سب ہی ملکوں نے Sophisticated Prostitutes کے ایک نئے طبقہ کے وجود میں آنے کا اعتراف کیا ہے۔ ملکوں کی Intelligence تنظیمیں، بڑے بزنس ہاؤس اور نیز اعلیٰ افسران سے رابطہ قائم کرنے کے مقصد سے ایسی Hostesses یا سکریٹریز کا تقرر کرتی ہیں جنہیں خاص قسم کی تربیت دے کر ہائی کلاس پراسٹی ٹیوٹ بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ پیمانے کے شاندار ہوٹل، ریسٹورنٹ، گیسٹ ہاؤس، اور ایئرپورٹ پر بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی کال گرلس کی خدمات مہیا کی جاتی ہیں جسکے معاوضہ میں انہیں اچھا مشاہرہ دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ نہایت نفع بخش Lucrative Economic Activity ہوگئی ہے۔ ہمارے ملک کے بڑے بزنس ہاؤس بھی اسی لئے Casinos جوئے کے مرکزوں اور Hospitality بزنس کو فحاشی کا ذریعہ بناتے جا رہے ہیں۔ کچھ ڈانس اور میوزک اسکول نیز ناری نکتین بھی درپردہ اسی کاروبار میں تعاون دے رہے ہیں۔ دولتمند خاندانوں میں بچوں کی نگہداشت کے لئے رکھی جانے والی گورنس اور ہاؤس کیپرس کا بھی جنسی استحصال کیا جا رہا ہے۔

''بچوں کے استحصال'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں مسرز شکلا رُ درا نے اپنے پیپر میں بتایا کہ تعزیزی قوانین کے باوجود ملک میں چائلڈ پراسٹی ٹیوشن کا کاروبار دھڑلے سے چل رہا ہے۔ اور کم از کم تین لاکھ بچیاں اس کام میں مصروف ہیں۔ بمبئی کے مشہور کاٹھی پورا کی تقریباً پچاس ہزار بیسواؤں میں بیس فیصدی کمسن لڑکیاں ہیں اور ایسی کمسن لڑکیوں کی خرید و فروخت کے کم از کم یہ چھ مرکز تو بہت مشہور ہیں۔ دھول پور (راجستھان)، لسائی خورد (بستی)، جنگل پیٹھ، اور حیدرآباد (اندھرا پردیش)، پُون (مہاراشٹر)، مظفرپور (بہار)، بھوبانیشور (اُڑیسہ) یہاں گیارہ سے تیرہ سال کی عمر کی لڑکیاں پورے ملک سے لاکر فروخت کی جاتی ہیں۔

انڈین ہیلتھ آرگنائزیشن کا کہنا ہے کہ ہر سال تقریباً ایک لاکھ لڑکیاں نیپال سے اسمگل کر کے ہندوستان لائی جاتی ہیں جنہیں فلموں میں کام کرنے یا ملازمت کی لالچ دے کر اغوا کر کے لایا جاتا ہے اور بعد میں انہیں غیر سماجی عناصر کے ہاتھوں فروخت کر دیا

جاتا ہے جو انہیں بیسوائی پر مجبور کردیتے ہیں، کیونکہ ۷۰ فیصدی لڑکیاں ناخواندہ ہوتی ہیں اور تیس فیصدی کی عمر ۱۸ سال سے کم ہوتی ہے۔

ہندوستان میں نوجوان لڑکیوں کا استحصال خود اُن کے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے ذریعہ خوب کیا جارہا ہے۔ لڑکیوں کے سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد بہت سے خاندانوں میں اب بھی اُن کی عصمت کے تحفظ کے خیال سے انہیں اسکول جانے سے رُوک دیا جاتا ہے لیکن خود اُن کے ہی بھائی، اور بھانجے، چچا اور ماموں اُن کا جنسی استحصال کرتے رہتے ہیں اور انہیں اس پر بھی مجبور کرتے ہیں کہ اسے صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ملک میں کم از کم دس لاکھ ایسے ریپ کے واقعات ہر روز ہوتے ہوں گے!

سیکس کی طرف جھکاؤ رکھنے والا ٹورازم

ٹورازم اب دُنیا کی سب سے بڑھتی ہوئی گلوبل انڈسٹری ہوگئی ہے اور فارن ایکسچینج حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ۔ ٹرانسپورٹ اور پٹرولیم پروڈکٹس کے بعد یہ دُنیا کی تیسری سب سے بڑی ایکسپورٹ انڈسٹری ہوگئی ہے۔ تازہ ترین اعداد کے بموجب 592 ملین افراد ہر سال عالمگیر سیاحت پر نکلتے ہیں اور 425 بلین ڈالر سے زیادہ خرچ کردیتے ہیں۔ انٹرنیشنل ٹورازم میں 444 ملین افراد لگے ہوئے ہیں۔ سنگاپور جیسے چھوٹے ملک میں سات ملین سیاح ہر سال آتے ہیں جبکہ ہندوستان میں صرف 2.2 ملین ٹورسٹ ہی آتے ہیں۔ ہندوستان کو باہری ملکوں کے سیاحوں سے ۹۴-۱۹۹۳ء میں 6,509 کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی لیکن اس بڑھتی ہوئی انڈسٹری کا ایک پہلو اور ہے وہ ہے سیکس کی طرف جھکاؤ۔ اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ میں ٹورازم کے جنسی پہلو کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے بعض بڑے چونکا دینے والے انکشافات کئے گئے، رپورٹ میں بتایا گیا کہ:

"سیکس ٹورازم عورتوں کے استحصال کی ایک منظم اور وسیع انڈسٹری بن گئی ہے۔ خاص کر تیسری دُنیا کے پسماندہ ملکوں میں۔ فلپائن، جنوبی کوریا اور تھائی لینڈ میں بڑی تعداد میں لڑکیوں کا اقتصادی و جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ مغرب کے خوشحال

ملکوں کی ٹورسٹ ایجنسیاں ایشیائی ملکوں کی لڑکیوں کے حسن و جمال، رعنائی اور دلکشی کی تعریف کرتے ہوئے انہیں ان ملکوں کی سیاحت پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ایک جاپانی ایجنسی نے اپنے بروشر میں یہ جملہ لکھا:

"When You Go on A Journey Leave
Your Sense Of Shame At Home"

جنوبی مشرقی ایشیا میں اگلی (Ugly) امریکن کی طرح اگلی جاپانیز کا لفظ کا بھی لوگوں کی زبان پر آنے لگا ہے۔ گذشتہ سال سترہ لاکھ جاپانیوں نے سیول، منیلا اور بنگاک کا سفر کیا۔ جاپانی ٹریول ایجنسیاں ان ملکوں کے آرٹ اور کلچر، رقص و موسیقی، صنعت وحرفت کے ساتھ ہی ساتھ وہاں کی لڑکیوں کے حسن و جمال کے بارے میں بھی پوری تفصیلات بے باکانہ انداز میں پیش کردینے میں ذرا عار نہیں سمجھتے اور انہیں پوری طرح لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔

برن ڈیکلیریشن گروپ کا کہنا ہے کہ سوئزرلینڈ ایسے سیکس ٹورازم کے کلائنٹ ملکوں کا سرغنہ ہے اور یہاں کی ٹریول ایجنسیاں بنگاک کے ہوٹلوں اور قحبہ خانوں میں ملنے والی ایشیائی لڑکیوں کی نزاکت اور رعنائی کی تعریف اپنے بروشرز میں چھاپتے رہتے ہیں۔ غریبی کی وجہ سے کئی ایشیائی ملکوں میں والدین خود اپنی بچیوں کو ایسے گروہوں کو فروخت کردیتے ہیں جو کرپٹ پولیس والوں اور ارباب سیاست کی ملی بھگت سے ایسے Sex Rings سے جُڑے ہوتے ہیں۔

یونیسف کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایشیا کے آٹھ ملکوں میں بہ شمول ہندوستان کم از کم دس لاکھ بچیاں چائلڈ پراسٹی ٹیوشن میں لگی ہوئی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کے سیاح اور بڑے تاجران کے خریدار ہوتے ہیں کیونکہ اُن سے ملوث ہونے سے ایڈس جیسے مرض میں مبتلا ہونے کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں۔ یونیسف نے بتایا کہ کنونشن کے آرٹیکل 34 میں بچوں کے حقوق کے تحفظ اور اُن کے ہر قسم کے استحصال پر پابندی عائد کردی گئی ہے لیکن دُنیا کے 32 ملکوں سے بچوں کے جنسی استحصال کی رپورٹیں مل چکی ہیں۔ ایشیائی ملکوں کی غریبی اس استحصال کا سب سے بڑا سبب ہے، اس کے علاوہ Urbanisation اور کنزیومر سوسائٹی کا زبردست دباؤ بھی اس کے اہم سبب ہیں۔

کنز یمور گڈس کی لالچ اور خاندان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی وجہ سے بھی بڑی تعداد میں لڑکیاں اس پیشہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔

سیکس ٹورازم نے اتنی وسعت اختیار کر لی ہے کہ حال میں (نومبر ۹۷ء) لندن میں منعقد ہونے والی ٹور آپریٹر اینڈ ٹریول ایجنسیس کی کانفرنس میں یہ موضوع بھی زیر بحث آیا اور بتایا گیا کہ برطانیہ کے کم از کم چھ ہزار اور دوسرے یوروپی ملکوں کے پندرہ ہزار ایسے جانے پہچانے لوگ ہیں جو اسی مقصد سے سیاحت کرتے ہیں اور تھائی لینڈ، فلپائن، سری لنکا، برازیل اور ارجنٹنا وغیرہ برابر جاتے رہتے ہیں اور وہاں کمسن بچوں اور بچیوں کا جنسی استحصال کرتے رہتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ نے ایک ورکشاپ میں اس مسئلہ پر بحث ومباحثہ کیا اور ایسی تدابیر پر غور کرنے کی دعوت دی جس سے ایسے سیاحوں کے خلاف قانونی کارروائی کی جاسکے۔ کانفرنس نے یہ طے کیا کہ بین الاقوامی سطح پر ایسے قوانین وضع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سب ہی ملکوں کے تعاون سے ایسے اشخاص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکے جو سیاحت کی آڑ میں چائلڈ پراسٹی ٹیوشن، پورنوگرافی اور ایسی ہی دوسری مجرمانہ حرکات کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ (۱)

امریکا کے موقر میگزین ''ٹائم'' نے لکھا کہ:

''ٹورسٹ کے گروہ در گروہ ایشیا اور پے سے فک ملکوں میں جاکر کثیر رقمیں خرچ کر کے یہاں کے ہوٹلوں، نائٹ کلب، اور ساحلی ریزارٹس پر انتہائی سوقیانہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اتنے اخلاقی ابتذال کے بعد ہونے والی آمدنی کیا لائق ستائش ہے یہی عقدہ قابل غور ہے''؟

Is The Revenue Worth The Moral Cost?

This Is the Crux Of The Problem.

بیسوائی کو قانوناً جائز قرار دیئے جانے کی سعی

اقوام متحدہ کی منعقد کی گئی ورلڈ ویمنس کانفرنس میں آزادیٔ نسواں کی علمبردار مارگریٹ سینٹ جیمس نے بیسوائی کو ایک سماجی ضرورت بتاتے ہوئے اُسے ساری دُنیا میں قانوناً جائز قرار دئے جانے کی پُرزور وکالت کی۔ بیسوائی پر قانونی پابندی دراصل مرد کی

(۱) TOI, 21.11.1997

فطرت خواہشات پر روک لگا کر، اس کی شخصیت کی تکمیل میں مانع ثابت ہوتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس دھندے میں نوے فیصدی عورتیں وہی ہوتی ہیں جنہیں بچپن میں ان کے ہی باپ اور بھائیوں نے ریپ کیا ہوتا ہے۔ دوسری ترجمان فلورنس کینیڈی نے کہا کہ امریکا کو بیسواؤں کے خلاف قانونی کارروائی اس لئے نہ کرنا چاہئے کہ امریکا خود ہی بیسوائی کو شہ دیتا ہے اگر بیسوا ایک گھنٹہ میں سو ڈالر کماتی ہے ایک کلرک ہفتہ میں سو ڈالر کماتا ہے اور گھریلو عورت کام کاج اور بچہ پیدا کرنے میں کوئی کمائی نہیں کرتی تو وہ حکومت جو سب کو روزگار مہیا نہیں کراپاتی کس طرح ایسی عورتوں کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے؟ شادی کا ادارہ خود ہی بیسوائی ہے جسے معاشرہ نے جائز قرار دے رکھا ہے!

برطانیہ میں بیسواؤں نے پولیس اور کٹنیوں سے بے خوف ہو کر اپنا پیشہ جاری رکھنے کی مانگ کی۔ انہوں نے کہا کہ ان کے سرپرستوں میں ملک کے بڑے اکابرین، ممبران پارلیمنٹ، چرچ اور پریس کے عمائدین شامل ہیں۔ مغربی جرمنی میں ایڈس کے خوف سے ریڈ لائٹ ایریا میں جانے والوں کی تعداد میں کچھ کمی ہوئی تو وہاں کی چار ہزار طوائفوں نے اپنی ایک تنظیم بنا کر حکومت سے مطالبہ کیا کہ حکومت کے فلاحی پروگرام کے تحت انہیں بھی انشورینس اور میڈیکل فائدے دیئے جانے چاہئیں اور ان کی خدمات کو کمرشیل سروس تسلیم کیا جانا چاہئے۔ تاکہ وہ اسٹیٹ کے ان فائدوں سے مستفیض ہو سکیں۔ جب حکومت ایڈس کے مریضوں کو اتنی سہولتیں دے رہی ہے جو ایک غیر فطری عمل میں ملوث ہوتے ہیں تو ہم تو ایک فطری عمل کو فطری طریقے سے کرتے ہیں۔

والفنڈن کمیٹی (۱) نے بھی اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''بیسوائی کا وجود صدیوں سے ہر تمدن میں رہا ہے، اُسے قانون کے ذریعہ ختم کرنے میں ہمیشہ ناکامی رہی ہے۔ بیسوائی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور بیسوائیں صرف ایک طبعی مانگ یا طلب کو پورا کر رہی ہیں۔ بیسوائی کے محرکات میں طمع زر یقیناً شامل ہے لیکن بہر حال لڑکیاں اور عورتیں اس میں اپنے پورے ارادے ہی سے داخل ہوتی ہیں۔ لائسنس شدہ قحبہ خانوں کی تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا ہے کہ بیسوائی کا خاتمہ صرف ایسے اقدامات سے کیا جاسکتا ہے۔ جس میں

(۱) پندرہ ممبروں پر مشتمل برطانیہ کی سرکاری کمیٹی۔ صدر ریڈنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر جان والفنڈن۔

جنسی تعلقات کی اور اُس کی ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھا گیا ہو اور معاشرہ کا اخلاقی و سماجی نظریۂ زندگی فی الجملہ بلند نہ ہو جائے‘‘۔

ہمارے ملک میں بھی بیسوائی اور عورتوں کی تریفکنگ پر روک لگانے والے قوانین ہیں اور پینسل کوڈ میں بھی دفعات ہیں لیکن ان کا نفاذ بہ مشکل ہی ہو پاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیسوائی کو قانوناً جائز قرار دے دیا جائے۔ جیسا کہ بیرسٹر شیلا بارسے نے کہا کہ ’’انسانوں کے وقار کو ٹھیس پہنچانے والے قوانین کا وضع کرنا ہرگز صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ بیسوائی کو جائز قرار دینے یا نہ دینے کی بحث فضول ہے جیسے یہ کہنا کہ چونکہ ہم قتل کو روک نہیں سکتے لہٰذا اسے ڈی کرمنلائز کر دیا جائے‘‘۔

"You Cannot Legitmise The Loss Of Dignity Of Human Beings. The Legalisation Debate Is Superflous, As Saying That Since We Cannot Abolish Murder In Society Let's Decrimnalise It"

"This may be partly due to the atmosphere of an affluent and permissive society which induced persons to prostitute their bodies for the sake of extra luxury or for the thrill of it."

- H. R. Gokhale

Law Minister (India)

باب ہفتم

ہوموسکشولیٹی

انسان کی کجروی (Perversion) کی بھی کوئی حد نہیں۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک استلذاذ بالمثل کو انتہائی قبیح اور مکروہ فعل سمجھا جاتا تھا اور جو لوگ اس میں ملوث بھی ہوتے تھے وہ انتہائی شرمندگی محسوس کرتے تھے اور معاشرہ میں انہیں بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سر آغا خاں نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے کہ ’’پہلے استلذاذ بالمثل سے جذام کی طرح بچا جاتا تھا اب اس کے بجائے اکثر یورپین ملکوں میں یا تو فرائڈ کی طرح ہمدردی ہے یا تاویلیں ہیں اور یا پھر اس سے بھی بڑھ کر اندرے گائڈ (Andre Guide) جیسے لوگ اس کی حمایت و پشت پناہی پر آمادہ ہیں‘‘(۱)۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے قدروں اور رُجحانات میں اتنی زبردست تبدیلی ہوئی کہ اب ہوموسکشولیٹی کو کوئی برائی یا مرض ہی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف نقطۂ نظر تمام تر ہمدردانہ ہوتا جارہا ہے۔ برطانیہ کے ایک ماہر نفسیات کا اندازہ ہے کہ ’’وہاں دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مردوں کے خلاف فطرت اعمال میں چھ سو فیصدی کا اضافہ ہوگیا۔ اس کا ردِّعمل عورتوں پر ہونا ضروری تھا‘‘۔ چنانچہ لیزبین (Lesbian) ذوق عورتوں میں بھی خوب بڑھا۔ اب تو گے (Gay) اور لیزبین ذوق رکھنے والے افراد نے باقاعدہ اپنی تنظیمیں بنالی ہیں اور حکومت سے اپنے معاملات، مساوی حقوق، آپس میں شادیاں (Same Sex Marriages) وغیرہ کو قانوناً جائز قرار دیے جانے کی مانگ بھی کرنے لگے ہیں۔ صرف امریکا میں حکومت کے

(۱) Memoirs of Aga Khan p. 3

ایک ترجمان نے ہوموسکشولس اور لیزبین کی تعداد پچیس ملین بتائی (۱)۔ اب ہوموشکسولس باقاعدہ پریڈ نکالتے ہیں۔ کانفرنس منعقد کرتے ہیں، اور اپنے خلاف کی جانے والی تفریق کوختم کرنے کی مانگ کرتے ہیں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ قانون کوان کے باہمی رشتہ میں مداخلت نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ رُومانس اور لمبے وقفہ کی رفاقت کے زیادہ خواہشمند ہوتے ہیں بہ نسبت جنسی تعلق کے۔ برطانیہ نے اپنے ملک کے چھ سو سال پُرانے قوانین میں تبدیلی کرکے ۱۹۶۷ء سے لواطت کواگر وہ فریقین کی رضامندی سے ہے تو اُسے قانوناً جائز قراردے دیا ہے! ہالینڈ کے ایک کیتھولک چرچ نے ۱۹۶۷ء میں دُنیا میں پہلی بار ایک مرد اور لڑکے کے درمیان پورے مسیحی قاعدے وضابطہ کے مطابق ایک عقد کرایا اور جب کچھ لوگوں نے اونچے پادریوں کے سامنے احتجاج کیا تو وہاں سے بھی احتجاج مسترد کردیا گیا۔ اس عجیب وغریب عقد کے جوڑے کی تصویریں برطانیہ کے معروف ومقبول ہفتہ وار ''نیوز آف دی ورلڈ'' مورخہ ۹/جولائی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں! سان فرانسسکو میں ہوموسکشول اور لیزبین تعلقات کودر پردہ تسلیم کرنے کا ایک قانونی جواز یہ نکال لیا گیا ہے کہ ایسے جوڑوں کو ۳۵ ڈالر کی فیس دینے پر (Domestic Partner) کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے اور یہ تجویز بھی زیرغور ہے کہ ایسی شادیوں کو بھی قانونی طور پر تسلیم کرلیا جائے! ایک اینگلیشن پادری نے ہم جنسیت اور خودکشی کو آبادی روکنے کا ایک ذریعہ بتاتے ہوئے اُس کی پُرزور حمایت کی اور چرچ کی ہونے والی کانفرنس میں اُس پر سنجیدگی سے غوروخوض کرنے کی سفارش کی۔ایک ۶۶ سالہ بشپ نے لکھا کہ:

Love Between Two Men Can Achieve Pure

And Glorious Relationship

ہوموسکشولس نے تائی وان میں اپنا ایک الگ چرچ قائم کرلیا ہے تاکہ وہ عام عیسائیوں کی نظروں سے اوجھل ہوکر عبادت کرسکیں۔ فی الحال اس چرچ کی جگہ مخفی رکھی گئی ہے جہاں وہ بند دروازوں کے اندر ''عبادت'' کرتے ہیں۔ جاپان کے فلم ساز Ryosuke Hashiguchi کو اٹلی میں منعقد ہونے والے ۱۲ویں بین الاقوامی فلم فیسٹیول میں اُن کی ہومیوسکشول فلم Like Grains Of Sand کو بہترین فلم ہونے کا

---

(۱) پائنیر ۱۴/جنوری ۱۹۸۸

انعام دیا گیا۔ فیسٹیول کی جیوری نے اُسے بہترین فلم قرار دیا جس میں تمام فرسودہ نظریات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہم جنسوں کے درمیان محبت کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کی یونیورسل ویلیو ہے! کناڈا کے دو محققین نے ایک نئی تھیوری یہ پیش کی ہے کہ انسان کے ہاتھ کی ہتھیلی میں پائے جانے والے نشانات اور میل ہوموسکشولٹی میں گہرا تعلق ہے لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرد کا جنسی برتاؤ اس کی پیدائش سے پہلے ہی طے ہوجاتا ہے۔ اونٹریو یونیورسٹی میں اِن تحقیق کرنے والوں نے یہ پایا کہ ہوموسکشول افراد کی بائیں ہتھیلی میں زیادہ Ridges ہوتی ہیں اور یہ افراد زیادہ تر بائیں ہاتھ سے کام کرتے اور لکھتے ہیں لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

There Is A Biological Component To Sexuality جنسی برتاؤ کے لئے ایک حیاتیاتی بنیاد ہے!

گے (Gay) کیپٹل آف یورپ

فریڈرک دی گریٹ کے زمانے سے اور خاص طور پر قیصر ریچ (Kaiser Reich) اور ویمر ری پبلک (Weimer) کے زمانے سے برلن یورپ کے دانشوروں، مصنفوں اور آرٹسٹوں کے لئے ''الڈوریڈو'' (Eldorado) بنا ہوا ہے۔ حال میں برلن میوزیم نے ایک الڈوریڈو نمائش منعقد کی جس میں ۱۸۳۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے معروف ہوموسکشولس کی کتابیں، اُن کے فوٹوگراف، تاریخی دستاویزات، پینٹنگ ومصوری کے نمونے اور اُن کی روزمرہ کی زندگی اور کلچر سے متعلق اشیاء کو دیکھنے کے لئے رکھا گیا۔ میوزیم کے ڈائریکٹر نے کہا کہ برلن نے ہمیشہ ہوموسکشولیٹی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہوموسکشولیٹی کی پہلی تنظیم یہیں قائم ہوئی، پہلا رسالہ یہیں سے نکلا، پہلا سکشول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یہیں قائم کیا گیا! موصوف نے بتایا کہ برلن میں ایک لاکھ سے زیادہ ہوموسکشول مرد وعورتیں رہتی ہیں اور یہ شہر اب تک یورپ کا ''گے کیپٹل'' بنا ہوا ہے۔

جرمنی کے ہی دوسرے شہر ہیمبرگ میں پہلا ''آل میل بروتھل'' کھولا گیا ہے جس کے کھلتے ہی ہزاروں لوگ اس کے ممبر بن گئے۔ ہیمبرگ سٹی فادرس کا کہنا ہے کہ کوئی قانون شکنی نہیں کی گئی بلکہ ویمنس لب نے اسے جنسی مساوات کی طرف ایک مفید قدم بتایا۔ اس بروتھل کے لئے انتخاب کافی سخت (Tough) رہا۔ عورتوں پر مشتمل پینل کے سامنے تمام

مردوں کو پیش ہونا پڑا جہاں اُن کی ذہانت اچھے اطوار، تیز پیشہ کے لئے موزونیت کو دیکھتے ہوئے انتخاب کیا گیا۔ صرف جسمانی طاقت ہی کو نہیں بلکہ تعلیم اور عام دلکشی ورعنائی (Charm) کو بھی مدنظر رکھا گیا۔ اس پروجیکٹ کے نگراں نے بتایا کہ لڑکیاں اکثر ریسٹورینٹ سے اُٹھتے ہوئے یہ کہتی تھیں کہ کاش کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں ہم بھی لطف اندوز ہونے جاسکتے جیسے کہ مرد جاتے ہیں۔ اب ان کے لئے ایسی تفریح گاہ قائم ہوگئی ہے!

۲۸ رجون ۱۹۶۹ء کو نیویارک میں پولیس نے ایک گے پریڈ پر حملہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں زبردست فسادات ہوگئے تھے۔ اُسی کے بعد ہوموسکشولس نے اپنے حقوق کی مانگ زیادہ تیز کردی، اُسی واقعہ کا جشن منانے کے لئے ۲۸ رجون ۱۹۹۶ء کو برلن میں Gay Pride Day ایک شاندار پریڈ نکالی گئی جس میں حصہ لینے کے لئے ملک بھر سے دس ہزار مرد وعورتیں برلن میں جمع ہوئیں اور ستر موٹروں پر بینرس پھیراتے ہوئے سڑک پر اپنی مانگ کرتے ہوئے گیز نکلے۔ انہوں نے کہا کہ گیز کے ساتھ کی جانے والی تفریق ختم کی جائے، اس پریڈ میں گے پولیس والے بھی اپنی یونیفارم پہنے شامل ہوئے جنہیں ڈیوٹی والے پولیس مین بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ سب سے آگے کی موٹر پر The Naked Civil Servant کی ستاسی سالہ مصنفہ Quertin Crisp تھیں جنہوں نے بتایا کہ وہ پہلی بار برلن آئی ہیں اور یہاں کے بااثر لوگوں سے مل کر اپنے مقصد کی وضاحت کریں گی تاکہ مرنے سے پہلے وہ اپنے مقصد کی ترویج زیادہ سے زیادہ لوگوں میں کرسکیں! انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں ہیٹروسکشولس سے کوئی بیر نہیں لیکن وہ ہمارے لئے پرابلم بن رہے ہیں۔

پیرس میں Gay Parade 2000 کے جشن کی تیاریاں بڑے دھوم دھام سے کی گئیں جس میں دولاکھ گیز اور لیزبین نے شرکت کی۔ سجی سجائی خوبصورت گاڑیوں پر رنگ برنگی پوشاک پہنے ملک کی 155 انجمنوں کے سربراہ شان کے ساتھ رونق افروز تھے۔ فرانس کے وزیر تعلیم بھی جلوس کا خیر مقدم کرنے تشریف لائے! انہوں نے بتایا کہ حکومت جلد ہی ایسا قانون وضع کرنے جارہی ہے جس کی رُو سے دفاتر اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے ہم جنس پرستوں سے برتی جانے والی تفریق ختم کردی جائے گی۔

اسپین کی راجدھانی میڈرڈ میں بھی گے پریڈ 2000 کے موقع پر ایک شاندار جلوس نکالا گیا (یہاں 1978 تک ہم جنسیت غیر قانونی تھی) لندن میں بھی ایک پُررونق

جلوس نکالا گیا جس میں ۵۷ ہزار گیز شریک ہوئے۔ اٹلی کے دارالسلطنت روم میں پاپائے روم کی سخت مخالفت کے باوجود گے پریڈ نکالی گئی جس میں دو لاکھ سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ رومن کیتھولک چرچ اور حضرت مسیح کی ولادت کے دو ہزار سال پورے ہونے کے موقع پر چرچ کے اکابرین نے اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن گیز نے ان سُنی کرتے ہوئے پورے تزک واحتشام کے ساتھ یہ جلوس نکالا جس میں آگے ایک بینر پر جلی الفاظ میں یہ لکھا تھا:

''اُن تمام ہم جنس پرستوں کی یاد میں جنہیں کیتھولک چرچ نے ستایا اور ہلاک کردیا''۔

ویٹکن نے اس موقع پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ ''لواطت جیسے غیر فطری عمل کو مسیحی تعلیمات کے یکسر منافی اور گناہ مانتا ہے۔ اس مقدس موقع پر اس جلوس کا نکالا جانا انتہائی قابل مذمت ہے۔

جرمنی کے ایک سائکالوجی انسٹی ٹیوٹ کے صدر الون ہیمرس (Alwin Hammers) نے ٹیلی ویژن چینل پر انٹرویو کے دوران بتایا کہ جرمنی میں ہر چار رومن کیتھولک پادریوں میں ایک ہوموسکشول ہے، حالانکہ بشپ یہ جانتے ہیں لیکن ایسے پادری اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اگر اُن سب کو علیحدہ کردیا جائے تو اُن کا روحانی پیشوائی کا کام خاصی حد تک متاثر ہوجائے گا، اس لئے جانتے ہوئے بھی وہ دانستہ غفلت برتتے ہیں۔ ملر Miller (جنہوں نے اس موضوع کا کافی گہرائی سے تجزیہ کیا ہے) کا کہنا ہے کہ نوجوان لڑکوں کو شروع سے ہی اس لت میں مبتلا کردیا جاتا ہے، انہیں ٹریننگ دے کر ایسا ذوق رکھنے والوں کے حلقہ میں پہنچا دیا جاتا ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ Sexual Maladjustment کی یہ پرابلم فوری توجہ کی مستحق ہے لیکن بظاہر اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔

امریکا میں ہوموسکشولٹی کی زبردست تبلیغ

پری پورنا نندورما لکھتے ہیں کہ (۱)

''دُنیا کے کسی ملک میں ہوموسکشولٹی اور لیزبین ازم (Lesbianism) کی اتنی بے شرمی

(۱) "Sex Offences In India & Abroad : p 78"

کے ساتھ تبلیغ نہیں کی جاتی جتنی امریکا میں یہاں تقریباً چالیس ہزار گے بارس (Gay Bars) ہیں جونہایت شاندار آراستہ وپیراستہ، نغموں اور خوشیوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ یہ بارس تفریح کے علاوہ ایک طرح سے گیز کے مارکیٹ پلیس ہوتے ہیں جہاں مصنف، دانشور، آرٹسٹ، بڑے تجار، میل اور فی میل پراسٹی ٹیوٹ، "Drag Queens" ہیٹروسکشولس اور Sado Masochists ہر قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اب یہاں چرچ میں بھی گے رقص ہوتے ہیں اور Gay Synoag gues بھی ہیں۔ یہاں آٹھ سو گے گروپس شمار کیے جاچکے ہیں۔ ان کا اپنا بائی ویکلی رسالہ ہے جس کا سرکولیشن ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے اور نیشنل گے ٹاسک فورس کے 2,200 ممبر ہیں۔ ٹائم میگزین نے تخمینہ لگایا ہے کہ کلی طور پر Exclusive ہوموسکشولس کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ ہے اور اگر سیاہ فام اور چھپے ہوئے (Closet) ہوموسکشولس کو بھی شامل کرلیا جائے تو مجموعی تعداد دو کروڑ (200 ملین) تک ہوجائے گی۔

لاس اینجلس کے ایک مصنف نے اپنی کتاب For Love Or Money میں لکھا ہے کہ ۱۳ سے ۱۶ سال کی عمر کے ایک لاکھ سے زیادہ امریکن لڑکے جو ورکنگ کلاس یا ویلفیئر خاندانوں سے بھاگ کر آئے ہیں وہ پراسٹی ٹیوشن میں لگ گئے ہیں۔ اس ٹریڈ کا ایک نیشنل گائڈ "Where The Boys" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کی قیمت پانچ ڈالر ہے اور اس کی ستر ہزار کاپیاں فروخت ہوچکی ہیں۔ ٹائم نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ''کوئی نہیں جانتا کہ آج کتنے امریکن ہوموسکشول ہیں''۔

گیز رُومانس کی تلاش میں ہوتے ہیں نہ کہ جنس کی

نیویارک سے شائع ہونے والے گیز کے ایک میگزین نے اپنے تیرہ ہزار قارئین کو ایک سوالنامہ بھیج کر اُن کے افکار وخیالات جاننے کی کوشش کی تو یہ معلوم ہوا کہ گے افراد رُومانس اور لمبے وقفہ کی رفاقت کے زیادہ خواہشمند ہوتے ہیں بہ نسبت جنسی تعلق کے۔ انہوں نے کہا کہ وہ سیکس کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن محبت کے بغیر نہیں۔ ۷۱ فیصدی گیز کا کہنا تھا کہ وہ لمبے وقفہ کے Mono gamous تعلق کے زیادہ خواہشمند رہتے ہیں بجائے کسی دوسرے تعلق کے۔ گیز کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ کھل کر اپنا گے ہونا تسلیم کرتے ہیں

جبکہ ہیٹروسکشولس میں صرف ۲۹ فیصدی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ گے مذاق بھی رکھتے ہیں۔ گیز نے یہ بھی اعتراف کیا کہ وہ اپنے حسن کو برقرار رکھنے کے لئے جسمانی ورزش کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ ان کی جانب التفات سے دیکھیں۔

نیویارک گے پراسٹی ٹیوٹس کی آماجگاہ

پی۔ بی۔ گیٹے لکھتے ہیں کہ نیویارک کی ۴۲ ویں اسٹریٹ ہوموسکشول پراسٹی ٹیوٹس کی بھی آماجگاہ ہے جنہیں ''گیز'' اور ''فے ریز'' (Gays & Fairies) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ شام کے وقت چمکیلے بھڑکیلے کپڑے پہنے میک اپ کے ساتھ سڑک کے دونوں کناروں پر ان کے گروہ در گروہ کھڑے رہتے ہیں جن میں فاعل اور مفعول دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان کی اکثریت بیس سال کی عمر والوں کی ہوتی ہے لیکن اکثر کم عمر لڑکے بھی اس کجروی میں ملوث ہونے کے لئے اپنے کو پیش کردیتے ہیں۔ پولیس انہیں گرفتار نہیں کرسکتی کیونکہ وہ سول حقوق کے تحفظ کا آئینی سہارا لئے رہتے ہیں۔ حکومت کے ایک ٹاسک فورس نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ برطانیہ کی طرح وہ اپنے یہاں بھی طرفین کی رضامندی سے ہونے والے ہوموسکشول تعلق کو جائز قرار دے دے۔ ڈاکٹروں، ماہرین قانون اور ماہرین سماجیات کے ایک پینل نے اندازہ لگایا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکا میں کم از کم تین چار ملین بالغ افراد لواطت کا ذوق رکھتے ہیں اور اُن کے علاوہ بڑی تعداد میں دوسرے افراد بھی ایسا رُجحان (Tendencies) رکھتے ہیں اور متعدد ہوموپوس اور لیزبین نے شادی کی درخواست بھی دی ہے۔ لیزبین خواتین کا کہنا ہے کہ آزادیٔ ضمیر کی بناء پر اُن کے رشتہ کو اُسی طرح قانوناً جائز سمجھا جانا چاہئے جیسے کہ ہیٹروسکشول رشتے اور اسی نقطۂ نظر سے اُن کے وکلاء نے عدالت میں بحث بھی کی لیکن عدالت نے اسے Perverted Lust کہتے ہوئے تسلیم نہیں کیا۔

نیویارک میں ہی دُنیا کی تاریخ میں پہلی گے اکیڈمکس کی کانفرنس ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی جس میں دُنیا کے مختلف ملکوں سے ہوموسکشول ٹیچرس، پروفیسر اور طلباء جمع ہوئے۔ کانفرنس کے صدر نے پرزور الفاظ میں کہا کہ ''ہمیں نیست ونابود کردینے کی سازشوں کو اب ہم خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے''۔ ایک کال بوائے ریکٹ پیرس

سے آپریٹ کرتا ہے جو ہوموسکشول کلائنٹ کیلئے کام کرتا ہے جس میں ارباب سیاست تک شامل ہیں۔ پیرس کی سوسائٹی کے ہپی اور آوارہ مزاج لڑکے لندن تک بھیجے جاتے ہیں۔ پیرس، روم اور جنیوا میں قائم کال گرل ریکٹ کے نٹ ورک کے اشتراک و تعاون سے یہ 'کال بوائے' ریکٹ اپنا کام کررہا ہے۔ سری لنکا کی شہرت وہاں تک پھیلی ہوئی ہے جہاں کے خوبصورت لڑکے بڑی تعداد میں مرد بیسواؤں کا رول ادا کرتے ہیں۔ جزیرہ کے جنوبی ساحل پر متعدد ایسے ٹورسٹ ریزارٹ ہیں جہاں غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں اوران سے جنسی تلذذ حاصل کرتے ہیں۔ حکومت ایڈس کے مرض سے لاحق خطرات کے پیش نظر ایسی کارگزاریوں پر کڑی نظر رکھتی ہے لیکن اُسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو پارہی ہے۔

چرچ نے بھی سپر ڈال دی

حالانکہ سوڈامی کو (Sodomy) ایڈس کے مرض کے پھیلنے کا اہم سبب قرار دیا جاتا ہے پھر بھی اس 'کجروی' کی سرپرستی عمائدین چرچ بھی کررہے ہیں۔ حال میں Central Conference Of American Rabbis (CCAR)(۱) نے چار ہزار سال قدیم یہودی روایات کو توڑتے ہوئے یہ طے کیا کہ ہوموسکشول ربیز بھی امریکا اور کناڈا میں عبادت گاہوں میں امامت کے منصب پر فائز ہوسکیں گے! CCAR میں ریفارمسٹ گروپ عرصہ سے یہ مانگ کررہا تھا تب ۷ ممبر پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کردی گئی جس نے چار سال کے بحث و مباحثہ کے بعد یہ متفقہ فیصلہ کرلیا تھا جسے رزولیوشن کی صورت میں CCAR میں رکھا گیا جہاں بھاری اکثریت سے اس تجویز کو پاس کردیا گیا کہ ربیز کو خواہ اُن کا Sexual Orientation کچھ بھی ہو، جب وہ اس ''مقدس'' Vacation سے منسلک ہوگئے ہیں تو انہیں امامت کے مقدس فریضہ کو ادا کرنے کی اجازت دی جانا چاہئے!

نیو جرسی (امریکا) کے ۱۲۵ Episcopal Parishes نے اس امر کی موافقت میں ووٹ دیئے کہ ہوموسکشولس اور غیر شادی شدہ جوڑوں کو بھی چرچ کی بلسنگس دی جائی

(۱) CCAR ۱۳ لاکھ یہودی ربیز کی تنظیم ہے جو ۱۵۰۵ کانگریگیشن کو کنڈکٹ کراتے ہیں۔ یہ کانفرنس ۲۷ جون ۱۹۹۰ء کو منعقد ہوئی جس میں یہ تاریخی فیصلہ لیا گیا۔

چاہئیں۔ چونکہ اب شادی کے بارے میں رجحانات میں نمایاں تبدیلیاں ہوگئی ہیں اور بہت سی عورتیں اپنے کیریر کی وجہ سے یا تو شادی دیر سے کرتی ہیں یا بغیر شادی کئے ہی کسی کے ساتھ رہنے لگتی ہیں، لہٰذا چرچ کو ایسے رشتہ کو اور شادی سے قبل جنسی تعلق کو تسلیم کرلینا چاہئے۔ ہوموسکشولس کو بھی خدا کی عبادت کرنے کا اتنا ہی حق ہے کہ ہیٹروسکشول جوڑوں کو اور اس حقیقت کو اب چرچ کو مان لینا چاہئے۔

انگلستان میں ایک گرما گرم مباحثہ لمبے عرصہ تک اس موضوع پر چلتا رہا کہ ہوموسکشولیٹی کے بارے میں چرچ کیا موقف اختیار کرے۔ قدیم مکتب خیال کے پادریوں نے بائیبل کے اخلاقی نظام کو برقرار رکھنے پر اصرار کیا جس میں غیر منکوحہ عورت سے زنا (Fornication) فحاشی اور استلذاذ بالمثل کو ہر صورت میں گناہ قرار دیا گیا ہے لیکن لبرل پادریوں نے اس نقطۂ نظر کی تائید کی کہ ہوموسکشولیٹی ایک غیر فطری عمل ہے لیکن یہ بھی کہا کہ ہمیں ہوموسکشولس کو رحم کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اسی لئے جب یہ سوال آیا کہ جو پادری اس غیر فطری عمل میں ملوث پائے جائیں انہیں علیحدہ کردیا جائے یا نہیں؟ تو اکثریت نے انہیں برطرف کئے جانے کی مخالفت کی اور اس طرح جیت لبرل نقطۂ نظر والوں کی ہی ہوئی۔

برطانیہ میں جانبین کی رضامندی سے لواطت جائز

برطانیہ میں بڑھتی ہوئی فحاشی کے پیش نظر حکومت نے ایک سرکاری کمیٹی کا تقرر کردیا تھا کہ ملک میں بڑھتی ہوئی بیسوائی اور ہم جنس پرستی وغیرہ کا غائر مطالعہ کرکے حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیٹی کے صدر ۵۱ سالہ سرجان والفنگڈن تھے جو ریڈنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ پندرہ ممبروں پر مشتمل اس کمیٹی میں مشہور ماہرین قانون، پیرس، ڈاکٹر، پادری وغیرہ شامل تھے۔ تین سال کی تحقیقات کے بعد کمیٹی نے حکومت کو جو رپورٹ دی اس میں یہ سفارش کی کہ:

- بالغ مردوں کے درمیان لواطت کو اگر باہمی رضامندی سے ہو تو اُسے جرم نہ قرار دیا جانا چاہئے۔ (بلوغ کے لئے ۲۱ سال کی عمر تجویز کی گئی)
- اس سے کم عمر کے مردوں کو لواطت میں مبتلا ہونے پر مجرم نہ سمجھا جائے کیونکہ

مناسب توجہ اور نگرانی سے اُن کی اصلاح ممکن ہے۔

+ ۲۱ سال سے کم عمر لڑکوں کے ساتھ لواطت میں مبتلا پائے جانے والے مردوں کو سخت سزائیں ملنی چاہئیں تاکہ نوعمر لڑکوں کو مردوں کی ہوسناکی سے بچایا جا سکے۔

کمیٹی لواطت کو جرم کیوں نہیں قرار دینا چاہتی اس کی دلیل دیتے ہوئے رپورٹ میں لکھا گیا کہ:

''شہریوں کی نجی زندگی میں قانون کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ یہ قانون کا دائرۂ عمل ہے کہ وہ شہریوں کے لئے کوئی متعین راہ عمل Pattern Of Behaviour طے کرے سوا اس صورت میں کہ جہاں مفاد عامہ یا شہریوں کے تحفظ کا سوال ہو''۔

قانون کے دائرۂ عمل کا تعین کرتے ہوئے کمیٹی نے لکھا کہ ''قانون کو ہر ایسے فعل کو جرم قرار دینا چاہئے جس کا ارتکاب کھلے ہوئے مقامات پر کیا جائے جہاں پبلک کے عام افراد اُسے دیکھ کر ناگواری محسوس کریں لیکن جہاں ایسی عام ناگواری کا امکان نہ ہو وہاں یہ افراد کی ذاتی ذمہ داری کا معاملہ ہو جاتا ہے اور ہماری رائے میں یہ قانون فوجداری کے مناسب حدود کے باہر ہے''۔

کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے وقت (۱۹۵۷ء) برطانوی قوانین میں جرم خلاف وضع فطرت کی سخت سزائیں مقرر تھیں لیکن اس رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد اس غیر فطری عمل کو قانوناً جائز کئے جانے کی مانگ نے زور پکڑ لیا اور بالآخر یہ کوششیں کامیاب ہو گئیں اور ملک کے چھ سو سال قدیم قوانین میں تبدیلی کر کے ۱۹۶۷ء سے جانبین کی رضامندی سے لواطت کو جائز قرار دے دیا گیا صرف شرط یہ رکھی گئی کہ یہ فعل پرائیوٹ جگہ پر مثلاً فلیٹ وغیرہ کے اندر ہو اور فریقین کی عمر ۲۱ سال سے متجاوز ہو۔

مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر چارلس موکریڈس نے بتایا کہ ''عورتوں کی خلاف فطرت جنسی بدکاریوں کا مسئلہ دُنیا بھر میں ایک نازک صورت اختیار کر گیا ہے اور اس کی شدت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ جن ملکوں میں مردوں کی خلاف فطرت شہوانی زندگی پر قانونی پابندیاں لگائی گئی ہیں وہاں بھی یہ قانون عورتوں کی باہمی بداعمالی پر نافذ نہیں ہوتا اور یہ عمل شنیع برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ برطانیہ میں دوسری جنگ عظیم کے

بعد سے مردوں کے خلاف فطرت اعمال میں اضافہ چھ سو فیصدی کا ہو گیا۔ اس کا ردِّ عمل عورتوں پر ہونا ضروری تھا۔ (۱)

لبرل ازم اور انفرادی آزادی کا تصور مغرب میں حد سے زیادہ متجاوز ہو گیا ہے اور لوگوں کے جنسی کردار کو ڈی ریگولیٹ Deregulate کرنے کے لئے قوانین میں بھی ترمیم کی جا رہی ہے۔ غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق اگر باہمی رضامندی سے ہے تو مغربی معاشرہ میں اُسے بالکل روا سمجھا جاتا ہے اور کوئی جرم نہیں مانا جاتا۔ حال میں برطانوی حکومت نے ملک کے جنسی قوانین کا جائزہ لینے کے لئے پندرہ ممبران پر مشتمل کرمنل لا رویزن کمیٹی تشکیل کی (جو ہمارے ملک کے لا کمیشن کی طرح ہے) اس کمیٹی نے کچھ ایسی تجویزیں رکھیں جو انتہائی مکروہ (Revolting) ہیں مثلاً ایک تجویز یہ تھی کہ اگر بھائی بہن میں جنسی اختلاط (Incest) ہوتا ہے تو اگر ان کی عمر ۲۱ سال سے متجاوز ہو تب اسے قانوناً جرم نہ سمجھا جانا چاہئے۔ دوسری تجویز سوڈامی (Sodomy) کے متعلق تھی جس کیلئے ابتک رضامندی کی عمر ۲۱ سال تھی، کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ اسے گھٹا کر ۱۶ سال کر دیا جائے تاکہ وہ بھی اُس کاؤنسلنگ کا فائدہ اٹھا سکیں جو ایسے لڑکوں کو دی جاتی ہے۔ (۲)

جے۔ ڈی۔ اختر اپنے ''لندن نیوز لیٹر'' میں لکھتے ہیں کہ ''برطانوی حکام گے فریڈم ڈے کی پریڈ کو روکنے میں ناکام رہے تو ہزاروں ہوموسکشولس (جن میں پروفیسر، مصنف اور ڈاکٹر شامل تھے) نے اس میں شرکت کی۔ ایک وکار (Vicar) نے دو ہوموسکشولس میں ''شادی'' کرائی...... دو ہوموسکشولس برطانیہ سے سان فرانسسکو کی گے پریڈ کی اگوائی کرنے جا رہے ہیں'' ''گے نیوز'' کے ایڈیٹر (جو خود ایک مرد سے شادی کئے ہوئے ہیں) اس گے کیپٹل آف دی ورلڈ میں آئے اور پریڈ کی کارروائی کی تکمیل کی جس میں ڈھائی لاکھ افراد کے شریک ہونے کا امکان ہے اور خود اپنی ''شادی'' کی آٹھویں سالگرہ بھی یہیں منائی!

ڈنمارک نے ہوموسکشول شادیاں جائز قرار دیں

ڈنمارک دُنیا کا پہلا ملک ہے جس نے دو ہم جنسوں کے درمیان شادیوں کو جائز

(۱) صدق جدید۔ ۱۹/جنوری ۱۹۶۲ء

(۲) ''ریڈینس ویکلی'' دہلی: ۵/مئی ۱۹۸۹ء

قرار دے دیا ہے اور گے مرد و عورتوں کو وراثت، مکانات کے الائمنٹ، ٹیکس، طلاق وعلیحدگی میں وہی حقوق دے دیئے ہیں جو ہیٹروسکشول جوڑوں کو ملتے ہیں۔ ڈنمارک کی پارلیمنٹ نے یہ قانون ۱۹۸۹ء میں پاس کر دیا اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دس گے جوڑوں نے اکتوبر ۱۹۸۹ء میں باہمی ''شادیاں'' کر لیں۔ کوپن ہیگن کے میئر کی صدارت میں ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں ممبران پارلیمنٹ، میڈیا رپورٹر، فوٹو گرافر اور دُنیا کے مختلف ملکوں سے آئے ہوئے جرنلسٹ اس عجیب وغریب شادی کی تقریب کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے! ملک کے ہوموسکشولس کی ایسوسی ایشن جو ۱۹۸۴ء سے قائم ہے، مسلسل ان حقوق کے لئے جدوجہد کرتی آئی ہے۔ دوسرے ملکوں سے گیز ایسی شادیوں کے لئے ڈنمارک بڑی تعداد میں نہ آنے لگیں، اس لئے قانون میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ ایک فریق کا ڈنمارک کا باشندہ ہونا لازمی ہوگا۔ ڈنمارک کے بعد ناروے نے ۱۹۹۳ء میں ایسا ہی قانون پاس کر دیا اور ان دونوں ملکوں کی نظیر کو صحیح مانتے ہوئے سویڈن کی پارلیمنٹ نے گرما گرم مباحثہ کے بعد 171-141 ووٹ سے جون ۱۹۹۴ء میں وہ قانون پاس کر دیا جس کی رُو سے ایک ہی جنس کے دو افراد میں شادی کی قانونی اجازت دے دی گئی لیکن بچوں کو Adopt کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

۲۸/جون ۱۹۶۹ء کی اسٹون وال بغاوت کی یاد میں (جس کا ذکر صفحہ 191 پر آچکا ہے) کوپن ہیگن میں Europride کے نام سے ہر سال ایک جشن منایا جاتا ہے جس میں ہوموسکشولس آرٹ کی نمائش، رقص کنسرٹ اور موسیقی کے پروگرام کر کے دُنیا کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ وہ کتنی بڑی تعداد میں ہیں اور ان کے خلاف معاشرہ میں جو تعصب (Prejudices) ہیں وہ ختم کئے جائیں۔ ۱۹۹۶ء کے جشن میں ۳۵ ہزار ہوموس نے شرکت کی!

سویڈن ہوموسکشولس کو حقوق دینے کے معاملہ میں دوسرے تمام ملکوں سے آگے ہے یہاں تو اس پر بھی غور کیا جا رہا ہے کہ ملکی قوانین میں ایسی ترمیم کر دی جائے کہ دوسرے ملکوں کے ہوموسکشولس کو یہاں پناہ (Asylum) دی جاسکے! جن کے اُوپر دوسرے ملکوں میں زیادتی کی جا رہی ہے اور انہیں ان کے حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ برازیل کے ہوموس نے یہ خبر سنتے ہی سویڈن کے سفارت خانہ کو پھولوں کے تحفے بھیجے اور

Asylum کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے کی درخواست کی۔

رومن کیتھولک مسلک کو سختی سے ماننے والے ملک آسٹریا میں پہلی ''لیزبین عورتوں'' کے درمیان شادی ستمبر ۱۹۹۶ء میں منعقد ہوئی! وائنا کے ایونجلکل چرچ میں اس عجیب وغریب تقریب کو دیکھنے کے لئے سو سے زیادہ افراد جمع ہوئے، حالانکہ چرچ نے اس شادی کی سروس پر اعتراض کیا لیکن مقامی منسٹر نے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے سروس انجام دی۔ ہوموسکشول حقوق کے حامیوں نے اس سروس کو سراہا کہ اس سے ان کی تحریک کو تقویت مل گئی۔

امریکا کی ریاست ہوائی میں تین ہوموسکشول اور لیزبین جوڑوں نے آپس میں شادی کرنے کا دعویٰ عدالت میں پیش کر دیا اور ایسے آثار تھے کہ انہیں اجازت بھی مل جائے گی۔ (ستمبر ۱۹۹۶ء) اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے امریکی سینٹ نے بڑی اکثریت (85-14) سے گے اور لیزبین شادیوں کو ممنوع کرنے کا قانون پاس کر دیا اور یہ وضاحت کر دی کہ شادیاں قانونی حیثیت سے جب ہی جائز مانی جائیں گی جب وہ دو مختلف جنسوں کے فریقین کے درمیان ہوں! صدر کلنٹن نے رات ۱۲ بجے اس مسودۂ قانون پر دستخط کئے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس میں ذرا بھی تاخیر ہو بعد میں ایک تحریری بیان میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ اسکے سخت مخالف ہیں کہ دو ہم جنسوں کے درمیان شادی ہو اور وہ چاہتے ہیں کہ حکومت سختی کے ساتھ ایسی کوششوں کو ناکام کر دے'' بعد میں گے حقوق کے حمایتیوں نے اُن کے اس موقف کی پُرزور مخالفت کی!

گے ٹورازم آسٹریلیا میں

آسٹریلیا کے دارالسلطنت سڈنی میں Mardi Gras کے مقام پر گے ٹورسٹ کے لئے اتنا رنگین دلفریب اور پُرکشش ماحول تیار کر دیا گیا ہے کہ ساری دُنیا سے گے ٹورسٹ اب یہاں آکر چھٹیاں گزار کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سڈنی کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر ہر سال پانچ لاکھ گیز (Gays) پریڈ میں حصہ لیتے ہیں اور یہ سارا منظر اسٹیٹ کے ٹی وی پر دکھایا جاتا ہے جس میں خوبصورت لڑکوں کو گاتے بجاتے، ناچتے تھرکتے اور لیزبین جوڑوں کو موٹر سائیکلوں پر سوار بوس وکنار کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ ایک گے ٹریول ایجنسی کے مالک نے کہا ''چونکہ آسٹریلیا میں رواداری معاشرہ (Tolerant

(Society) ہے اس لئے بڑی تعداد میں گیز کھنچ کر یہاں آتے ہیں اور گے بین الاقوامی ٹورسٹ نقشہ پر آسٹریلیا نے اپنے لئے ویسا ہی مقام حاصل کرلیا ہے جیسا کہ امریکا میں (Palm Springs) اور یونان میں Mykonos کو حاصل ہے۔ ایک ماہ تک چلنے والے اس جشن میں شرکت کے لئے برطانیہ، یورپ اور امریکا سے دس ہزار گے ٹورسٹ ہر سال آتے ہیں اور یہاں کی ایکانومی (Economy) کو 44 ملین امریکی ڈالر کا نفع پہنچا جاتے ہیں۔ گیز کو اپنی دلچسپی کے سب ہی سامان سڈنی میں مل جاتے ہیں۔ خوبصورت لڑکے، Drag Queens اور پرسکون ماحول میں بار و کیفے۔ دوسرے سرے پر Turtle Cove ہے جو اپنے پرسکون ماحول بار و ریسٹورنٹ کے لئے مشہور ہے، یہاں مہمان انتہائی پرسکون ماحول میں Relax کرسکتے ہیں اور دیکھنے والوں پر کوئی ردِّ عمل نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنے پارٹنر کو گلے لگا کر بوس و کنار میں مصروف ہو جائیں تب بھی کوئی ناخوشگواری کا احساس نہیں ہوتا۔ یہاں تفریح کی وہ ساری چیزیں مہیا ہیں جو ٹورسٹ تلاش کرتے ہیں۔ Reef Trips ڈائیونگ کورسس اور کچھ دوسری مخصوص خدمات...... بھی۔

اسی آسٹریلیا میں دو عورتوں میں لیزبین (Lesbian) تعلق آٹھ سال سے تھا اور عورت اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رہتی تھی، اسی درمیان مادرانہ جذبہ سے متاثر ہو کر اس نے مصنوعی طریقے سے ایک بچہ کو جنم دیا اور اُس بچہ کی پرورش کے لئے معقول رقم دیئے جانے کا مطالبہ عدالت میں پیش کردیا۔ آسٹریلیا کی سپریم کورٹ نے 151 ہزار ڈالر کی رقم اُس عورت سے دلوانے کا حکم صادر کردیا۔ آسٹریلیا کے گے حقوق کے علمبرداروں نے اس فیصلہ کو بہت سراہا اور اس پر اپنی بے پایاں مسرت کا اظہار کیا کیونکہ اس سے ہوموسکشول تعلقات کو قانونی طور پر تسلیم کئے جانے کی نظیر مل گئی! دفاع کے اس عذر کو عدالت نے تسلیم نہیں کیا کہ ان کا تعلق صرف مالی اخراجات میں شرکت کی بنا پر تھا عدالت کے پاس وہ ثبوت تھے جن میں ان دونوں نے اپنے اثاثہ میں ایک دوسرے کو حصہ دار بنانے کی وصیت کر رکھی تھی اور کرسمس نیز سالگرہ کے موقعہ پر ایک دوسرے کو مبارکباد کے کارڈ بھیجتی رہتی تھیں!

گیز کے لئے علیحدہ منی ٹاؤن کی تعمیر

بنکاک کے ایک بلڈر نے بنکاک سے 160 کیلومیٹر دور ایک ایسے منی شہر کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا ہے جس میں صرف گے اور لیزبین افراد کی رہائش کے لئے پوری سہولتیں

مہیا ہوں گی۔ اسی ایکڑ کی اس رہائش گاہ میں اپارٹمنٹ، ہوٹل، بار، اسنوکر ہال اور ہیلتھ کلینک وغیرہ سب ہوں گے اور یہاں خوبصورت لڑکے ہر قسم کی خدمت کے لئے مامور رہیں گے۔ یہاں شہر کے ماحول سے دور مخالفین کی نظروں سے اوجھل رہ کر گیز پرسکون زندگی گزار سکیں گے۔

چین میں بڑی تعداد میں ہوموسکشولس

چین کے باہر رہنے والے ایک مصنف An Ke Chiang نے چین میں رہ کر وہاں کے گے افراد، ان کے حقوق کی مانگ کرنے والے نمائندوں اور میڈیکل حکام سے مل کر چین میں پھیلی ہوئی ہم جنسیت کے متعلق مستند معلومات جمع کیں جنہیں اپنی کتاب "Dark Souls Under The Sun" میں شائع کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک میں تقریباً بارہ ملین ہوموسکشولس ہیں لیکن حکومت، معاشرہ اور خاندانی دباؤ کی وجہ سے وہ اپنے اس غیر فطری عمل میں مبتلا ہونے کا اظہار نہیں کرسکتے اور اپنے کو ہیٹروسکشول ہی بتاتے ہیں۔ وہ پہلے شادی کرلیتے ہیں اور بعد میں طلاق لے کر دوسری شادی نہ ہو سکنے کا عذر پیش کرتے ہوئے اپنے اسی ذوق میں مبتلا رہتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ۹۹ فیصدی گے افراد جن سے انہوں نے ملاقات کی یا تو شادی شدہ تھے یا انہوں نے کہا کہ شادی ناگزیر ہے۔ شنگھائی کے سیکس سوشیالوجکل سینٹر نے اپنے ایک سروے میں جو ۱۹۹۱ء میں کیا گیا تھا یہ پایا کہ دیہی علاقوں میں رہنے والے 2.3 فیصدی شادی شدہ افراد اس غیر فطری عمل میں ملوث ہیں اگر سو چینیوں میں ایک بھی اس ذوق میں ملوث مانا جائے تو ہوموسکشولس کی مجموعی تعداد بارہ ملین (ایک کروڑ بیس لاکھ) ہوگی! اتنے معاشرتی دباؤ کے باوجود کچھ ہوموسکشول چینی جوڑے ساتھ رہتے ہیں یا کھل کر آپس میں شادی کرلیتے ہیں۔ حالانکہ حکومت کو اطلاع ملنے پر انہیں سزا دی جاتی ہے اور کچھ مالکان تو ایسے اشخاص کو کام سے برطرف بھی کردیتے ہیں۔ معاشرہ کے اس عام رُجحان کے تحت کہ وہ بیمار ہیں کچھ افراد نے نفسیاتی کلنکس میں علاج بھی کرایا لیکن فائدہ بہت کم ہوا۔ بیشتر ایسے لوگ ایڈس سے نہیں بلکہ پولیس سے ڈرتے ہیں جو انہیں سرِ راہ عام پر انتہائی ذلیل کرتی ہے اور مالکان کو اطلاع ملنے پر وہ کام سے برطرف کردیئے جاتے ہیں اور گھر لوٹنے پر خاندان والے انہیں ٹھوکریں مار کر نکال دیتے ہیں۔

ہانگ کانگ، رُومانیہ اور ٹسمانیا میں سوڈامی جائز

پچاس لاکھ آبادی والی سابق برطانوی کالونی ہانگ کانگ نے بھی اپنے یہاں فریقین کی رضامندی سے استلذ اذ بالمثل کو جائز قرار دے دیا۔ ۲۱ سال کی عمر والے افراد اگر اس غیر فطری عمل میں ملوث ہوتے ہیں تو قانون انکے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریگا۔ ملک میں پانچ لاکھ سے زائد ایسے افراد ہیں جن میں معزز تاجر سرکاری افسران اور چرچ کے عمائدین بھی شامل ہیں۔ رُومانیہ نے بھی حال ہی میں ہوموسکشولٹی کو قانوناً جائز قرار دے دیا ہے لیکن وہاں رائے عامہ ابھی اسے بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے اور اگر ہوموسکشول فضیحہ کی صورت پیدا کردیتے ہیں تو انہیں سخت سزا بھی دی جاتی ہے۔ حال میں راجدھانی بوچارسٹ میں بین الاقوامی ہوموسکشولٹی کانفرنس منعقد ہوئی جسکی سخت مخالفت ارتھوڈاکس چرچ نے کی اور بہت سے معروف افراد نے شرکت سے بھی گریز کیا۔ آرچ بشپ نے کہا کہ اگر ایسے ایب نارمل افراد کے برتاؤ کو نارمل مانتے ہوئے انہیں معاشرہ میں معقول درجہ دیئے جانے کوشش کی جارہی ہے تو یہ انتہائی افسوسناک ہے اور اسے ناکام بنانا چاہئے۔

آسٹریلیا کے مغربی سرے پر ٹسمانیا کا چھوٹا سا جزیرہ ہے جہاں تقریباً ایک صدی سے وہ قانون نافذ تھا جس کی رو سے ہوموسکشولٹی اور Anal Sex کے لئے ۲۱ سال تک جیل کی سزا دی جانے کی دفعات تھیں۔ گے تحریک کے حمایتی عرصہ سے اسے دقیانوسی بتاتے ہوئے اس کی مخالفت کررہے تھے اور اُسے منسوخ کرانے کے لئے ۱۹۹۴ء میں انہوں نے اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کمیشن میں بھی عرضداشت پیش کی تھی۔ بالآخر گیز اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگئے اور مئی ۱۹۹۷ء میں ٹسمانیا کی پارلیمنٹ نے اس قانون کو منسوخ کردیا۔ حمایتوں کی پُرزور مانگ کے سامنے رائے عامہ کو جھکنا پڑا۔

ہندوستان میں بھی ہوموسکشولٹی کو جائز قرار دیئے جانے اور آئی۔ پی۔ سی کی دفعہ 377 کو مسترد کرنے کا مطالبہ

انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن (IMA) نئی دہلی کے ایک مذاکرہ میں (۱) (جس

(۱) مذاکرہ کے پینل میں یہ ڈاکٹر صاحبان شامل تھے۔ Dr. V.P. Varshney, Dr, Sanjeev Chugh, Dr. P. Prasad, Dr. Veena Agarwal ''ریڈینس'' ویکلی۔ نئی دہلی۔ ۵ مارچ ۱۹۹۴ء

میں چار مشہور ڈاکٹروں نے حصہ لیا) یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ہوموسکشولٹی کی از سر نو تعریف کی جانا چاہئے اور اس پر جو معاشرتی کلنک (Stigma) اور جرم کا لیبل لگا ہوا ہے اُسے ختم کیا جانا چاہئے۔ تعزیراتِ ہند کی دفعہ 377 میں اِسے جرم مانتے ہوئے سات سال کی جو سزا تجویز کی گئی ہے اُسے بھی مسترد کردیا جانا چاہئے۔ صرف Exploitory Homosexuality کو جرم سمجھا جانا چاہئے۔ مردانہ بیسوائی (Male Prostitution) کو بھی جرم نہ مانا جانا چاہئے کیونکہ مرد بیسوا کا سماج میں وہی درجہ ہے جو عورت بیسوا کا، انہیں صرف Safe Sex محفوظ جنسی تدابیر کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی جانا چاہئے۔ ڈاکٹر اگروال نے بتایا کہ امریکا میں آبادی کے 37 فیصدی افراد اپنی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں اس کا تجربہ ضرور کرچکتے ہیں۔

ہم سفر ٹرسٹ کی طرف سے پہلی بار ہندوستان میں گے کانفرنس کا انعقاد جنوری ۱۹۹۵ء میں ہوا جس میں گے کمیونٹی کو اختیارات سونپنے Empowerment اور ان کی شناخت (Identity) کو تسلیم کرنے کی مانگ کی گئی (۱)۔

اشوک راؤ کوی نے سہ روزہ مباحثہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ملک میں ہوموسکشولٹی خوب پھیلی ہوئی ہے لیکن صرف کچھ ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگر گے افراد کو بھی صحت کے خطرات سے آگاہ کرنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ان کی شناخت کی جائے کیونکہ حکومت اب تک ایچ۔آئی۔وی انفکشن کا انسداد کرنے کے لئے صرف ہیٹروسکشول آبادی کی طرف توجہ کررہی ہے۔ کانفرنس میں یہ بھی سفارش کی گئی کہ تعزیراتِ ہند ۱۸۶۰ء کی دفعہ 377 کو کامل طور پر منسوخ کردیا جائے تاکہ ہوموسکشولٹی کو ڈی کرمنلائز کیا جاسکے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی قدیم اخلاقی روایات والے اس ملک میں کسی حلقہ سے مخالفت کی کوئی آواز اٹھائی نہیں گئی!

ہوموسکشولس: قانونی حقوق کے مطالبات

بیشتر مغربی ملکوں میں ہوموسکشولس نے اپنی تنظیمیں بنالی ہیں اور اپنے قانونی حقوق کے تحفظ کے مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ کانفرنس منعقد

(۱) ٹائمس آف انڈیا ۲ رجنوری ۱۹۹۵ء

کرتے ہیں، شاندار ریلیاں نکالتے ہیں اور میڈیا کے توسط سے اس قسم کی مانگ دہراتے رہتے ہیں کہ انہیں وہی معاشرتی حقوق دیئے جائیں اور وراثت میں ویسے ہی حصہ دیا جائے جیسا کہ ہیٹروسکشول جوڑوں کو دیا جاتا ہے۔ سرکاری ملازمتوں، مکانات کے الاٹمنٹ اور پبلک رہائشی اپارٹمنٹ میں ان کے ساتھ تفریق Discrimination نہ برتا جائے۔ وہ یہ نعرے بھی بلند کرتے ہیں کہ وہ بیمار نہیں ہیں، انہیں ان کے سول حقوق دیئے جائیں اور ان کے رشتہ کے بارے میں جو مذہبی اور سماجی رکاوٹیں ہیں وہ ختم کی جائیں۔

امریکا میں گیز کے حقوق کی مانگ کرنے والوں نے اپنی ایک ریلی میں سب سے آگے ایڈس کے مریضوں کو وہیل کرسی پر بٹھا کر ان کے ہاتھ میں ایسے بینر دیئے جن پر لکھا ہوا تھا کہ:

''ایڈس کے مرض کی تحقیقات اور ایڈس کے مریضوں کے دوا علاج کے لئے اور زیادہ سرکاری فنڈ الاٹ کئے جائیں''۔

امریکا کی سپریم کورٹ نے Anti Sodomy Law پر جو رولنگ دی اُس کے خلاف ہوموسکشولس نے عدالت عالیہ کے سامنے اتنا زبردست احتجاج کیا کہ تاریخ میں پہلی بار عدالت کے دروازے بند کرنا پڑے۔ احتجاج کرنے والے گروپ بنا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے تب تعینات سیکورٹی فورس نے مجبور ہو کر عدالت عالیہ کے صدر دروازے کو بند کر دیا!

۱۹۹۲ء میں امریکی ریاست کولوروڈو نے ریاستی قوانین میں ترمیم کر کے ہوموسکشولس کو سرکاری ملازمتوں، مکانات اور رہائش گاہوں میں رہنے کے حقوق سے محروم کر دیا۔ گیز نے اس ترمیم کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ مئی ۱۹۹۶ء میں امریکی عدالت عالیہ نے اپنے ایک تاریخی فیصلہ میں کولوروڈو کی اس ترمیم کو یہ کہتے ہوئے منسوخ کر دیا کہ:

''ریاست اپنے شہریوں میں اس بنا پر تفریق نہیں کر سکتی کیونکہ ایسا کرنا آئین کے منافی ہوگا۔ آئین کی رو سے شہریوں کو جو سیاسی حقوق حاصل ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسی تفریق کا کوئی جواز نہیں''۔

امریکا کے گیز نے اپنی اس شاندار قانونی فتح پر بے پایاں مسرت کا اظہار کیا۔

کناڈا کی سینٹ نے ایک قانون پاس کر دیا جس کی رُو سے ہوموسکشولس کو

فیڈرل ملازمتوں میں بھرتی کرنے میں کوئی تفریق نہ برتی جائے گی۔

ہم جنس پرستی اور اخلاقی انحطاط

اس دعویٰ کے جواب میں کہ ہم جنس پرستی اخلاقی انحطاط اور تمدنوں کے زوال کا سبب رہی ہے۔ والفنڈن کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

''ہمیں اس نقطۂ نظر کی تائید میں کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اپنے ملک کے لئے قوانین اُن فرسودہ بنیادوں پر بنائیں جو بہت قدیم زمانہ کے قدیم لوگوں کے مفروضوں پر مبنی ہوں جبکہ اُس وقت کے عصری تقاضے بھی دور جدید کے تقاضوں سے بہت ہی مختلف تھے''۔

On the argument that homosexuality was a cause of the demoralisation and decay of civilisations, the report said, "We have found no evidence to support this view, and we can not feel it right to frame the laws which should govern this country in the present age by reference to hypothetical explanations of the history of other peoples in ages distant in time and circumstance different from our own.

(Wolfenden Committtee Report)

حصہ سوئم

باب ہشتم

کنٹرا سپشن

اسقاطِ حمل و ناجائز ولادتیں

انڈسٹریل روولیوشن کے بعد "کنٹراسپٹیو روولیوشن" انسانی تاریخ میں سب سے اہم اور دوررس نتائج کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ ناول نگار ولیر بوتھ لیوس (Vlare Boothe Luce) کا کہنا ہے کہ "کنٹراسپٹیو روولیوشن" آج کے نوجوانوں کو سب سے زیادہ پاش پاش (Shattering) کر دینے والا ثابت ہوا ہے جس نے عورت کی پوری نفسیات (Psyche) کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے اور اُس کے سامنے زبردست چیلنج پیش کر دیا ہے جس سے اُسے معاشرہ میں اپنے صحیح رول کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ آج کی کنواری لڑکی کو جسے شوہر کی تلاش ہو کہیں زیادہ جنسی کشش رکھنے والی (Sexier) ہونے کی ضرورت ہے"۔ دُنیا کے تمام ملکوں میں آلاتِ منع حمل کا استعمال اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے اور اسقاط کو (Abortion) اتنا آسان بنا دیا گیا ہے کہ غیر شادی شدہ نوجوان ان کا بے جھجک استعمال کرنے لگے ہیں اور حکومتوں کی پاپولیشن کنٹرول پالیسیوں نے اس چلن کو اور زیادہ فروغ دے دیا ہے۔ یونیورسٹی شاپس پر تو پہلے ہی یہ آلات فروخت کئے جانے لگے تھے اب تو اٹلی کے ایک ہائی اسکول میں بھی کنڈوم سپلائی کرنے والی مشین نصب کر دی گئی ہے! اسقاطِ حمل پر لگا کلنک آج کے پرمیسیو (Permissive) معاشرہ میں دُھل چکا ہے اور دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے کنٹراسپشن اور اسقاطِ حمل دونوں تدابیر کو پوری طرح فروغ دیا جا رہا

ہے اور نہ چاہے جانے والے حمل (Unwanted Pregnancies) کو گرا دینے کے لئے دُنیا کے بیشتر ملکوں میں قانونی اجازت دی جا چکی ہے جس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکا، برطانیہ، جرمنی اور اسکنڈی نیوی ملکوں میں کمسنی کے حمل (Teenage Pregnancy) نے سنگین صورت اختیار کر لی۔ امریکا میں کمسنی کے حمل کا تناسب ہر ایک ہزار پر 96 ہو گیا اور ناجائز ولادتوں کی ایک باڑھ سی آ گئی۔ واشنگٹن ڈی سی میں پچاس فیصدی سے اوپر ناجائز ولادتیں ہونے لگیں اور کچھ لاطینی امریکا کے ملکوں میں تو ناجائز ولادتوں کی شرح 70 فیصدی تک پہنچ گئی! جو اُن ترقی یافتہ ملکوں کے فلاحی بجٹ پر زبردست بوجھ ثابت ہو رہے ہیں!

حضرت موسیٰ کے دس احکامات خداوندی سے تو آپ واقف ہوں گے، اب خدا کا گیارہواں حکم اس بیسویں صدی میں یہ "نازل" ہوا ہے:

"آپ ہمیشہ کنڈوم استعمال کرتے رہیں"۔

(1) Thou Shalt Always Wear A Condom

مانع حمل تدابیر

اقوام متحدہ کے ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ اب (۱۹۸۰ء) دُنیا کی تقریباً نصف آبادی مانع حمل تدابیر کا استعمال کرتی ہے اور ہر تین میں ایک فرد اسٹرلائزیشن کرا لیتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں تیسری دُنیا کے ملکوں میں صرف دس فیصدی جوڑے ان تدابیر کو اپناتے تھے اب جنوبی مشرقی ایشیا کے 74 فیصدی، لاطینی امریکا کے 54 فیصدی، جنوبی ایشیا کے 33 فیصدی اور افریقہ کے 14 فیصدی جوڑے ان تدبیروں پر عمل کرتے ہیں اور صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں میں 70 فیصدی جوڑے ان تدبیروں پر عمل کر رہے ہیں۔ بعض ملکوں میں اسٹرلائزیشن 40 فیصدی تک پہنچ گیا ہے۔ کنڈوم جاپان میں بہت زیادہ مقبول ہے جہاں 45 فیصدی افراد اس کا استعمال کرتے ہیں اور دوسرے صنعتی ملکوں میں مجموعی طور پر

(۱) برطانیہ کی ہیلتھ کونسل کی طرف سے جو آٹھواں قومی ہفتہ اگست ۱۹۹۵ء میں منایا گیا اس میں بڑی تعداد میں ایسے پوسٹر تقسیم کئے گئے جن میں پوپ کو ایک ہیٹ پہنے دکھایا گیا تھا جس پر مذکورہ بالا حکم لکھا ہوا تھا۔ برطانیہ کے رومن کیتھولکس نے اس پر زبردست احتجاج کیا تب اس کی تقسیم روک دی گئی۔ (ٹائمز آف انڈیا۔ ۱۰ راگست ۱۹۹۵ء)

13 فیصدی اشخاص اسے استعمال کر رہے ہیں۔ چین میں 75 فیصدی اور برطانیہ میں 83 فیصدی لوگ مانع حمل تدابیر کا استعمال کرتے ہیں۔ ورلڈ پاپولیشن رپورٹ ۱۹۹۴ء میں بھی تقریباً یہی اعداد شائع ہوئے اور یہ بتایا گیا کہ جن ملکوں میں آبادی بہت زیادہ ہے جیسے برازیل، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور بنگلادیش وہاں اب یہ شعور بیدار ہوگیا ہے کہ غریبی کو ختم کرنے کے لئے آبادی کے اضافہ کو روکنا ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی اسے ضروری تدبیر مانتے ہوئے اپنایا جارہا ہے۔

دُنیا کی تمام سائنسی لیبوریٹریز میں محفوظ امتناعی تدابیر (Safe Sex Techniques) کی دریافت کرنے کے لئے جو تگ و دو جاری ہے اور جو کثیر مصارف کئے جارہے ہیں وہ صرف آبادی کے اضافہ کو روکنے کے لئے نہیں ہیں کیونکہ بہت سے ایسے ملکوں میں بھی کنٹراسپٹوس کا استعمال کثرت سے کیا جارہا ہے جہاں اضافہ آبادی کی شرح کم ہے اور وہاں پاپولیشن Explosion کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ دراصل یہ ساری کوششیں مذہبی واخلاقی تعلیمات کو پس پشت ڈالتے ہوئے آزادانہ جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ پُرلطف اور بے خوف ماحول میں گزارنے کے لئے کی جارہی ہیں! (۱)

مثال کے طور پر کنڈوم کو ہی لیجئے جس کا استعمال تقریباً چار سو سال سے کیا جارہا ہے۔ پہلے اسے جنسی امراض سے بچنے کے لئے پہن لیا جاتا تھا لیکن ادھر ڈھائی سو سال سے اسے مانع حمل کی ایک تدبیر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا اور حکومتوں کی پاپولیشن کنٹرول پالیسی نے اس کے چلن کو اور زیادہ بڑھاوا دے دیا۔ کنڈومس کا پہلا تحریری تذکرہ ۱۵۶۴ء میں کیا گیا۔ جب اٹلی کے ماہر تشریح جسم انسانی (Anatomist) Fallopio نے دعویٰ کیا کہ باریک Linen Sheath پہننے سے جنسی امراض سے تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ لفظ کنڈوم کے رائج ہونے کے سلسلہ میں متعدد اقوال ہیں، سب سے زیادہ مشہور یہ واقعہ ہے

(۱) پوپ پال ششم نے ۲۵ رجولائی ۱۹۶۸ء کو چرچ کی معروف دستاویز جاری کی تھی جس میں مانع حمل تدابیر کے بارے میں چرچ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے پدرانہ ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دینے کی اپیل کی تھی۔ اس کی بیسویں سالگرہ پر پوپ جان پال دوئم نے دُنیا کے نوجوانوں سے دوبارہ اس سنجیدہ دستاویز کا غائر مطالعہ کرنے اور فکر کی دعوت دی اور اپیل کی نسل انسانی کی بقا اور خاندانی استحکام کی خاطر ایسے اقدامات سے باز آئیں جو انسانیت کی اعلیٰ اخلاق قدروں کے سراسر منافی ہیں۔

کہ انگلستان کے شاہ چارلس دوئم کے انگریز ڈاکٹر Dr. Condom نے انہیں یہ آلہ پہننے کا مشورہ دیا تھا تاکہ وہ اور زیادہ ناجائز اولاد کے باپ نہ بن سکیں۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں چونکہ جانوروں کی مہین جھلّی سے یہ Prophylaxis تیار کئے جاتے تھے، اس لئے بہت مہنگے پڑتے تھے۔ تقریباً سو سال پہلے Vulcanization Process کی دریافت کے بعد بڑے پیمانے پر ربڑ سے یہ کنڈوم تیار کئے جانے لگے۔ بیشتر کنڈوم Latex سے تیار کئے جاتے ہیں اور اب جدید ترین ٹکنالوجی سے یہ اعشاریہ 03 . O تک مہین تیار کئے جانے لگے اور ایڈس جیسے خوفناک مرض کے پھیلنے کے بعد کنڈومس کا استعمال ساری دُنیا کے ملکوں میں اور زیادہ بڑھ گیا اور خاندانی منصوبہ بندی کے لئے اسے ایک کارگر آلہ کے بطور استعمال کیا جانے لگا۔ لندن انٹرنیشنل (جو مشہور و معروف ڈیورکس برانڈ کے آلات مانع حمل کے ہول سیل ڈسٹری بیوٹرس ہیں) برطانیہ کے ۹۰ فیصدی مارکیٹ پر حاوی ہوگیا ہے۔ اور ان کے شیئرز لندن اسٹاک ایکسچینج میں سب سے اونچے ہوگئے۔ ۱۹۸۷ء میں اس کا منافع 33.5 ملین پاؤنڈ تک پہنچ گیا! برطانیہ میں کنڈوم کے اشتہار کوٹی وی پر دکھائے جانے کی ۲۷ سال سے عائد پابندی بھی اگست ۱۹۸۷ء سے ختم کردی گئی اور انڈیپنڈنٹ چینل نے ٹی وی اسکرین پر ڈیورکس کمپنی کے تیار کردہ کنڈوم شیتھس کے اشتہارات دکھانا شروع کردیئے! جرمنی کی ایک کنڈوم بنانے والی فرم نے کھلاڑیوں کی جرسی پر اپنا اشتہار چھاپ دیا۔

امریکا میں چرچ سروس کے اختتام پر ایڈس سے تحفظ کی مہم کے تحت کنڈوم تقسیم کئے گئے، اس وقت کے امریکی صدر ریگن نے اس پر اپنے شاک کا اظہار کیا اور کہا کہ جنس سے متعلق چیزوں کو بچوں کے سامنے اس طرح نہ پیش کرنا چاہئے جیسے کہ ہیم یا سینڈوچ تقسیم کی جارہی ہو۔ پولینڈ کی ایک کمپنی نے سیاحوں کی ضیافت کے لئے میٹ کے ساتھ کنڈوم فری تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ وہ سیاحت کا پورا لطف اُٹھا سکیں! برازیل میں "ایڈس" کے انفکشن میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے، اس کے باوجود جب حال میں وہاں تفریحی جشن (Carnival) منعقد ہوا تو لاکھوں کی تعداد میں کنڈوم مفت تقسیم کئے گئے بلکہ ایک مشین بھی نصب کردی گئی اور حکام صحت کی طرف سے متعدد پوسٹر آویزاں کئے گئے کہ رنگ رلیوں میں مست ہونے سے پہلے ایڈس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر ضرور

اختیار کرلیں۔ اس کارنوال میں لوگ ''بیئر کی دریاؤں'' میں تیرتے ہیں اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے!

اٹلی کے شہر فلورنس کے نزدیک پریٹو کے ایک ہائی اسکول میں پہلی بار ایک کنڈوم سپلائی کرنے والی مشین لائبریری میں نصب کردی گئی۔ ویٹیکن کے ترجمان میں ایک مضمون میں بشپ گیوکیسٹی نے اسے ''شیطانیت کا انتہائی شرمناک قدم بتایا'' اپنے اس مضمون میں انہوں نے چرچ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ: ''چرچ مانع حمل کی ہر تدبیر کو اخلاقی نقطہ نظر سے سخت معیوب سمجھتا ہے اور جو طلباء یا اساتذہ اس کلچر کو اپنانا بھی نہیں چاہتے وہ بھی سیکس ہائی جین کے نام پر اسکول کے حدود میں ایسی مشین کو دیکھ کر اپنے کو سخت کشمکش میں مبتلا پاتے ہیں۔ اسکول کے حدود میں ایسی مشین کو نصب کرا کے اسکول کے حکام نے شرم وحیا، شائستگی اور متانت کی تمام حدوں کو پار کر کے اعلیٰ اخلاق قدروں کا بھرپور مذاق اُڑایا ہے!

آپریشن ریسرچ گروپ کے ایک سروے میں بتایا گیا کہ ہندوستان کے دیہاتی علاقوں میں کنڈوم کے سیل میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ فری تقسیم کے علاوہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۶ء کے درمیان دیہاتی علاقوں میں کنڈوم کی بکری میں 431 فیصدی کا اضافہ ہوا جبکہ شہری علاقوں میں صرف 138 فیصدی کا اضافہ ہوا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں شہروں میں ۹۱ فیصدی کنڈوم فروخت ہوئے تھے اور دیہاتی علاقوں میں صرف ۹ فیصدی، لیکن ۱۹۸۶ء میں نمایاں تبدیلی ہوئی جبکہ دیہاتی علاقوں میں کنڈوم کی بکری میں 431 فیصدی کا اضافہ ہوا جبکہ شہری علاقوں میں صرف 138 فیصدی کا اضافہ تھا۔ ۱۹۸۱ء میں پورے ملک میں ۱۸ کروڑ کنڈوم پیس فروخت ہوئے تھے جبکہ ۱۹۸۶ء میں یہ بکری بڑھ کر ۳۰ کروڑ پیس سے اُوپر ہوگئی۔ ملک کے طول وعرض میں چار لاکھ چھتکر دوکانوں پر اب کنڈوم فروخت کئے جارہے ہیں اور گورنمنٹ کی فری سپلائی اس کے علاوہ۔ سب سے زیادہ اضافہ جنوبی ہند کے دیہاتی علاقوں میں ہوا۔ ملک میں کنڈوم کی پروڈکشن Capacity 1718 ملین پیسس ہے جبکہ اسکی سالانہ مانگ 950 سے 1100 ملین پیسس کے درمیان رہتی ہے۔

Pills

مانع حمل گولیوں کی دریافت تو امریکی سائنس دانوں نے ۱۹۵۰ء کے دہے میں ہی کرلی تھی لیکن اس کی مارکٹنگ ۱۹۶۰ء سے شروع ہوئی اور امریکا کے علاوہ

دوسرے ملکوں میں بھی اِسے رائج کردیا گیا۔ اسے ماڈرن انجن فار سوشل چینج Modern Engine For Social Change کہا گیا اس کے استعمال سے عورتوں کو اپنے کیریر پلان کرنے، اور حمل کے اندیشہ کے بغیر جنسی خط اُٹھانے کا بھی موقعہ مل گیا۔ یہ گولیاں اتنی تیزی سے مقبول ہوئیں کہ پندرہ سال کے عرصہ میں ہی اس کا استعمال کرنے والی عورتوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہوگئی۔ پیکارڈ کا کہنا ہے کہ ''میڈیکل ایجادات کی تاریخ میں کوئی دوسری شے اتنی جلد مقبول نہیں ہوئی جتنی تیزی کے ساتھ پلس (Pills) عورتوں میں مقبول ہوئیں''۔ اور اس کا سیل برابر بڑھتا جارہا ہے اور تیس سال سے کم عمر کی عورتوں میں برتھ کنٹرول کی یہ سب سے مقبول تدبیر ہوگئی ہے۔ اب تو ایک پلاسٹک کی Ring بنائی گئی ہے جو خفیف مقدار میں ہارمونس نکالتی رہتی ہے۔ یہ جسم سے مناسب مقدار میں ہارمونس Vaginal wall سے Absorb کرتی رہتی ہے اور اس طرح ہارمونس کی مقدار کم رہتی ہے۔ یہ پلس کے مقابلہ میں زیادہ مفید پائی گئی ہے اور یورپ کے دس ملکوں میں اسے استعمال کیا جارہا ہے۔

ہالینڈ کی ایک فرم نے ماچس کی تیلی کی مانند ایک کنٹراسپٹو ایجاد کیا ہے جسے عورت بازو کے نیچے کھال کی جھلی میں چند منٹ میں لگا سکتی ہی جس سے چار سال تک وہ استقرار حمل سے بچی رہے گی۔ سویڈن کی ایک کمپنی نے ایسا کپسول ایجاد کیا ہے جسے بغل کے نیچے رکھ لینے سے Ovulation چھ سال تک رُک جاتا ہے۔ اسی طرح Fallopian Tube کو سلی کان سے بند کردینے سے استقرار حمل کو روکنے کی بھی ترکیب دریافت ہو چکی ہے۔ ایک نیسل اسپرے (Nasal Spray) بھی دریافت کیا جاچکا ہے جو براہ راست دماغ کے اُس حصہ کو متاثر کرتا ہے جس سے بیضہ اپنا کام روک دیتا ہے اور پھر کوئی پلس کھانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

برطانیہ کی ٹین ایج لڑکیاں چاکلیٹ کی طرح مانع حمل گولیاں استعمال کررہی ہیں۔ Keele یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے صلاح ومشورہ کو نظر انداز کرتے ہوئی طلباء کی یونین نے یونیورسٹی کیمپس میں آلات مانع حمل کے فروخت کی شاپ کھول دی۔ برطانوی وزارت صحت نے ایک سرکلر کے ذریعہ سے سولہ سال سے کم عمر لڑکیوں کو بھی کنٹراسپٹو کے بارے میں معلومات ومشورہ دینے کی اجازت دے دی۔ والدین نے اس پر احتجاج کیا اور

معاملہ عدالت تک لے جایا گیا۔ عدالت نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ ''گھر پر رشتوں کا لحاظ کرتے ہوئے کھل کر بات چیت نہیں ہو پاتی، اس لئے لڑکی کو نہ چاہے جانے والے حمل سے نجات دلانے اور جنسی امراض سے محفوظ رکھنے کے لئے ڈاکٹروں کو صلاح و مشورہ دینے کی اجازت ہونا چاہئے''۔ برٹش میڈیکل اسوسی ایشن کا کہنا ہے کہ ویسے تو ڈاکٹر خود ہی لڑکی کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایسے معاملہ میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنے والدین سے مشورہ کرلیں لیکن اگر کوئی لڑکی ایسا نہیں کرتی تو ڈاکٹر کو اس امر کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہئے۔

ڈاکٹر ہارولڈ لائف کا کہنا ہے کہ ''میں یہ نہیں تسلیم کرتا کہ کمسن لڑکیوں کو کنٹراسپٹیو تجویز کردینے سے جنسی کارگزاریوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی ایسی لڑکیوں کی اکثریت کنواری نہیں ہوتی اور مانع حمل گولیاں ہوں یا نہ ہو وہ جنسی اختلاط کرتی ہی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر کو اپنی ذاتی قدریں لڑکی پر تھوپنا نہیں چاہئے''۔

ڈاکٹر مائکل سی لاتھم کا کہنا ہے کہ ''عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب رحم میں لگانے والا آلہ (IUCD) ایک معمول بن جائے گا۔ حالانکہ اس سے آزادانہ جنسی اختلاط اور امراض جنسی میں خفیف سا اضافہ ہوسکتا ہے لیکن اس کے فوائد بہ مقابلہ اس کے نقصانات کے کہیں زائد ہوں گے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جوڑوں کے بچہ پیدا کرنے کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوجائے گی۔ بجائے ایسے منفی اقدام کرنے کے جس سے حمل قرار نہ پائے وہ ایسی مثبت کارروائی کریں گے، اس آلہ کو ہٹا کر کہ صرف جب وہ چاہیں گے تب ہی بچے پیدا کرسکیں گے۔''

ایک دوسرے ڈاکٹر نے کہا کہ ''کمسن لڑکی اپنی زندگی کے بڑے ہیجان پرور دور سے گزر رہی ہوتی ہے، ڈاکٹروں کو یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اگر وہ کنٹراسپٹیو نہ تجویز کریں گے تو اس کے دو ہی امکانات ہوں گے۔ مجبوری کی شادی یا اسقاط حمل''!

لیکن ضبط تولید کی اتنی تدبیروں اور ان کے بکثرت استعمال کے باوجود شرح پیدائش میں کمی نہ ہوسکی۔ امریکن میگزین ''ٹائم'' نے لکھا کہ ''منع حمل کی اتنی سہولتوں کے باوجود نوجوانوں میں شرح پیدائش برابر بڑھتی ہی جارہی ہے''!

"The rate of births among the teenagers continues to rise despite the easy availability of contraceptives."

ابارشن

اسقاط حمل اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ تمدن لیکن معاشرہ میں اسے پسندیدگی کی نظر سے کبھی نہیں دیکھا جاتا تھا، اسی لئے انیسویں صدی کے وسط تک بیشتر یوروپی ملکوں نے قانون وضع کرکے اسقاط حمل کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا تھا، اِن قوانین کی پس پشت عورتوں کی صحت کو پہنچنے والا نقصان پیش نظر تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں دُنیا کے بیشتر ملکوں میں اسقاط کی ممانعت کے قوانین نافذ تھے۔ اس کے بعد آزادی کی لہر آئی اور دوسری عالمی جنگ کے شروع ہونے سے کچھ قبل چند ترقی یافتہ ملکوں میں اسقاط کے قوانین میں تبدیلی کرکے اُسے جائز قرار دیا جانے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں جاپان نے بھی ابارشن کو جائز قرار دے دیا۔ ۱۹۸۶ء تک شمالی امریکا اور بیشتر یوروپی ملکوں میں عورتوں کی صحت کی بنا پر ابارشن (Induced Abortion) کی قانونی اجازت دے دی گئی (سوائے بلجیم، آئرلینڈ اور مالٹا اور پولینڈ کے)(۱) بدلے ہوئے قوانین کے بہ موجب Gestation کے تین ماہ کے اندر کے حمل عورتیں اپنی مرضی سے گروا سکتی تھیں۔ ایک نیوز ایجنسی کی تفصیلی رپورٹ پانیر (۲) میں شائع ہوئی جس میں بتایا گیا کہ ''آج (۱۹۸۷ء) دُنیا کی 76 فیصدی آبادی ایسے ملکوں میں رہتی ہے جہاں اسقاط حمل کو قانونی جواز حاصل ہے، اس میں بھی 39 فیصدی ایسے ملکوں میں رہتے ہیں جہاں چاہنے پر اسقاط کرایا جاسکتا ہے۔ ساری دُنیا میں 33 ملین حمل ہر سال اسقاط کرادیئے جاتے ہیں جن میں سب سے زیادہ رُوس (۱۴ ملین) اور چین (۱۱ ملین) میں ہوتے ہیں۔ اگر غیر قانونی طور پر گرائے جانے والے حمل بھی شامل کردیئے جائیں تو دُنیا میں ابارشن کی کل میزان 60 ملین تک پہنچ جائے گی۔ گویا ہر سو حمل پر 32 ضائع کردیئے جاتے ہیں! دُنیا کے مختلف ملکوں میں ہر ایک ہزار حمل پر ضائع کردیئے جانے والے حمل

---

(۱) بلجیم میں ۱۸۶۷ء کے قانون کی رُو سے اسقاط اب بھی ایک مجرمانہ فعل ہے، بتایا گیا کہ ۱۹۸۶ء میں وہاں تقریباً ۱۷ ہزار عورتوں نے ابارشن کرایا جن میں نصف نے نیدرلینڈ جاکر اور باقی نے بلجیم میں ہی کرایا۔ ماہرین قانون اور حقوق انسانی کی تنظیمیں اسقاط سے پابندی ہٹائے جانے کی مانگ کررہی ہیں۔ پولینڈ کی عدالت نے ایک فیصلہ میں کہا کہ مالی منفعت یا ذاتی مفاد کے لئے اسقاط کرانا آئین کی خلاف ورزی ہے، چونکہ استقرار حمل کے بعد ہی جنین میں جان پڑ جاتی ہے اس لئے اس کا تحفظ ضروری ہے۔ کیتھولک چرچ اب تک اپنی مخالفت پر قائم ہے۔

(۲) پانیر ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء

چین میں 62، کیوبا میں 59، سنگاپور میں 28 اور ہندوستان میں 20 سے 40 کے درمیان ہوتے ہیں۔ بنگلادیش میں ہر سال ۷ لاکھ ۸۰ ہزار غیر قانونی اور ۶۹ ہزار قانونی طور پر حمل گرادیئے جاتے ہیں اور وہاں ہر سال ۸۰۰، ۷ عورتوں کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں امریکی کمسن لڑکیوں میں اسقاط حمل کی شرح سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے جو بیشتر یوروپی ملکوں سے ڈگنی ہے!

جنسی آزادی اور ابارشن

دُنیا کے ملکوں میں جتنی تیزی سے جنسی آزادی (Permissiveness) بڑھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ ابارشن کے واقعات بڑھنے لگے۔ آج مغربی ملکوں میں ہر تین عورتوں میں ایک پُروابارشن ہے، صرف دو زندگی کو مقدس سمجھتے ہوئے اس کی حفاظت کرنے کی موافقت میں ہوتی ہیں بلکہ اٹلی اور سوئزرلینڈ میں کرائے گئے ریفرینڈم میں تو بالترتیب 68 اور 69 فیصدی لوگوں نے ابارشن کی موافقت میں اپنی رائے دی۔ اٹلی میں ہی ویٹکن واقع ہے جو ساری دُنیا کے رومن کیتھولکس کا مرکزی مقام ہے جہاں سے پوپ کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ حال میں پوپ جان پال دوئم نے Gospel Of Life نامی دستاویز جاری کی جس میں انہوں نے اسقاط اور Euthanasia (۱) کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ساری دُنیا کے بشپ سے سنجیدگی کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ دونوں افعال خدا کے بنائے ہوئے اس نظام کے سراسر منافی ہیں جو اس نے دُنیا میں انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے رائج کر رکھا ہے۔ یہ اعلیٰ رُوحانی قدروں کے بھی خلاف ہیں اور اُن تمام بلند مقاصد حیات کی نفی کرتے ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے انسان کو اس دُنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔ انہوں نے دُنیا میں بڑھتے ہوئے اس کلچر آف ڈیتھ Culture Of Death پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ موصوف نے قاہرہ میں ہونے والی پاپولیشن فنڈ کی کانفرنس (ستمبر ۱۹۹۴ء) کی بھی مخالفت کی جس میں Promoting Abortion On Demand کی پُرزور حمایت کی گئی تھی، انہوں

(۱) جس میں کہنہ امراض میں عرصہ سے مبتلا ہونے والے مریضوں کو زہریلی دوا یا انجکشن دے کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس طرح مریض کی حالت پر رحم کرتے ہوئے اسے ہمیشہ کے لئے سخت درد و کرب و اذیت سے نجات دلادی جاتی ہے۔

نے کہا کہ ایسے قوانین وضع کرنے کی ضرورت ہے جو "زندگی کے حق" (Right To Life) کو معاشرہ میں مستحکم بنا سکیں۔

برطانیہ میں ملکہ معظمہ کو آج بھی "Defender Of Christianity" کہا جاتا ہے لیکن جب وہاں ملک کے سو سال سے زیادہ قدیم قانون میں ترمیم کر کے ابارشن کو جائز کئے جانے کا مسودہ پارلیمنٹ کے زیر غور آیا تو گرما گرم بحث اور رائل کالج آف آبسٹریشن اینڈ گائناکولوجسٹ (۱) کے احتجاج کے باوجود اسے پاس کرتے ہوئے ایکٹ Medical Termination Of Pregnancy Act-1967 بنادیا گیا!

اس ایکٹ کی رُو سے نہ صرف ماں کی خراب صحت، ریپ یا Incest یا جنین میں بچہ کی بدہیتی (Deformity) کی صورت میں ابارشن کرایا جاسکتا ہے بلکہ خاندانی منصوبہ بندی اور فیملی کی خوشحالی کے پیش نظر بھی حمل کو ساقط کرایا جاسکتا ہے! خاندانی منصوبہ بندی کے ماہرین نے کہا کہ جو ملک بھی اپنی آبادی کو کم کرنا چاہتا ہے اسکے لئے ابارشن ناگزیر ہے۔

برطانیہ کے اس ایکٹ میں ۲۸ ہفتہ تک کے حمل کو گروادینے کی قانونی اجازت دے دی گئی تھی لیکن عام طور پر اس میعاد کو زیادہ مانا جارہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۸۸ء میں اس میعاد کو گھٹا کر ۱۸ ہفتہ کر دینے کی ترمیم پیش کی گئی جسے کئی ممبران پارلیمنٹ کا تعاون حاصل تھا۔ بحث کے دوران بتایا گیا کہ برطانیہ میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۸ء کے درمیان قانونی طور پر 30 لاکھ ابارشن کرائے گئے جن میں ایک لاکھ 72 ہزار ۱۹۸۶ء میں کرائے گئے جس میں ۸ ہزار حمل ۱۸ ہفتہ کے تھے۔

ٹین ایج پریگننسی کی شرح اب بھی تشویشناک

الان گوٹمچر انسٹی ٹیوٹ (واشنگٹن) (Alan Guttamcher Institute) کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس وقت (۱۹۹۷ء) دُنیا میں دس سے انیس سال کی عمر کے ۱۱۰ کروڑ (101 Billion) نوجوان ہیں جو کہ اب تک کی تاریخ میں سب سے زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہے۔ ان میں 90 کروڑ (900 Million) ترقی پذیر ملکوں میں رہتے ہیں۔

(۱) رائل کالج کے ڈاکٹروں نے کہا کہ اتنے اہم معاملہ پر اُن سے کوئی صلاح و مشورہ نہیں کیا گیا۔

ڈنیا میں ہونے والی ہر دس پیدائشوں میں ایک اس عمر کے نوجوانوں میں ہوتی ہے جن میں زیادہ تر نہ چاہے جانے والے حمل ہوتے ہیں۔ حالانکہ بیس سال قبل کے مقابلہ میں کمسنی کے استقرارِ حمل کے واقعات میں کمی ہوئی ہے لیکن پھر بھی یہ اعداد کافی تشویشناک ہیں! عورتوں میں تعلیم کے بڑھتے ہوئے مواقع کی وجہ سے شادی اور بچہ پیدا کرنے میں تاخیر کرنا پڑتی ہے اس لئے کمسنی کے حمل میں بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ سب سہارا افریقہ کے ملکوں میں کمسنی میں ولادت کی شرح اب بھی بہت زیادہ ہے اور لاطینی امریکا کے بیشتر ملکوں میں کمسن لڑکیوں کی ایک تہائی تعداد ''ماں'' بن جاتی ہے۔ مراقش میں اب صرف ۱۹ فیصدی لڑکیاں کمسنی میں ماں بن جاتی ہیں جبکہ پچھلی نسل میں یہ تعداد ۳۹ فیصدی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے بیشتر حمل بغیر چاہے اور بنا کسی منصوبے کے ہوتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی پاپولیشن فنڈ رپورٹ (۱۹۹۷ء) میں بتایا گیا کہ ڈنیا میں کم سے کم 43 فیصدی حمل نہ چاہے جانے والے ہوتے ہیں، لہٰذا عورتوں کو ان کی صحت کے تحفظ کی خاطر تعلیم دینا نہایت ضروری ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ ڈنیا میں ہر سال ساڑھے سترہ کروڑ (175 Million) حمل ٹھہرتے ہیں جن میں ساڑھے سات کروڑ (75 Million) نہ چاہے جانے والے ہوتے ہیں۔ اس میں سے ساڑھے چار کروڑ (45 Million) اسقاط کرادیئے جاتے ہیں جس میں دو کروڑ (20 Million) غیر محفوظ اسقاط ہوتے ہیں جس کے سبب سے ہر سال 70 ہزار عورتیں موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں اور بڑی تعداد میں عورتیں انفکشن اور دوسری پیچیدگیوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں پانچ لاکھ پچاسی ہزار عورتیں ہر سال حمل سے متعلق پیچیدگیوں وامراض سے فوت ہو جاتی ہیں اگر صحت کے تحفظ سے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں تو بڑی حد تک اِن اموات کو کم کیا جاسکتا ہے۔

بیجنگ میں اقوامِ متحدہ کی کانفرنس برائے خواتین (ستمبر ۹۵ء) میں بتایا گیا کہ اباراشن اس وقت ڈنیا کے 170 ملکوں میں قانوناً جائز ہے، حالانکہ بہت محدود حالات میں اور $\frac{1}{5}$ عورتیں ایسے ملکوں میں رہتی ہیں جہاں اباراشن کی اجازت اُسی صورت میں ہے جب ان کی جان کو خطرہ ہو۔ ڈنیا میں Botched Abortion سے ہر سال ڈھائی لاکھ عورتیں فوت ہو جاتی ہیں اور Foetus Screeing Test کے بعد لاکھوں عورتوں کے

حمل گروا دیئے جاتے ہیں۔ اب تو اسقاطِ حمل کو اتنا آسان بنا دیا گیا ہے کہ صرف گولیوں سے حمل کو بہ آسانی گرایا جاسکتا ہے۔ Ru 486 نام کی گولی آٹھ ہفتہ کے حمل کو آسانی سے گرادیتی ہے۔ رسل لیبوریٹری کے مینجنگ ڈائریکٹر نے بتایا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مریض آؤٹ پیشنٹ کی طرح سمجھا جاتا ہے اور اُسے اس نفسیاتی Trauma سے نہیں گذرنا پڑتا ہے اور نہ آپریشن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب زیادہ تر باریک اور Sophisticated الٹراساؤنڈ سے استقرارِ حمل کا فوراً پتہ لگ جاتا ہے۔

اباراشن کی سب سے بڑھی ہوئی شرح امریکا میں

اقوامِ متحدہ کی پاپولیشن ڈویژن کی رپورٹ (۱۹۸۸ء) میں بتایا گیا کہ امریکا میں اسقاطِ حمل کی شرح ڈنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہے اور یہ اسی طرح برقرار ہے جبکہ دوسرے ملکوں میں یہ شرح کم بھی ہوئی ہی۔ یہاں کی کمسن لڑکیاں جن کی عمر ۱۵ سے ۱۹ سال کے درمیان ہوتی ہے 9.8 فیصدی ہر سال حاملہ ہو جاتی ہیں دوسرا نمبر ہنگری کا ہے جہاں 8.5 فیصدی لڑکیاں حاملہ ہو جاتی ہیں۔ جاپان میں یہ شرح صرف ایک فیصدی ہے (۱)۔ ڈاکٹر مارک شواٹز Mark Schwatz (۲) نے بتایا کہ امریکا میں بیس سال سے کم عمر کی 40 فیصدی غیر شادی شدہ لڑکیاں ہر سال حاملہ ہو جاتی ہیں اور دس لاکھ ٹین ایج پرگننسی ہر سال ہوتی ہیں۔ یہ سب اس کے باوجود کہ پہلے کے مقابلہ میں اب جنسی تعلیم اور جنسی معلومات کہیں زیادہ مہیا ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ پورنوگرافی اور Deepthroat جیسی فلموں نے نوجوانوں کو حد سے زیادہ اُکسا دیا ہے اور اِس Over Stimulation نے یہ صورتِ حال پیدا کردی ہے۔

امریکا کی سپریم کورٹ نے ۱۹۷۳ء میں یہ تاریخی فیصلہ دیا تھا کہ اسٹیٹ کو عورتوں کے اسقاط کے حق میں کوئی مداخلت نہ کرنا چاہئے۔ عورتوں کو اسقاط کا پورا حق حاصل ہے جبکہ جنین Viable نہ ہو یعنی استقرارِ حمل کے پہلے دو سیمسٹر تک۔ اس فیصلہ کے بعد ملک میں اباراشن اور تیزی سے کرایا جانے لگا جس سے اخلاق اور صحت عامہ پر پڑنے والے مضر اثرات نے حکام اور ذمہ داروں کو سخت تشویش میں مبتلا کردیا۔ اعداد میں بتایا گیا

(۱) ٹائمز آف انڈیا ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۸ء

(۲) Director Clinics For Marital Sexual Therapy-U.S

کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۳ء کے درمیان پندرہ لاکھ 75 ہزار اسقاط کرائے گئے تھے جبکہ اس فیصلہ کے بعد صرف 75-1974 کے ایک سال میں تقریباً اتنے ہی ابارشن کرائے گئے! ماہرین سماجیات نیز صحت عامہ کے ڈاکٹروں نے اتنے بڑے پیمانے پر اسقاط حمل پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ معاشرہ پر اس کے بڑے پیچیدہ اور دوررَس Deleterious Consequences نتائج ہوسکتے ہیں!

وی. کے. سُبرامنین لکھتے ہیں (۱) کہ حال ہی میں امریکا کے ایک ٹیلیویژن نیوز کاسٹ میں بتایا گیا کہ وہاں ہر روز چھ ہزار لڑکیاں شادی کے باہر جنسی اختلاط سے (Unmarried Sexual Liasion) اپنی دوشیزگی (Virginity) کھودیتی ہیں اتنے زیادہ بڑھتے ہوئے پرمیسو (Permissive) ماحول میں ابارشن کے مسئلہ نے بڑی نازک صورت اختیار کرلی ہے اور یہ انتہائی متنازع (Explosive) مسئلہ بن گیا ہے جس پر زوردار بحث چھڑگئی ہے اور دونوں فریقین پروا اور اینٹی ابارشنٹ نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اور وہاں کی عدالت کے اُس فیصلہ کے بعد زبردست واویلا (Furore) مچ گیا جس میں عدالت نے جنین (Unborn Foetus) کو الگ انسانی زندگی تسلیم نہیں کیا تھا (۲)۔ امریکا میں کرائے جانے والے اسقاط کا ایک تجزیہ کرتے ہوئے ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ ابارشن کرانے والیوں میں 75 فیصدی غیر شادی شدہ خواتین ہوتی ہیں۔ 67 فیصدی سفید فام اور 32 فیصدی ٹین ایجر ہوتی ہیں اور 33 فیصدی ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی عمر 20 سے 24 سال کے درمیان ہوتی ہے۔ 48 فیصدی عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے کوئی بچے پہلے نہیں ہوتے (۳)۔ امریکا میں اب اسقاط کو اتنا آسان بنادیا گیا ہے کہ استقرارِ حمل کے چند دنوں کے اندر ہی نئی ٹیکنک سے (جسے ہاؤسٹن کے Planned Parenthood کے میڈیکل ڈائریکٹر جیری ایڈورڈس نے ایجاد کی) اُسے Abort کردیا جاتا ہے وہاں تیس Planned Parenthood Affiliates ایسی سروسز مہیا کررہے ہیں۔ اس نئی ٹیکنک سے Gestational Sac کا پتہ ابتدائی دنوں میں ہی چل جاتا ہے۔

(۱) پانیر 18-10-86

(۲) ایک حاملہ عورت حادثہ کا شکار ہوگئی جس میں اُس کا حمل کا بچہ بھی ضائع ہوگیا لیکن عدالت نے جنین کو علحدہ زندگی نہ مانتے ہوئے اُس شخص کو Homicidal Charges سے بری کردیا۔

(۳) ریڈینس ویکلی دہلی : 18-6-1978

ابارشن کے مسئلہ نے امریکا میں انتہائی نازک صورت حال اختیار کرلی ہے وہاں اینٹی ابارشنٹ اور پروابارشنٹ کے دو گروہ پیدا ہوگئے ہیں جو برابر آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ اینٹی ابارشنٹ میں کیتھولک چرچ، اسلامک فنڈامنلسٹ اور Conservative Evengalical عیسائی ہیں اور پروابارشنٹ میں حقوق نسواں کی علمبردار تنظیمیں اور اسقاط کا حق مانگنے والے حضرات شامل ہیں۔ یہ اپنے کو Pro-Life اور Pro-Choice بھی کہتے ہیں۔ پرولائف والوں کا کہنا ہے کہ اسقاط قتل ہے۔ جس میں ایک معصوم جان کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کردیا جاتا ہے اور پروچوائس والوں کا کہنا ہے کہ عورت کو اپنے جسم پر پورا اختیار حاصل ہے اور یہ اس کی چوائس ہونا چاہئے کہ حمل کو برقرار رکھے یا اُسے گروادے۔ وہ بچہ پیدا کرے یا نہ کرے یہ اسکی مرضی پر منحصر ہونا چاہئے۔ وہاں اینٹی ابارشنٹ میں ایک ایسا دہشت زدہ گروہ بھی پیدا ہوگیا ہے جس کا نام White Rose ہے یہ اُن ڈاکٹروں کو جان سے مارڈالنے کے حق میں ہے جو اسقاط کراتے ہیں (حالانکہ Moderates نے اس کی مخالفت کی) وہاں ایسی تنظیمیں بھی ہیں جو ایسے ڈاکٹروں کو پریشان کرتی رہتی ہیں جو ابارشن کراتے ہیں۔ حال میں ڈالاس کی ایک ایسی خاتون ڈاکٹر کو پریشان کیا گیا جو اس معاملہ کو عدالت میں لے گئی اور اپنے کام میں مداخلت نیز جذباتی صدمہ پہنچانے کے لئے ہرجانے کا مطالبہ کیا۔ عدالت نے 8.6 ملین ڈالر ہرجانہ اِن تنظیموں سے دلوایا۔ گذشتہ تین سال میں دو ڈاکٹروں اور تین ورکرس کا قتل کیا جاچکا ہے جو اسقاط کے آپریشن کرتے تھے۔

لیکن اس ساری بحث ومباحثہ میں جو بنیادی اخلاقی سوال ہے اسے دونوں فریقین نظر انداز کررہے ہیں۔ جنسی انارکی (Sexual Indiscipline) کا جو طوفان معاشرہ میں سر سے اونچا ہوچکا ہے اُسے روکنے میں یہ دونوں فریق اپنے کو بےبس ولاچار پارہے ہیں۔ چرچ اور دوسری مذہبی تنظیمیں معاشرہ میں پھیلی ہوئی جنسی بے راہ روی (Promiscuity) اور رشتۂ ازدواج کے باہر جنسی اختلاط Pre & Extra Marital Sex کے خلاف اتنی جدوجہد نہیں کررہی ہیں جتنی کہ کی جانا چاہئے۔ کیونکہ دراصل یہی آزادانہ جنسی روش (Permissiveness) اور لائف اسٹائل ہی تو ٹین ایج پرگننسی کا باعث ہوتا ہے جسے Abort کرانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر چرچ نے اس بنیادی

اخلاقی مسئلہ پر سمجھوتہ نہ کرلیا ہوتا تو بحث کا موضوع صرف یہ ہوتا کہ کیا شادی شدہ عورت کو اپنے حمل کو ساقط کرانے کا حق حاصل ہے؟ جب تک زندگی میں پاکیزگی کا تصور اور شادی کے تقدس کو قائم نہیں کیا جاتا اور یہ تسلیم نہیں کیا جاتا کہ نکاح ہی فیملی لائف کا بنیادی ستون ہے اُس وقت تک اس مسئلہ کا کوئی حقیقی حل نکلنے کی اُمید نظر نہیں آتی۔

حال میں امریکی صدر بل کلنٹن نے امریکا میں کمسنی کے بڑھتے ہوئے واقعات کو کم کرنے کا ایک زبردست منصوبہ بنایا اور ہنری فاسٹر کو سرجن جنرل بنایا گیا کہ وہ اس تحریک کی قیادت کریں اور حکومت کو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مناسب تجاویز پیش کریں۔ صدر کلنٹن نے کہا کہ ''امریکا میں یہ بچیوں کے بچے پیدا ہونے کی جو وبا Epidemic Of Children Having Children پھیل رہی ہے یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہونے کے علاوہ اخلاقی مسئلہ بھی ہے اور اسے حل کرنے کے لئے اونچی ترجیح (High Priority) دی جانا چاہئے۔ کمسنی کے یہ حمل ملک کے فلاحی بجٹ پر زبردست بوجھ ثابت ہورہے ہیں اور اس کے علاوہ یہ بچوں کے استحصال اور جرائم کا بھی باعث ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ کمسنی کے حمل کے نتیجہ میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ آگے چل کر خود کمسنی کے حمل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور اس طرح یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ صدر موصوف نے بتایا کہ امریکا میں اس وقت ایک ملین (دس لاکھ) کمسن بچیاں ہر سال حاملہ ہوجاتی ہیں اور یہ شرح برطانیہ سے دُگنی اور فرانس واٹلی سے چھ گنا زیادہ ہے! (۱)

فی الحال امریکا نے اگلے دس سالوں میں کمسنی کے حمل میں ایک تہائی تخفیف کرنے کا منصوبہ بنایا ہے کیونکہ اتنی تخفیف سے بھی ملک کی اقتصادی اور معاشرتی حالات میں کافی سدھار ہوسکے گا۔

برطانوی لڑکیاں اور 'لنچ ٹائم' ابارشن

برطانیہ میں ڈاکٹروں نے اسکول جانے والی لڑکیوں کے اسقاط انکے والدین کے علم میں لائے بغیر کرنا شروع کردیے جس پر وہاں ماؤں نے زبردست احتجاج کیا اور برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے یہ کہا کہ وہ اس معاملہ میں Big

(۱) ٹائمز آف انڈیا۔ ۳۱ رجنوری ۱۹۹۶ء

Brother Attitude اپنا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ان کی بیٹیاں لنچ ٹائم میں اسکول سے جاکر ابارشن کرالیں گی اور ان کے والدین کو پتہ تک نہیں چل پائے گا۔ اس سے انکی صحت بھی خراب ہوگی کیونکہ والدین کی اجازت کے بغیر آپ انہیں اسپتال میں رکھ بھی نہیں سکتے۔ رومن کیتھولک بشپ نے معصوم بچوں کے زندہ رہنے کے حق کو منوانے کے لئے اسقاط کے خلاف ملک گیر پیمانہ پر مہم چلانے کی دعوت دی اور کہا کہ ''نوزائدہ معصوم بچے کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کرنا تمدن کا بنیادی اصول ہے''۔

برطانیہ میں اسّی لاکھ سے زائد غیر شادی شدہ عورتیں ہیں یا تو ان کی شادی نہیں ہوئی یا انہیں طلاق مل چکی ہے۔ برطانیہ کی ۹۰ فیصدی عورتیں اپنے شوہروں کو بدلتی رہتی ہیں اور ملک میں ہر سال ایک لاکھ بیس ہزار اسقاط حمل کرائے جاتے ہیں اور اسکے علاوہ دوسری تدابیر برتھ کنٹرول کی بھی کثرت سے اپنائی جاتی ہیں۔ (ریڈینس ۲۵ رفروری ۱۹۸۴ء)

دوسرے یوروپی ملکوں میں

سویڈن کے موجودہ قوانین کی رُو سے ۱۸ ہفتہ تک کے حمل اگر عورت چاہے تو اپنی مرضی سے ساقط کراسکتی ہے۔ حال میں حکومت کے اس اظہار خیال سے کہ ملک میں بہت زیادہ اسقاط کرائے جارہے ہیں۔ فریڈم آف چوائس والوں کی طرف سے واویلا برپا ہوگیا۔ ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ وہاں ہونے والی ہر ایک شادی پر دو طلاقیں ہوتی ہیں پائیدار شادی ایک معجزہ ہے۔ شادی کے وقت ۳۳ فیصدی دُلہنیں حاملہ ہوتی ہیں۔

مغربی جرمنی میں موجودہ قانون کے تحت جنین کو تب ہی ضائع کیا جاسکتا ہے جب ماں کی جان کو خطرہ لاحق ہو۔ بیشتر افراد مختلف وجوہ سے ان قوانین کو غیر حقیقی بتاتے ہیں کیونکہ دراصل ملک میں ہر سال دس لاکھ سے زائد حمل ساقط کرائے جاتے ہیں۔

فرانس نیشنل ڈیموگرافک انسٹی ٹیوٹ کے ریکارڈ کے مطابق ۱۹۸۳ء میں وہاں ایک لاکھ 83 ہزار حمل ساقط کرائے گئے یعنی ہر سو زندہ پیدائشوں پر 24! یہ ۱۹۷۶ء سے 35 فیصدی کا اضافہ تھا۔

اٹلی کے قانون میں اسقاط کرانے والی عورت کو دو سے پانچ سال تک کی سزا دی جاسکتی ہے۔ آزادیٔ نسواں کی حامی تنظیم اسے عدالت میں چیلنج کرنے جارہی ہے، اس

نے ایک لمبی فہرست معزز اشخاص اور فلمی اداکاروں کی شائع کی جنہوں نے اسقاط کرانا تسلیم کیا ہے۔

پرتگال: ایک کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں جہاں 98 فیصدی رومن کیتھولک آباد ہیں حال میں اسقاط کی اجازت صرف اُس صورت میں دی گئی جب حمل ریپ سے ٹھہرا ہو یا بچہ بدہیت ہو گیا ہو یا ماں کی جان ہلاکت میں ہو۔

جنوبی کوریا: کی حکومت کے پاس اسقاط کے اعداد نہیں ہیں لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک میں ہر سال جو دس لاکھ اسقاط کرائے جاتے ہیں اُنمیں تقریباً نصف غیر شادی شدہ لڑکیوں کے ہوتے ہیں جو ٹین ایج کی ہوتی ہیں۔

اسپین میں ۱۹۸۶ء تک اسقاط کے قوانین بہت سخت تھے، ایسے جانچ (Evaluation) کمیشن تھے جو ایک کیس کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اسقاط کی اجازت دیتے تھے، اس کے بعد وہاں زبردست احتجاج ہوئے کہ ان قوانین میں ڈھیل دی جائے اس وقت تقریباً پچاس ہزار اشخاص کو اس کام کے لئے دوسرے ملکوں کو جانا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس وقت ملک کے ایک لاکھ سے زائد اسقاط میں مشکل سے ایک ہزار کو قانونی اجازت مل پاتی ہے۔ قوانین میں جو نئی ترمیم منظور کی گئی اُس کی رُو سے دو ہفتہ کے حمل معمولی کلنکس میں گروائے جا سکتے ہیں اور اس سے زیادہ مدت کے حمل زیادہ لمبی سہولتوں سے آراستہ کلنکس میں ہی گروائے جا سکیں گے۔

مشرقی یورپ: سب ہی مشرقی یورپ کے ملکوں میں اسقاط تشویشناک حد تک بڑھ گئے ہیں۔ یوگوسلاویہ میں مکانوں کی قلت اور روزگار کے محدود مواقع نے اسے اور زیادہ بڑھاوا دیا ہے۔ ہنگری میں 60 فیصدی، بلغاریہ میں 44 فیصدی، زیکوسلواکیا میں 36 فیصدی اور پولینڈ میں 23 فیصدی حمل ساقط کرا دیئے جاتے ہیں۔ پولینڈ میں چرچ اتنے زیادہ اسقاط کی مخالفت کرتا ہے اور خاندان کے رواجی تصور کو برقرار رکھنے کی وکالت کرتا ہے۔

رُوس: ریوٹر نے ''ماسکو نیوز'' کے حوالہ سے بتایا کہ رُوس میں نوے فیصدی پہلے حمل ضائع کر دیئے جاتے ہیں اور ہر سال سیکڑوں عورتیں اس کے سبب موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار میں بتایا گیا کہ ملک میں ہر سال اسّی لاکھ سے زیادہ

ابارشن کرا دئے جاتے ہیں جو شاید دُنیا میں سب سے زیادہ ہے! (۱) وہاں Back Street Abortion کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے 28 ہفتہ تک کے حمل کو گروائے جانے کی اجازت قانونی طور پر دے دی گئی ہے (۲)۔ یہ اجازت اس شرط پر دی گئی اگر عورت نے پہلے معذور بچے کو جنم دیا ہو یا اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو یا عورت جسمانی طور پر بالغ نہ ہوئی ہو یا اس کا خاندان بڑا ہو۔ ویسے بھی رُوس میں اقتصادی پریشانیوں کے باعث لوگ اپنے خاندان کو چھوٹا ہی بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرتی بحران اور فرسودہ صحت کا نظام لوگوں کو اس پر مجبور کر رہا ہے۔ روس میں ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۳ء کے درمیان شرح پیدائش گھٹ کر آدھی رہ گئی اور ۱۹۹۳ء میں تو پیدائشوں کے مقابلہ میں اموات زیادہ ہوئیں اور اسی سال کم از کم ایک لاکھ ۷۰ ہزار عورتیں اسقاط یا اسقاط آپریشن سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے سبب فوت ہو گئیں۔ اس سال ملک میں ستر لاکھ سے زیادہ ابارشن کرائے گئے۔ ملک میں صرف پندرہ لاکھ بچے پیدا ہوئے (۳)۔

چین: چین کے بڑے شہروں میں رہنے والے نوجوانوں میں مغربی طرز زندگی سرایت کرتا جا رہا ہے اور لاکھوں چینی نوجوان بغیر رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے میاں بیوی کی حیثیت سے غیر قانونی طور پر رہ رہے ہیں حالانکہ ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کے تحت آلات مانع حمل بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں اور انکا بہ کثرت استعمال بھی کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی چین میں 80 فیصدی اسقاط حمل غیر شادی شدہ لڑکیاں کرواتی ہی۔ حالانکہ امراض جنسی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے لیکن ایڈس کے کیس کم ہیں۔ ایک چینی دانشور نے کہا کہ ملک میں اخلاقی خلاء (Moral Vacuum) نے یہ صورت پیدا کر دی ہے

جاپان: جاپان نے خاندانی منصوبہ کے تحت ابارشن کو خوب بڑھاوا دیا لیکن اب عورتوں کی صحت پر نقصان دہ اثرات کو دیکھ کر وہ اپنے خیالات اور سوچ میں تبدیلی پیدا کر رہا ہے۔ ملک میں ہر سال دس لاکھ سے زیادہ اسقاط کرائے جاتے ہیں لیکن نوے

---

(۱) ٹائمز آف انڈیا ۲۱ رجنوری ۱۹۸۹ء
(۲) ٹائمز آف انڈیا ۱۶ رفروری ۱۹۸۸ء
(۳) ٹائمز آف انڈیا ۵ رمئی ۱۹۹۴ء

فیصدی عورتیں اب اسے ناپسند کرتی ہیں اور 60 فیصدی کا یہ ماننا ہے کہ نہ اقتصادی مشکلات اور نہ ہی ذاتی پسند سے ابارشن کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔

ہانگ کانگ نے حال ہی میں اپنے ملک کے قوانین کو اور لبرل بنا دیا، اب وہاں 16 سال سے کم عمر کی لڑکیاں بھی اپنی مرضی سے اسقاط کرا سکتی ہیں۔ ریپ اور Incest کا شکار ہونے والی لڑکیوں نے اگر معاملہ پولیس میں درج کرا دیا ہو تو انہیں بھی ابارشن کرانے کی اجازت مل جاتی ہے، ویسے قانون میں 24 ہفتہ سے زائد مدت کے حمل گروانے کی ممانعت اب بھی موجود ہے حالانکہ اس کی خلاف ورزی خوب ہوتی رہتی ہے۔

کناڈا کی سپریم کورٹ نے ۱۹۸۹ء میں اس قانون کو مسترد کر دیا جس کی رو سے صرف اسپتالوں میں سرکاری کمیٹی کی اجازت کے بعد اسقاط کرائے جا سکتے تھے۔ اس فیصلہ کے بعد ملک میں متعدد کلنکس کھل گئے جہاں آزادی سے ابارشن کئے جانے لگے۔ ۱۹۹۳ء میں ایک لاکھ سے زیادہ اسقاط کرائے گئے جس میں بیس ہزار کمسن لڑکیاں تھیں۔ اسی سال جن عورتوں نے سرکاری اسپتالوں میں اسقاط کرائے اُن میں 63.7 فیصدی بن بیاہی لڑکیاں تھیں اور ایک چوتھائی عورتیں ایسی تھیں جنہوں نے اس سے قبل بھی ایک یا دو اسقاط کرائے تھے۔ (اس فیصلہ سے قبل ۱۹۸۸ء میں 72,693 اسقاط ہوئے تھے) (۱)

لاطینی امریکا کے تمام ملکوں۔ لیما سے لے کر بولویا تک۔ میں عورتیں ایک نوکیلا دھاردار اوزار جسے La Soda کہا جاتا ہے سے اپنے حمل خود ہی گرا دیتی ہیں، چونکہ یہ اوزار صاف نہیں ہوتا اس لئے انفکشن اور زہرباد پھیلنے سے بڑی تعداد میں عورتیں موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ میکسیکو میں چھ سات لاکھ حمل ہر سال گروائے جاتے ہیں۔

افریقی ممالک: براعظم افریقہ میں واقع کینیا (Kenya) وہ ملک ہے جہاں اس وقت آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہاں ٹین ایج پرگننسی کے بڑھتے ہوئے واقعات سے نپٹنا دشوار ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۹ء کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ وہاں ایک لاکھ بیس ہزار لڑکیوں میں جو سکنڈری اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں، دس فیصدی لڑکیاں دورانِ تعلیم حاملہ ہو جانے کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیتی ہیں۔ کینیا کے ڈائریکٹر آف

(۱) ٹائمز آف انڈیا ۷ راگست ۱۹۹۵ء

میڈیکل سروسز کا کہنا ہے کہ ملک کے ساٹھ لاکھ نوجوان لڑکوں و لڑکیوں کو قبل از وقت جنسی مشاغل سے باز رکھنے کے لئے مناسب صلاح و مشورہ دیئے جانے کی فوری ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ فیملی کے ماڈرن تصور نے اس قدیم رواج کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ جب گھر کی بڑی بوڑھیاں دوشیزہ لڑکیوں کو صلاح و مشورہ دیتی رہتی تھیں (۱)

ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ افریقہ اور لاطینی امریکا میں ۱۵ سے ۱۹ سال کی دس فیصدی لڑکیوں کے ولادت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انہیں اسکول چھوڑنا پڑتا ہے۔ نیروبی یونیورسٹی میں ۴۰ فیصدی لڑکیاں اپنی تعلیم کے پہلے دو سالوں میں ہی حاملہ ہو جاتی ہیں اور اکثر اساتذہ خود ان لڑکیوں کو ورغلاتے (Seduce) ہیں۔ زمبیا میں سکنڈری اسکولوں کی دو فیصدی لڑکیاں حاملہ ہو جانے کے سبب سے اسکول سے خارج کر دی جاتی ہیں۔

ہندوستان: میڈیکل ٹرمینیشن آف پرگننسی ایکٹ 1972 کے بعد سے یہاں اسقاط حمل تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہر طبقہ میں تیزی سے مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں یہاں ستر لاکھ Induced ابارشن ہوئے، جس میں صرف دس لاکھ MTP Act کے تحت ہوئے باقی ساٹھ لاکھ غیر قانونی اسقاط کرائے گئے۔ فیملی پلاننگ ایسی ایشن کے ایک تازہ ترین تخمینہ کے بموجب ملک میں ایک کروڑ دس لاکھ غیر قانونی اسقاط حمل ہر سال کرائے جاتے ہیں۔ اور ان سے ۲۵-۳۰ ہزار عورتوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ نوے کروڑ کی آبادی کے اس ملک میں صرف آٹھ ہزار منظور شدہ مرکز ہیں جہاں اسقاط سائنٹفک اور ہائی جینک طریقے سے کرایا جا سکتا ہے۔ (۲)

ڈاکٹر اشونی گاندھی کا کہنا ہے کہ اسقاط کی قانونی اجازت ہنگامی حالات کے لئے دی گئی تھی لیکن ایسے کیس تو بہت کم ہوتے ہیں۔ اسقاط غیر اخلاقی فعل ہے اور یہ فیملی پلاننگ کی تدبیر تو بہر حال نہیں ہے (۳)۔ متعدد فلاحی تنظیموں کی پُرزور مخالفت کے باوجود پریوار سیوا سنستھا نے ملک میں Depo Provera نام کے انجکشن کو رائج کر دیا جو اسقاط

(۱) ٹائمز آف انڈیا ۵ رمئی ۱۹۸۹ء
(۲) ٹائمز آف انڈیا۔ ۲۹ رمئی ۱۹۹۵ء
(۳) TOI 7-5-2000

حمل کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ''میری اسٹوپس'' نامی بین الاقوامی تنظیم نے جو ۱۹۷۶ء سے ملک میں محفوظ اسقاطِ حمل کی خدمات پیش کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ اس انجکشن کو Safe اور قابل اعتماد بتاتے ہوئے اِسے رائج کردیا۔ کئی عورتوں کی تنظیموں نے اسے کینسر پیدا کرنے والا بتاتے ہوئی احتجاج کیا لیکن ''میری اسٹوپس'' کا کہنا ہے کہ دُنیا کے ۹۰ ملکوں کی ۳۰ ملین عورتیں اِسے استعمال کرچکی ہیں اور اس وقت بھی ۶۰ لاکھ عورتیں اس کا استعمال کررہی ہیں، لہٰذا اندیشہ کی کوئی بات نہیں۔

پی. جی انسٹی ٹیوٹ (چندی گڈھ) کی تحقیقات میں بتایا گیا کہ اسقاط کرانے والوں میں سب سے بڑی تعداد ٹین ایج لڑکیوں کی ہوتی ہے جن کی لاعلمی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور نہ چاہے جانے والے حمل کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہورہا ہے۔ آبادی میں نوجوانوں کا تناسب دس فیصدی ہے لیکن ان میں استقرارِ حمل کی شرح ۸ سے ۱۴ فیصدی کے درمیان ہوتی ہے۔

ابارشن کو آبادی کے اضافہ پر روک لگانے کی ایک تدبیر کے طور پر

دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے اِدھر کچھ عرصہ سے کنٹراسپشن اور ابارشن کی پُرزور وکالت کی جارہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی پاپولیشن ڈولپمنٹ کانفرنس جو ستمبر ۱۹۹۴ء میں قاہرہ میں منعقد ہوئی، اس میں ان اُمور پر بھی بحث ومباحثہ ہوا: (۱) اسقاطِ حمل۔ (۲) برتھ کنٹرول اور ہیومن سکشولٹی۔ (۳) نوجوانوں کی جنسی آزادی کی حدود۔ (۴) عورتوں کے بچے پیدا کرنے کے حقوق سے متعلق مسائل، اسی کانفرنس میں بتایا گیا کہ دُنیا کی موجودہ آبادی پانچ ارب ستر کروڑ ہے جو ہر سال نو کروڑ کے حساب سے بڑھ رہی ہے، اگر خاندانی منصوبہ بندی پر ہر ملک میں سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو یہ آبادی ۲۰۲۵ء تک آٹھ ارب پچاس کروڑ (8.5 Billion) پر روکی جاسکتی ہے ورنہ یہ بڑھ کر تیرہ ارب (13 Billion) ہوجائے گی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ آبادی کا سب سے زیادہ اضافہ غریب ملکوں میں ہورہا ہے جہاں نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اسقاطِ حمل کو خاندانی منصوبہ بندی کے ایک طریقے کے طور پر استعمال کئے

جانے پر دُنیا کے تمام طبّی ماہرین نے اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ برطانیہ کے رائل کالج آف آبزیٹیشین اینڈ گائناکالوجی کے صدر سرجان پیل (Sir John Peel) نے کہا کہ بیماریوں کی روک تھام ہوجانے سے شرح اموات میں گراوٹ آئی ہے۔ اور اس لئے موجودہ صدی میں آبادی میں کثیر اضافہ ہوگیا ہے لیکن بانجھ پن اور انتہائی زرخیزی دونوں کے بارے میں ہماری معلومات ابھی بہت خام اور غیر یقینی ہیں۔ اسقاط کے جسمانی اور نفسیاتی اثرات اتنے مضر ہوتے ہیں کہ خود اُن ملکوں میں (مثلاً جاپان وغیرہ) جہاں اسے بڑی تیزی سے اپنایا گیا تھا، اب سنجیدگی کے ساتھ از سرِ نو غور کیا جارہا ہے۔ اور جہاں محض معاشرتی اسباب کی وجہ سے ڈھیل دے دی گئی تھی وہاں انتہائی پیچیدگیاں پیدا ہونے نیز غیر ذمہ دارانہ معاشرتی برتاؤ کی وجہ سے جلد ہی دوبارہ پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت پڑگئی۔ ویسے اگر کسی خاص وجہ سے حاملہ کی صحت خطرے میں پڑجاتی تھی تو ڈاکٹر ایسے حمل کو ساقط کرنے پر رضامند ہوجاتے تھے لیکن اسقاطِ حمل کو حکومتوں کی ایک سیاسی پالیسی کے طور پر آبادی کنٹرول کرنے کی غرض سے اختیار کرنا ایک بالکل دوسری چیز ہے۔

ڈاکٹر برنارڈ نتھانسن نے (سینٹ لیوک اسپتال امریکا) جو شروع میں ابارشن کے زبردست حامی تھے۔ اب اپنے خیالات سے رُجوع کرتے ہوئے ایک میڈیکل جرنل میں لکھا ''مجھے یقین ہوگیا ہے کہ رحمِ مادر میں نطفہ کے ٹھہرتے ہی جان پیدا ہوجاتی ہے اور ایسے جنین کو گروانا ایک انتہائی ذمہ دارانہ فیصلہ ہوتا ہے جسے عورت کو اپنی زندگی میں کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت اس مسئلہ کو خالص سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جارہا ہے اور دونوں فریق محض جذبات کی رُو میں بہ رہے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا غائر جائزہ لے کر قانون وضع کئے جائیں تاکہ اگر ایک طرف اشد ضرورت کے تحت اسقاط ناگزیر ہوتو دوسری طرف ایک معصوم جان کے تلف ہونے کے خسارہ پر اظہار افسوس بھی ہو''۔

قاہرہ کی کانفرنس کے لئے جو پروگرام آف ایکشن بنایا گیا تھا اس میں دُنیا کی آبادی کو روکنے کے لئے جو تجاویز غور کرنے کے لئے رکھی گئی تھیں اُن میں کچھ یہ تھیں:

- کنڈوم کو سستی قیمت پر مہیا کرانے کا انتظام کیا جائے اور اس کا اندراج ضروری ادویات کی ہر فہرست میں کیا جائے۔

- محفوظ اسقاط اور اسقاط سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے لئے علاج کا معقول انتظام کرایا جائے۔
- عورتوں کے لئے جنسی تعلیم اور ولادت سے متعلق حقوق (Reproductive Rights) کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

اس پلان پر ۲۰۰۰ء تک 34 بلین ڈالر خرچ کا منصوبہ بنایا گیا۔

پوپ جان پال دوئم اور کئی اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے اس ایکشن پلان کی سخت مخالفت کی، پوپ نے کہا کہ قاہرہ کانفرنس کو ذمہ دارانہ افزائش نسل Responsible Procreation کی ترویج کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے نہ کہ ایسی جنسیت کے لئے جس میں اخلاقی عنصر مفقود ہو (Sexuality Stripped of Ethics)۔

اسقاط حمل کے مسئلہ پر گرما گرم بحث ومباحثہ ہوا۔ بالآخر طویل اظہار خیال کے بعد Clause 8.25 اس ترمیم کے ساتھ منظور ہوا۔

In No Case Should Abortion be Promoted
As A Method Of Family Planning

کسی بھی صورت میں ابارشن کو خاندانی منصوبہ بندی کی ایک تدبیر کے طور فروغ نہ دینا چاہئے۔

مسودہ میں دوسری تبدیلی جو منظور ہوئی وہ یہ تھی Prevention Of Unwanted Pregnancies Must Always Be Given The Highest Priority And All Attempts Should Be Made To Elimnate The Need For Abortion نہ چاہے حمل کو روکنے کیلئے سب سے اونچی ترجیح دی جانا چاہئے اور تمام ایسی کوششیں کی جانا چاہئیں جس سے اسقاط کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ (۱)

ناجائز ولادتیں

تمام مغربی ملکوں میں کنٹراسپٹوس کا استعمال کس کثرت سے کیا جارہا ہے اور اسقاط حمل کے ذریعہ کتنی بڑی تعداد میں جنین ضائع کرادیئے جاتے ہیں۔ یہ گذشتہ صفحات میں دکھایا جاچکا ہے لیکن قدرت کی ستم ظریفی کہ ان ساری تدابیر کے باوجود ناجائز ولادتیں

(۱) ٹائمز آف انڈیا، ۱۷ اگست ۱۹۹۴ء۔ "ریڈینس" ویکلی دہلی، ستمبر ۱۹۹۴ء

بھی اس کثرت سے ہورہی ہیں کہ گویا ان کی باڑھ آ گئی ہے۔ ان ناجائز بچوں کی پرورش اور کفالت اُن خوشحال ملکوں کی حکومتوں کے بجٹ پر زبردست بوجھ ثابت ہورہی ہے (۱) کمسن لڑکیوں کے بڑی تعداد میں حاملہ ہوجانے کے مسئلہ نے انتہائی سنگین صورت اختیار کرلی ہے اور اسٹیٹ، تعلیمی اداروں، اور والدین کے سامنے نازک چوائس پیش کردیئے ہیں۔ کنٹراسپٹوس کی تقسیم کو اور زیادہ لبرل بنانا گویا قبل از ازدواج جنسی تعلقات کی درپردہ اجازت دینا ہوا، دوسری طرف معاشرہ میں جنسی اختلاط کو جو آزادی حاصل ہے اسے دیکھتے ہوئے کمسنی کے حمل کو روکنے کی کوئی اور تدبیر ہے بھی نہیں۔ دونوں صورتوں نے ایک عجیب کشمکش (Dilemma) میں مغربی معاشرہ کو ڈال دیا ہے۔ امریکا میں ٹین ایج پرگننسی کے واقعات اتنے زیادہ بڑھ گئے ہیں کہ وہاں کے حکام اور اہل علم کو سنجیدگی سے اس پر غور کرنا پڑ رہا ہے۔ تازہ ترین اعداد میں بتایا گیا کہ وہاں ہر دس ٹین ایجر میں ایک حاملہ ہوجاتی ہے جبکہ یورپ میں یہ تناسب بیس میں ایک ہے۔ واشنگٹن پہلا بڑا امریکی شہر ہے جہاں ۱۹۷۶ء میں پہلی بار پچاس فیصدی سے زیادہ بچے رشتۂ ازدواج سے باہر (Born out of Wedlock) پیدا ہوئے اور کچھ شہروں کے اسکولوں میں بے نکاحی ماؤں کے پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ اُنکی پرورش کے لئے اسکول کے حدود میں ہی نرسریاں اور کریچ (Creche) قائم کرنا پڑے جن کی مائیں وہیں تعلیم حاصل کررہی ہیں اور اُن اسکولوں کو بچوں کی تربیت کے متعلق مخصوص کورس شروع کرنا پڑے! پری پورنانند ورما لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء میں غیر کمیونسٹ یورپ میں ۵۰ لاکھ بچے پیدا ہوئے جن میں ۳۲ لاکھ ناجائز تھے (۲)۔ ورجنیا ویمپرس لکھتی ہیں کہ کچھ لاطینی امریکا کے ملکوں میں ۷۰ فیصدی تک ناجائز بچے پیدا ہورہے ہیں جو بڑی خطرناک علامت ہے۔

ناجائز ولادتوں کے ان بڑھتے ہوئے اعداد پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شافلر نے کہا کہ:

"اس اضافہ کا اہم ترین سبب نوجوان طبقہ کے جنسی احساس کی قبل از وقت اور غیر معمولی بیداری ہے۔ موجودہ صحافت، تفریحی پروگراموں، فلموں، ریڈیائی گانوں اور تھیٹر اور ڈراموں نے سارے نوجوان طبقہ کو ایک جنسی ہسٹیریا میں مبتلا

(۱) ایک ناجائز بچہ کی پرورش پر انتظامیہ کو ۱۸ ہزار ڈالر سالانہ خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ (امریکا میں)
(۲) آتم ہتھیا اور واسنا کے اپرادھ، ص ۱۶۵

کر دیا ہے۔ والدین کی غفلت، شراب و دوسری منشیات اور موٹریں یہ سب مل کر بعض طبقات میں شادی سے قبل ہی تقاضائے جنس کو پورا کرنے پر گویا مجبور کر دیتے ہیں۔ نتیجہ میں ایک اخلاقی زلزلہ ہے۔"

امریکا میں ٹین ایج پرگنینسی کی تشویشناک صورت حال

امریکی سنس بیورو کی رپورٹ برائے ۱۹۹۴ء میں بتایا گیا کہ غیر شادی شدہ ماؤں میں بچوں کی ولادت میں ۱۹۸۳ء (۱) کے مقابلہ میں ۷۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اٹھارہ سال سے کم عمر کے ۵۷ فیصدی سیاہ فام بچے، لاطینی امریکا کے ملکوں کی Origin رکھنے والے ۳۲ فیصدی بچے اور ۲۱ فیصدی دوسرے بچے ایک پیرنٹ (Parent) کے ساتھ رہ رہے ہیں جنہوں نے کبھی شادی نہیں کی۔ حکومت ایک ایسے قانون کا مسودہ تیار کر رہی ہے جس کی رو سے ایسے باپ سے جو شادی نہیں کرتے اپنے پیدا ہونے والے بچے کی مالی کفالت کرنے کو کہا جائے گا۔ بیس سال سے کم عمر کی بن بیاہی ماؤں کو اسکول میں رہتے ہوئے اپنی تعلیم جاری رکھنے کو کہا جائے گا تاکہ انہیں ویلفیئر کے فائدے ملتے رہیں اور اگر ایسی بن بیاہی ماں کے دوسرا بچہ پیدا ہو جاتا ہے جبکہ وہ پہلے بچے کے لئے ویلفیئر کے فائدے حاصل کر رہی ہے تو اس دوسرے نوزائدہ بچے کو ویلفیئر کے فائدے نہیں دیئے جائیں گے۔

ریاستہائے متحدہ امریکا میں ناجائز ولادتوں کی شرح برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۳ء کی مدت میں اس میں تین گنا اضافہ ہوا اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے دہے میں ۵۰ فیصدی اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں کل پیدائشوں میں 10.7 فیصدی ناجائز بچے پیدا ہوتے تھے جبکہ ۱۹۸۰ء میں یہ بڑھ کر 17 فیصدی ہوگئے۔ مغربی ملکوں میں امریکا ٹین ایج پرگنینسی میں سب سے آگے ہے یہاں ہر ایک ہزار حمل میں 96 ٹین ایج لڑکیوں کے ٹھہرتے ہیں جبکہ فرانس میں 43، کناڈا میں 44، سوئیڈن میں 36 اور نزدرلینڈ میں 14 حمل ٹھہرتے ہیں۔ وانس پیکارڈ لکھتے ہیں کہ:

"موٹر کار کی پچھلی سیٹ کو مشکل ہی سے جنسی آسودگی کے لئے معقول جگہ کہی جا سکتی

(۱) ۱۹۸۳ء میں ۱۱ لاکھ امریکی کمسن لڑکیاں حاملہ تھیں اور پانچ لاکھ کے بچے پیدا ہوئے۔ ان لڑکیوں میں بڑی تعداد سیاہ فام اور ہسپانیوں Hispanics کی تھی۔ نصف سے زیادہ ایسی تھیں جنہوں نے شادی نہ کی تھی۔

ہے لیکن یہی وہ جگہ ہے جہاں امریکا کے بیشتر ناجائز حمل ٹھہرتے ہیں"۔

ذیل کے نقشہ میں ۱۹۴۰ء سے امریکا میں آبادی و ناجائز ولادتوں میں اضافہ کے اعداد پیش ہیں:

ریاستہائے متحدہ امریکا میں آبادی و ناجائز ولادتوں میں اضافہ

سال	امریکا کی آبادی (ملین میں)	گذشتہ دہے سے آبادی میں اضافہ کا فیصد	ناجائز ولادتیں		
			کل ناجائز ولادتیں	ایک لاکھ آبادی پر	اضافہ کا فیصد
1940			89,000		
1950	151.3	19.9	1,42,000	90	
1960	179.3	28.0	2,24,000	120	33.3
1970	203.2	24.0	3,99,000	190	58.3
1980	226.5	23.2	5,07,800	260	36.5

امریکا کے ایجوکیشن کمیشن کی ایک سب کمیٹی نے (جس کے صدر ورجینیا کے گورنر چارلس ایس راب Charles S. Robb تھے) امریکی نوجوانوں کے تعلیمی و معاشرتی مسائل اور ان کے مستقبل کیریر کا جائزہ لیا (۱۹۸۵ء) تو وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ امریکی نوجوانوں میں منشیات کی بڑھتی ہوئی لت، ٹین ایج پرگنینسی، جرائم اور بے روزگاری کی وجہ سے دس سے انیس سال کے پندرہ فیصدی نوجوان آگے چل کر معاشرہ سے الگ تھلگ ہو جائیں گے اور ملک کے لئے مفید کارآمد شہری (Productive Adult) نہ ثابت ہوں گے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کچھ حیرت انگیز انکشافات کئے، مثلاً یہ کہ:

- ہر سال دس لاکھ امریکی ٹین ایج لڑکیاں حاملہ ہو جاتی ہیں (یہ اس کے باوجود کہ اسکول کالج طلباء کو برتھ کنٹرول کے بارے میں پوری معلومات مہیا کرتے رہتے ہیں)۔
- ایک ٹین ایجر ہر ۹۰ منٹ پر خودکشی کرتا رہتا ہے۔
- ۱۹۶۰ء کے مقابلہ میں ٹین ایج پرگنینسی میں سفید فاموں میں ۱۰۹ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے اور غیر سفید فاموں میں ۱۰ فیصدی کا اضافہ اور
- ٹین ایجرس کے ذریعہ قتل انسانی (Homicide) میں حیرتناک اضافہ ہوا۔

سفید فاموں میں 232 فیصدی اور بلیکس میں 16 فیصدی!!

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ امریکی تعلیم کی کوالیٹی میں انحطاط کی وجہ سے کئی برنس ہاؤسس کو 40 ملین ڈالر ہر سال کام کرنے والوں کی ٹریننگ پر صرف کرنا پڑ رہے ہیں۔ ان تمام اُمور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ ''فیملی، کمیونٹی، اسکول اور دوسرے سوشیلائزیشن (Socialisation) اور انٹگریشن کے ادارے ویسا معیاری کام نہیں کر رہے ہیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے''۔

ریاستہائے متحدہ امریکا کے کے ہیلتھ کمشنر رابرٹ وہیلن (Robert Whalen) نے کہا کہ کمسنی کی جنسی کارگزاریاں بچوں کی صحت کے لئے ایک انتہائی خطرناک مصیبت ہیں۔ پرگننسی کی وجہ سے ہی بڑی تعداد میں لڑکیاں اسکول چھوڑ دیتی ہیں اور یہی ٹین ایجرس میں بڑھتی ہوئی خودکشی کے لئے ذمہ داری ہوتی ہیں اور پچاس فیصدی ڈیتھریا (Diptheria) اور خسرہ (Measles) کا سبب بھی یہی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر موصوف نے اعداد وشمار کی بنیاد پر کہا کہ جنسی کارگزاریوں میں سرگرم (Sexually Active) ٹین ایجرس لڑکیوں میں 25 فیصدی حاملہ ہوجاتی ہیں اور یہ حمل ماں اور بچے دونوں کے لئے ''ہائی رسک'' ہوتے ہیں اور 30 فیصدی قانونی اسقاط بھی یہی ٹین ایجر لڑکیاں کراتی ہیں۔ چونکہ ایک خاص عمر تک ان بچوں کی کفالت انتظامیہ کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لئے یہ ان کے لئے بھی بڑا سر درد ہوجاتا ہے۔

راجدھانی واشنگٹن میں ناجائز ولادتیں 50 فیصدی سے زیادہ

نیشنل سینٹر فار ہیلتھ اسٹیٹکس (NCHS) نے بتایا کہ واشنگٹن امریکا کے بڑے شہروں میں پہلا ایسا شہر ہے جہاں ۱۹۷۶ء میں پہلی بار 50 فیصدی سے زیادہ ناجائز بچے پیدا ہوئے۔ پورے ملک میں اوسطاً 13 فیصدی (۱) بچے غیر شادی شدہ ماؤں کے پیدا ہوتے ہیں اور یہ تناسب ۱۹۶۰ء سے برابر بڑھتا جارہا ہے۔ واشنگٹن میں صرف ایک سال میں نمایاں اضافہ ہوا جیسا کہ ذیل کے اعداد سے واضح ہے:

(۱) یہ اوسط بڑھ کر ۱۹۷۹ء میں ۱۷ فیصدی اور تازہ ترین اعداد (۱۹۹۸ء) کے بموجب 32 فیصدی ہوگیا ہے۔

واشنگٹن اور بالٹیمور میں ناجائز ولادتوں کا فیصد

سال	واشنگٹن		بالٹیمور	
	سیاہ فام	سفید فام	سیاہ فام	سفید فام
1974	47.1	6.5	64	13
1975	57.0	12.9		

حکام کا کہنا ہے کہ چونکہ واشنگٹن کی آبادی میں بلیکس کا تناسب زیادہ ہے۔ تقریباً تین چوتھائی۔ اس لئے سیاہ فاموں میں ناجائز ولادتوں کے تناسب میں اضافہ کی وجہ سے مجموعی تناسب بھی بڑھ گیا۔ لیکن بالٹیمور میں چونکہ آبادی میں بڑی اکثریت سفید فاموں کی ہے اس لئے وہاں کا Overall تناسب 45.3 فیصدی رہا۔

عالمی ادارۂ صحت کے بلیٹن ''ورلڈ ہیلتھ'' میں بتایا گیا کہ امریکا اور لاطینی امریکا کے ملکوں میں حاملہ ٹین ایجرس کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسکولوں میں حاملہ طالبات کی تعداد میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ عام طور ان طالبات کی عمر ۱۷-۱۹ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ۱۲ سال کی طالبات بھی حاملہ پائی گئیں اور ۳۵ سال کی عمر کی ''دادیاں'' عام طور پر دکھائی دیتی ہیں (۱)۔

پری پورنا نندورما اپنی کتاب Sex Offences In India & Abroad میں لکھتے ہیں:

''کنٹراسپیوزا اور برتھ کنٹرول تدابیر کتنی ہی ضروری ہوں خاندان کے استحکام کو ختم کررہی ہیں۔ فرانس میں ۱۹۷۱ء میں 61,765 ناجائز بچے پیدا ہوئے جو کل زندہ پیدائشوں کا سات فیصدی تھے۔ جرمنی میں ناجائز ولادتوں کو نہ روک سکنے کی وجہ سے ۱۹۷۴ء میں قانون وضع کرکے انہیں جائز قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۷۴ء سے سوڈن میں ابارشن فری اور جائز قرار دے دیا گیا۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں بارہ لاکھ ابارشن ہوتے ہیں۔ یو.کے (UK) میں دو لاکھ ابارشن ہوتے ہیں جو گذشتہ دس سال سے 40 فیصدی کا اضافہ ہے۔ اٹلی جیسے ملک میں جہاں رومن کیتھولکس کی بھاری اکثریت رہے پر ابارشنس

(۱) Indian Express 23.12.76

نے سڑکوں پر جلوس نکالتے ہوئے یہ نعرہ لگایا: ''رحم میرا ہے اور میں اُسے صحیح مینج (Manage) کرسکتی ہوں'' روس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہاں ہر دس بچوں میں ایک ناجائز ہوتا ہے اور چار لاکھ سے زیادہ ناجائز ولادتیں ہر سال ہوتی ہیں''۔

میگزین اکانومسٹ The Economist نے اپنی تازہ اشاعت میں لکھا:(۱)

''طلاق اب تیس سال قبل کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ عام ہے اور تقریباً نصف شادیاں طلاق لے کر ختم ہوجاتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں ۲۰-۴۴ سال کی عمر کی صرف پانچ فیصدی عورتیں ایسے مردوں کے ساتھ رہتی تھیں جن سے انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ سال گذشتہ (یعنی ۱۹۹۷ء میں) یہ تعداد 24 فیصدی ہوگئی۔ ۱۸ سال سے کم عمر کے 17 فیصدی بچے ایک پیرنٹ (Parent) کے ساتھ رہتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ناروے میں 48 فیصدی بچے رشتۂ ازدواج سے باہر پیدا ہوئے۔ کچھ دوسرے ملکوں میں ایسی ناجائز ولادتوں کا فیصد یہ تھا: سویڈن 55، فرانس 38، ریاستہائے متحدہ امریکا 32، جرمنی 18 اور اٹلی 8، ناروے 48۔

ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق نے اپنی کتاب ''یہ ہے مغربی تہذیب'' میں امریکا میں ناجائز ولادتوں کے یہ اعداد دیئے ہیں:

''۱۹۹۲ء میں ۱۹ سال سے کم عمر لڑکیوں نے جن بچوں کو جنم دیا اُن میں سے ۶۵ فیصد ناجائز اولاد تھے۔ ہسپانوی آبادی میں یہ شرح ۶۰ فیصد اور سفید نسل میں ۵۶ فیصد ہے''۔ (ص ۳۶) قتل اطفال کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکہ میں ہر سال ۵۳ لاکھ حمل گرائے جاتے ہیں۔ (ص ۳۸)

نیوجرسی اسٹیٹ میں تو نوبت بہ ایں جارسد کہ ہر پانچ بچوں میں سے چار بچے ولد الزنا ہوتے ہیں۔ (ص ۵۲)

برطانیہ میں ناجائز ولادتوں کا تناسب پانچ میں ایک

آفس آف پاپولیشن سینس اینڈ سرویز (OPCS) کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ یو.کے میں پیدا ہونے والے ہر پانچ بچوں میں ایک ولادت ناجائز ہوتی ہے اور ہر تین بچوں میں ایک بچہ غیر شادی شدہ والدین کے یہاں پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں پیدا ہونے

(۱) ۲۱-۲۷ر فروری ۱۹۹۸ء ص ۵۳

والے کل دو لاکھ ۹۳ ہزار بچوں میں ایک لاکھ ۲۶ ہزار (یعنی ۱۹ فیصدی) ناجائز تھے۔ یہ ۱۹۸۴ء سے ۱۴ فیصدی کا اضافہ تھا اور ۱۹۷۵ء سے تقریباً دُگنا ۱۹۷۵ء میں ناجائز ولادتوں کی تعداد ۵۵ ہزار سے زیادہ رہی تھی (۱)۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہ تعداد کہیں زیادہ ہے۔ ڈائریکٹر میلکم وکس نے بتایا کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان ۲۵ سال سے کم عمر کی ایسی عورتوں کی تعداد جو اپنے شوہروں کے ساتھ شادی کے پہلے ہی سے رہتی تھیں دو فیصدی سے بڑھ کر اکیس فیصدی ہوگئی لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ برطانیہ کے جوڑوں کی اکثریت اب بھی شادی کو ہی صحیح تسلیم کرتی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ سویڈن، ڈنمارک اور آئس لینڈ میں ۴۰ فیصدی بچے رشتۂ ازدواج سے باہر پیدا ہوتے ہیں بلکہ ڈنمارک میں تو یہ شرح ۴۳ فیصدی سے اوپر پہنچ گئی ہے! فرانس میں 19.6 فیصدی کی شرح کو دیکھتے ہوئے برطانیہ کی شرح 15.4 فیصدی پھر غنیمت ہے۔ ایک دوسری رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۹۷۹ء میں برطانیہ میں 60,600 ''لَو بیبز'' (Love Babies) پیدا ہوئے یعنی ہر سو ولادتوں میں نو ناجائز بچے اور فلمی اداروں Vanessa Redgrave اور Mia Farrow نے رشتۂ ازدواج سے باہر پیدا ہونے والے بچوں کو قابل عزت (Respectable) بھی بنادیا ہے اور اُن کی آشنائی کی داستانیں وہاں کے معزز اخبارات ''ٹائمز'' اور ''دی گارجین'' میں تفصیل سے چھپتی رہتی ہیں!

برطانیہ کے اعداد وشمار کے سالانہ کمپیڈیم ''سوشل ٹرینڈس'' ۱۹۸۸ء (ایڈیٹر Tom Griffin) میں بتایا گیا کہ وہاں بیس سال سے کم عمر کی جو لڑکیاں شادی کرتی ہیں اُن میں تین میں ایک شادی کے وقت حاملہ ہوتی ہے اور ۲۵ سال سے کم عمر کی عورتوں میں ہر چھ میں ایک کے بطن میں آنے والا بچہ شادی سے قبل ہی ٹھہر جاتا ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر کی لڑکیوں میں کنوارے پن (Virginity) کا ختم ہوجانا اب کوئی استثنائی واقعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ معمول بن چکا ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ہر اسکول جانے والی لڑکی جس کے ولادت ۔رتی ہے اس کے ساتھ کی دو لڑکیاں ابارشن کرا چکتی ہیں۔ بیشتر معاملات میں اسقاط سے کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہوتی کیونکہ لڑکیاں صرف ایک ہفتہ اسکول سے غیر حاضر رہتی ہیں اور اسکول والوں کو پتہ بھی نہیں چل پاتا۔ زیادہ خطرہ اُن لڑکیوں کو لاحق ہوتا ہے جنہیں حمل کا

(۱) پانیر ۱۷ر جولائی ۱۹۸۶ء

پتہ دیر میں چل پاتا ہے کیونکہ اکثر لڑکیاں جان نہیں پاتیں کہ وہ حاملہ ہیں یا جانتے ہوئے بھی اُسے چھپائے رکھتی ہیں۔ رپورٹ کے ورکنگ پینل کو یہ معلوم ہوا کہ ۱۹۷۷ء میں انگلستان اور ویلز میں ۱۶ سال سے کم عمر کی ۳ ہزار اسکولی لڑکیاں حاملہ ہوگئیں جن میں صرف ایک تہائی نے بچوں کو جنم دیا اور باقی نے قانونی طور پر ابارشن کرادیا۔ جن اسکولوں کا سروے کیا گیا اُن میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء کے درمیان آٹھ سو اسکولی لڑکیاں حاملہ پائی گئیں جن میں صرف ۳۰ کی عمریں ۱۶ سال سے اوپر کی تھیں دو تہائی لڑکیوں کے ولادت ہوئی۔

برطانوی ماہنامہ "سائکالوجی" نے اپنی ایک اشاعت میں لکھا کہ "بے نکاحی ماؤں کے روز افزوں تعداد خصوصاً ۱۹ سال سے کم عمر والیوں نے ہمارے معاشرہ کے لئے ایک سخت چیلنج پیش کردیا ہے"۔ برطانوی وزارت صحت و سوشل سیکوریٹی کی طرف سے ایک منصوبہ تیار کیا گیا جس کے تحت نوجوان لڑکوں ولڑکیوں کو استقرار حمل اور خاندانی منصوبہ بندی جیسے معاملات میں صلاح و مشورہ دیا جائے گا تاکہ ملک میں بڑھتی ہوئی ناجائز ولادتوں کو روکا جاسکے۔(۱)

(TOM GRIFFIN) ٹام گرفن کا کہنا ہے کہ کیریر گرلز میں ناجائز ولادتوں سے اور نازک صورت حال پیدا ہوجاتی ہے اگر وہ اپنے بچوں کی پرورش و کفالت کریں تو ان کا کیریر متاثر ہوتا ہے لہذا بڑی تعداد میں یہ اپنے بچوں کو ادھر ادھر (اسٹور، ویران، جھاڑیوں، یا ریل گاڑی کی نشست کے نیچے) چھوڑ آتی ہیں جنہیں وہاں کی کاؤنٹی کاؤنسلیں پالتی ہیں اور جب یہ بچے بڑے ہوتے ہیں تو انہیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی ماں کون تھی۔ باپ کون تھا اور وہ خود کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ ایسے بچوں کی طرف بے التفاتی اور ماں باپ کی شفقت و پیار نہ ملنے سے اُن میں متعدد نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتی ہیں جو ان کی شخصیت کی تشکیل میں مانع ثابت ہوتی ہیں"۔

دوسرے ملکوں میں

سویڈن میں اب ہر تین بچوں میں ایک ناجائز اولاد ہوتی ہے جبکہ ۱۹۵۰ء میں یہ تناسب دس میں ایک تھا۔ تیس سال سے کم عمر کی ایک تہائی سویڈش عورتیں شادی کے بغیر ہی اپنے بوائے فرینڈس کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ شادی یہاں غیر مقبول ہوتی جارہی ہے۔

(۱) "Permissivenes & Modern Youth" Ikramullah - p 180-181

۱۹۶۵ء میں 60 ہزار لوگوں نے شادیاں کیں تھیں جبکہ ۱۹۷۷ء میں صرف 40 ہزار شادیاں ہوئیں۔ بہت سی طلاق یافتہ عورتیں دوبارہ شادی کرنے کے بجائے ویسے ہی لوگوں کے ساتھ رہنے لگتی ہیں۔ **کناڈا** میں ۲۰ سال سے کم عمر کی بے نکاحی ماؤں کے ناجائز بچوں کی ولادت کے مسئلہ نے سنگین صورت اختیار کرلی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں 53 ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے جبکہ ۱۹۷۴ء میں یہ تعداد ۱۷ ہزار اور ۱۹۷۹ء میں ۳۸ ہزار تھی۔ سب سے زیادہ اضافہ ۲۰ سے ۲۴ سال کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کے پیدا ہونے والے بچوں میں ہوا یعنی 21,500! 15 سے 19 سال کی عمر والیوں کے یہاں 16,500 ناجائز بچے پیدا ہوئے۔

سویٹ یونین: غیر نکاحی ماؤں کا مسئلہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے روس کے لئے دردسر بنا ہوا ہے جب لاکھوں آدمی جنگ میں کام آگئے اور ہزاروں ناجائز تعلقات علم میں آئے۔ اعداد میں بتایا گیا کہ وہاں ہر 170 عورتوں پر صرف سو مرد ہیں۔ مردوں کی شرح اموات زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ عدم توازن بنا رہتا ہے۔ غیر مستحکم خاندان اور ناجائز تعلقات کی وجہ سے طلاق کے واقعات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ دیہاتوں کی فیملی لائف منتشر ہوجانے کی وجہ سے بڑی تعداد میں لڑکیاں فیکٹریوں کی ملازمت کے لئے شہروں کا رخ کرتی ہیں جہاں وہ گمراہی کی راہ پر گامزن ہوجاتی ہیں۔

مغربی جرمنی پلس (Pills) کے کثرت استعمال اور سیکس ایجوکیشن کے باوجود یہاں ۴۰ ہزار ناجائز بچے ہر سال پیدا ہوتے ہیں۔ **ڈنمارک**: Kisten Auken نے بتایا کہ ان کے جائزہ میں جو لڑکیاں شامل تھیں اُن میں 50 فیصدی شادی کے وقت حاملہ تھیں۔ **زمبیا** جس نے تین سال قبل اپنے ملک کو مسیحی ریاست قرار دیا تھا۔ وہاں حال میں (دسمبر ۱۹۹۷ء) حکومت نے اپنی نئی پالیسی کا اعلان کیا جس کے تحت اسکولی طالبات جو دوران تعلیم حاملہ ہوجاتی ہیں اب وہ اپنے بچہ کی ولادت کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں گی۔ افریقہ کے اس قدامت پرست ملک کی اس پالیسی پر زوردار بحث و مباحثہ جاری ہوگیا اور اس کی موافقت و مخالفت میں متعدد بیانات جاری ہوئے۔ اس سے قبل ایسی لڑکیوں کو درسگاہوں سے خارج کردیا جاتا تھا۔ چرچ اور دوسرے معزز اشخاص نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اسکول ان کے اس فعل کو نظر انداز کررہا ہے اور اس سے لڑکیوں میں بداخلاقی بڑھے گی۔ بشپ جان ماربو نے کہا کہ یہ مسیحی ریاست کے تصور کے

منافی ہے اور لڑکیاں یہ سوچنے لگیں گی کہ ناجائز ولادت معیوب نہیں ہے۔ کئی NGOS اور آزادیٔ نسواں کی علم بردار تنظیموں نے اس پالیسی کی موافقت کی اور اسے صحیح قدم بتایا۔ حاملہ ہو جانے والی لڑکی کو ہمیشہ کے لئے تعن و تشنیع کا ہدف بنانا اور اس کی تعلیم میں رکاوٹ ڈال دینا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت نے یہ مزید واضح کیا کہ لڑکیوں کو صرف ایک موقعہ دیا جائے گا اگر وہ دوبارہ حاملہ ہو جاتی ہیں تو اسکول انہیں واپس نہیں لے گا۔

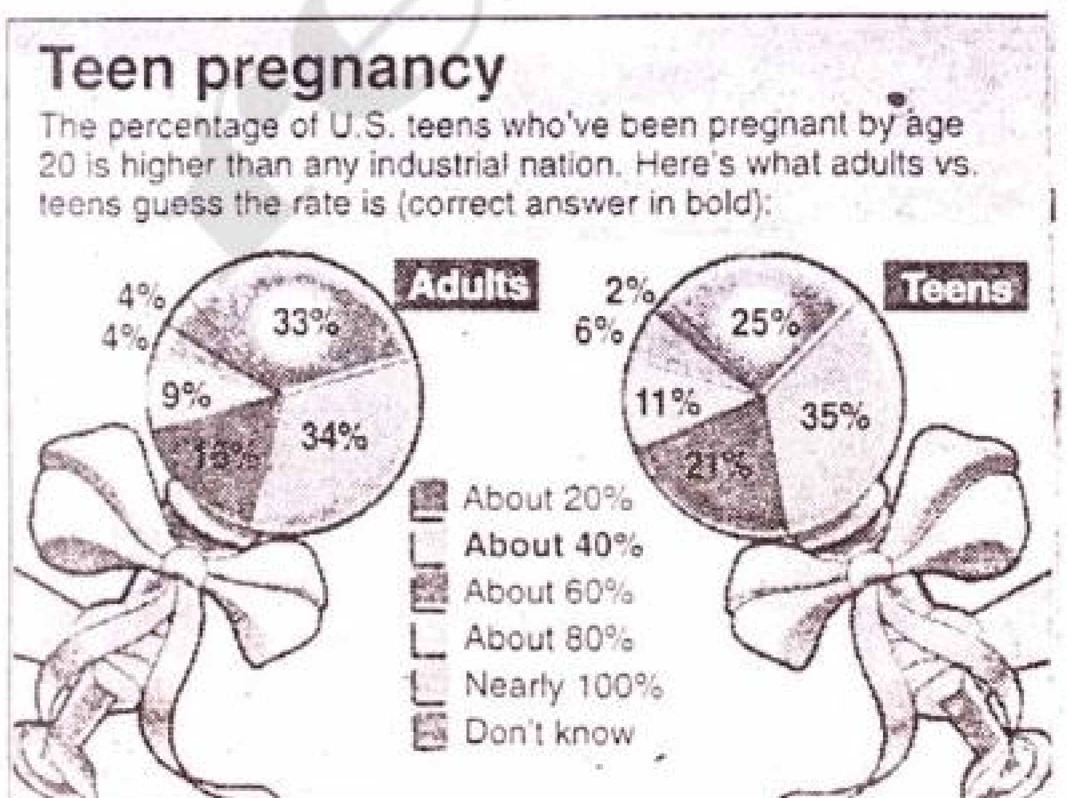
جنوبی کوریا کی حکومت اسقاط حمل کے کوئی اعداد و شمار نہیں رکھتی ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک میں ہر سال دس لاکھ غیر قانونی اسقاط کرائے جاتے ہیں جن میں نصف کمسن لڑکیوں کے ذریعہ کرائے جاتے ہیں۔ (Pioneer 23.4.1991)

ناجائز ولادتوں کے بارے میں روشن خیالی پر مبنی حکومت کی پالیسیاں

بیشتر مغربی ممالک ٹین ایج ماؤں اور ان کے بچوں کی طرف زیادہ نرمی کا رویہ اختیار کر رہے ہیں اور ان کے رجحان میں کافی لچک پیدا ہو گئی ہے۔ زیادہ تر ملکوں میں ایسے ''لو بے بیز'' (Love Babies) کو وہی حقوق و مراعات اور جائیداد میں ویسے ہی حصہ دیا جانے لگا ہے جیسا کہ جائز بچوں کو دیے جاتے ہیں۔ امریکا کی متعدد بڑی ریاستوں مثلاً نیویارک کیلیفورنیا اور میسوچسٹس وغیرہ میں از راہ ترحم ولادتوں کے رجسٹر سے ناجائز کا خانہ ہی ہٹا دیا گیا ہے۔ اسکول و کالج کے منتظمین بھی ایسی بے نکاحی ماؤں کی طرف زیادہ رواداری کا رویہ اپنانے لگے ہیں اور ان کی طبّی دیکھ بھال نیز کریچ وغیرہ کے انتظامات کرنے لگے ہیں جبکہ پہلے انہیں اسکول سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ متعدد رضا کارانہ تنظیمیں ایسی لڑکیوں کو مناسب صلاح و مشورہ اور خاندانی منصوبہ بندی کی تدابیر بہم پہنچانے لگے ہیں تاکہ وہ دوبارہ حاملہ نہ ہو سکیں۔

نئے وضع کردہ قوانین میں Exception Plurium کو بھی ختم کر دیا گیا ہے جس میں مدعا علیہ بیشتر ایسے Paternity مقدمات میں یہ عذر پیش کرتا تھا کہ اس وقفہ میں لڑکی کئی آشناؤں سے ہمبستر ہوئی لہٰذا ٹھہرا ہوا حمل اس کا نہیں ہے۔ ویلفیئر منصوبوں کے تحت بہت سی حکومتیں ایسے بچوں کی پرورش و نگہداشت، ان کی تعلیم و تربیت اور ملازمت کی

ذمہ داریاں خود سنبھالنے لگیں اور اس کام کے لئے ٹرینڈ سوشل ورکرس کو لگایا گیا جس سے حکومت پر مصارف کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ سویڈن میں باپ کی وفات کے بعد ناجائز بچے کو ترکہ میں ویسے ہی حصہ دیا جاتا ہے جیسے کہ جائز بچوں کو۔ ناروے میں اگر ماں درخواست کرے تو حکومت کو گورنس مقرر کرنا پڑتی ہے اُسے صرف اپنے حاملہ ہونے کی اطلاع حکومت کو دینا ہوتی ہے۔ فن لینڈ میں ۱۷ سال کی عمر تک ایسے بچوں کی پرورش اسٹیٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یونان نے ناجائز بچوں کو وہی قانونی Status اور حقوق دیئے ہیں جو جائز اولاد کو ملتے ہیں۔ روس میں جائز و ناجائز کی تفریق ہی ختم کر دی گئی ہے۔ وہاں ایسے بچوں کو تحقیر کی نظر سے بھی نہیں دیکھا جاتا۔



باب نہم

مضر صحت اثرات

جدید طرزِ زندگی جس میں شراب وسگریٹ نوشی، ہیروئن وکوکین، عریانیت وفاشی، شہوت پرستی وجنسی بے راہ روی اور کنڈوم کلچر پوری طرح سرایت کر گیا ہے، اس کے فطری نتائج افراد کے اخلاق اور ان کی جسمانی ودماغی صحت پر مرتب ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقتصادی خوشحالی اور فارغ البالی کے باوجود افراد کی صحت گرتی جا رہی ہے اور ان کی قوت کارکردگی (Efficiency) میں بھی نمایاں انحطاط ہوتا جا رہا ہے اور وہ تمدن جدید کے لائے ہوئے بے شمار امراض کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ مادیت کا اسقدر شدید غلبہ ہو گیا ہے کہ روحانی واخلاقی قدریں اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد بالکل پس پشت پڑ گئے ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور تگ ودو کی بنا پر ذہنی خلفشار اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ انسان کے اعصاب پر سخت تناؤ (Tension) پڑ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے دماغی واعصابی امراض بھی بڑھ رہے ہیں اور خودکشی کے واقعات بھی بڑھ رہے ہیں۔ قبل از وقت جنسی بیداری نے ٹین ایج پرگنینسی، ابارشن اور ناجائز ولادتوں جیسے سنگین مسائل پیدا کر دئے ہیں اور جنسی امراض نیز ایڈس (AIDS) نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ علاج ومعالجہ کی بہترین سہولتوں کے باوجود ہائی بلڈ پریشر، کینسر اور امراض قلب سے وفات پانے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ نے صحت عامہ کے ماہرین، حکام اور سماجی کارکنوں کو بے حد فکر مند بنا دیا ہے اور آج کی ٹکنالوجیکل سوسائٹی نے جو اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے انسانیت کو مایوسی کی کگار پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

The Technological Society Is Grinding Mankind

To A Condition Of Bewildered Despair.

برطانوی ماہر صحت پروفیسر اسٹوکس (Stokes) نے کہا کہ ''ان خوشحال ملکوں نے دنیاوی کامیابی میں جو کچھ حاصل کیا اُسے اپنی صحت میں گنوا دیا۔ اچھی غذا کی مقدار میں کچھ کمی اور مشرقی فلاسفی میں تھوڑا غور وفکر مغربی ملکوں کے باشندوں کی تندرستی بنانے اور انہیں کینسر جیسے امراض سے نجات دلانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر مغربی ممالک تھوڑی مشرقی فلاسفی امپورٹ کر سکیں تو شاید وہ زیادہ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔''

آج کل کاسمٹکس، نائلان، ربڑ وفوم کی اشیاء کا استعمال بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ متعدد تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ حسن افزا صابن، کریم پاؤڈر، لوشن ولپ اسٹک اور طرح طرح کی مصنوعی خوشبوئیں جو تیار کی جاتی ہیں اُن میں بہت سے ایسے کیمیاوی اجزا ہوتے ہیں جو نہ صرف جلد (Skin) کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں بلکہ ان سے خارش، چنبل وداد وغیرہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض عورتوں کو جو لمبے عرصہ تک ان اشیاء کا استعمال کرتی ہیں سینہ اور پھیپھڑے کے متعدد امراض اور امراض تنفس (Respiratory Diseases) مثلاً دمہ وغیرہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات یہ بیماریاں بیوی سے گزر کر شوہر تک پہنچ جاتی ہیں اور ان کی تندرستی کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں۔ سستی قسم کی اشیائے آرائش لپ اسٹک ونیل پالش میں کچھ ایسے رنگ وغیرہ بھی ملا دیئے جاتے ہیں جو کھانے کے ساتھ معدہ میں پہنچ جاتے ہیں اور صحت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

بکنی اور لباس تیراکی سے جسم کا بڑا حصہ آفتاب کی تیز شعاعوں میں کھلا رہتا ہے جس سے جلد کے کینسر ہو جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سرد موسم میں ہلکے موزے اور کاغذ کی طرح پتلے زیر جامے کا استعمال بھی خطرناک ہو سکتا ہے اور یہ بہت سی عورتوں کے پیروں میں سوجن پیدا کر دیتی ہیں۔ نائلون کے موزے اور بہت زیادہ چست پتلون یا اسکرٹ پہننے سے بھی جلد کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ خشک وتر کھجلی، پھنسیاں اور جلدی التہاب وغیرہ کے امراض اکثر ایسے لباس سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ نائلون اور اسٹیچ لان کے کپڑوں کی رگڑ سے لاعلاج جلدی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ مختصر اسکرٹ سے ران اور گھٹنوں کا حصہ کھلا رہتا ہے جس کی وجہ سے وجع مفاصل کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس

کے علاوہ جسم کے برہنہ حصے مردوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہیں اور دفاتر نیز فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی توجہ کام سے ہٹاتے ہیں جس سے پروڈکشن گرنے لگتا ہے اور ملک کو اقتصادی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔

آج کل مائیں عام طور پر بچوں کی رضاعت بہت کم کرتی ہیں جس کے نتیجہ میں ایک طرف تو بچے کمزور رہ جاتے ہیں اور انکی قدرتی نشوونما (Growth) میں فرق پڑ جاتا ہے اور دوسری طرف عورتیں سینہ کے کینسر کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ جن عورتوں کے کوئی اولاد نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے یا جنہوں نے اپنی اولاد کی رضاعت خود نہیں کی ہے یا جن کے اسقاط ہو چکے ہیں کینسر زیادہ تر انہیں کو ہوتا ہے۔ بار بار کی زچگی اور رضاعت عورت کو پستانی غدود کے کینسر سے محفوظ رکھتی ہے۔

پلس اور دوسرے کنٹراسیپٹیوس کے طبی نقصانات متعدد تحقیقات سے ثابت ہو چکے ہیں۔ برٹش میڈیکل جرنل نے بہت پہلے آگاہ کر دیا تھا کہ پلس میں اسٹروجن (Estrogen) ہارمون زیادہ مقدار میں ہوتا ہے اور اس کے مسلسل استعمال سے شریانوں میں جو خون گردش کرتا ہے اس میں گتھیاں Blood Clots پڑ جاتی ہیں جس سے تھرامبوسس (Thrombosis) کی بیماری ہونے کے امکانات کافی بڑھ جاتے ہیں۔

پروفیسر Dalleubach کا کہنا ہے کہ بغیر ڈاکٹری صلاح ومشورہ کے اگر پلس زیادہ لمبے عرصہ تک کھائی جاتی رہیں تو رحم (Uterus) کے منہ پر ٹیومر بن سکتا ہے اور سوجن بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ان پلس کا استعمال عمر کے ابتدائی دور میں شروع کر دیا جائے اور لمبے عرصہ تک جاری رہے تو کینسر کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ برطانوی ڈاکٹروں نے اپنی تحقیقات میں یہ پایا کہ نوجوان عورتیں جو چار سال تک مستقل طور پر پلس کا استعمال کرتی ہیں انہیں سینہ کا کینسر ہو جانے کے امکانات زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ "Lancet" میں شائع ہونے والے ایک ریسرچ پیپر میں یہ بتایا گیا کہ ۳۶ سال سے کم عمر کی جو عورتیں مسلسل مانع حمل گولیاں استعمال کرتی ہیں اُن میں بریسٹ کینسر ہو جانے کے امکانات 34 فیصدی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ (۱)

عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ میں بھی یہ اعتراف کیا گیا کہ پلس کا استعمال

(۱) ٹائمز آف انڈیا۔ ۶ مئی ۱۹۸۹ء

عورتوں میں بریسٹ کینسر کا ایک اہم سبب ہے۔ اسی طرح ان عورتوں میں جن کے پہلے بچہ کی ولادت ۳۰ سال کی عمر کے بعد ہوتی ہے اُن میں بریسٹ کینسر کے امکانات اُن عورتوں کے مقابلہ میں جو ۲۰ سال کی عمر پر پہلے بچہ کو جنم دیتی ہیں دُگنے ہوتے ہیں۔ (۱)

ڈاکٹر آئی. ڈی. شرما کا کہنا ہے کہ جو لوگ مغربی طرزِ زندگی اختیار کرتے ہیں ان میں سینہ کے کینسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سینہ کا کینسر طلاق وتفریق پائے ہوئے لوگوں میں، شادی شدہ عورتیں جن کے اولاد نہیں ہوتی، یا جو عورتیں اپنے بچوں کو چھاتی کا دودھ ٹھیک سے نہیں پلاتیں، یا وہ عورتیں جن کے پہلی ولادت کے وقت عمر زیادہ ہوتی ہے۔ ایسے سب ہی لوگوں کو سینہ کے کینسر ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

برطانوی میڈیکل جرنل (Lancet) میں دو رپورٹیں شائع ہوئیں جن میں بتایا گیا کہ Progestogen (ایک ہارمون جو بیشتر پلس میں ہوتا ہے) اور بریسٹ کینسر میں یقینی تعلق (Strong Statistical Link) پایا گیا ہے لہٰذا جو عورتیں ایسی پلس کا استعمال چھ سال تک کرتی ہیں جس میں یہ ہارمون ہو، تو انہیں بریسٹ کینسر ہونے کے امکانات چار گنا زیادہ ہو جاتے ہیں۔ رائل کالج آف جنرل پریکٹیشنرس نے ہارٹ اٹیک اور اسٹروکس کے خطرات سے بھی آگاہ کیا کہ جو عورتیں لمبے عرصہ تک پلس استعمال کرتی رہتی ہیں انہیں Pulmonary Thrombosis ہو جاتا ہے جو Myocardia Infraction کے خطرات کو بڑھا دیتا ہے۔ خاص طور پر اُن عورتوں میں جو Ischaemic دل کی بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر جن اُگاٹا کا کہنا ہے کہ ادھیڑ عمر کی عورتیں جو مسلسل پلس استعمال کرتی ہیں ان کے Cerebral Blood Vessels کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا ان عورتوں کو اور ہائی بلڈ پریشر کی مریض عورتوں کو پلس کے استعمال میں خاص طور پر احتیاط برتنا چاہئے۔ عالمی ادارہ صحت نے اپنے ایک مطالعہ میں یہ پایا کہ پلس کا مسلسل استعمال عورتوں میں Glucose Tolerance کو کم کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ذیابیطس کا مرض ہو سکتا ہے، اس لئے ایسی عورتوں کو جو ذائی بٹیز کی مریض ہوں پلس کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے۔ بوسٹن یونیورسٹی میں کی گئی ایک تحقیق میں یہ پایا گیا کہ ۴۵ سال سے کم عمر کی جو عورتیں اورل کنٹراسیپٹیوس کا استعمال کرتی ہیں اُن میں بریسٹ کینسر کے امکانات بڑھ

(۱) ٹائمز آف انڈیا۔ ۲۳ مئی ۱۹۸۹ء

جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہاورڈ اوڑے کا کہنا ہے کہ پلس کے استعمال کا سب سے بڑا خطرہ کارڈیو ویسکلر Cardiovascular امراض ہیں جس میں ہارٹ اٹیک، اسٹروکس، اور خون کی گٹھیاں شامل ہیں۔ جرنل آف امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن میں شائع ہونے والی ایک تحقیق میں بتایا گیا کہ جو عورتیں Intra Uterine برتھ کنٹرول تدابیر اختیار کرتی ہیں انہیں Pelvic امراض لاحق ہوجانے کے خطرات ۷۰ فیصدی بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جو مرد Vasectomy کراتے ہیں ان کے Blood Vessels میں Atheroscleroisکا مرض ہوجاتا ہے اور کارڈیو ویسکلر امراض کے خطرے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اسی جرنل میں ایک دوسرے تحقیقی جائزے کے حوالے سے بتایا گیا کہ جو عورتیں دو یا اس سے زائد بار اسقاط کرا چکی ہیں انہیں آئندہ حمل کے ضائع ہونے (Miscarriage) کے امکانات زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ رائل کالج آف آبسٹریشین اینڈ گائناکولوجی کا کہنا ہے کہ جو عورتیں بارہ ہفتے کے حمل ضائع کرادیتی ہیں اُن میں جذباتی ونفسیاتی Trauma کے خطرات بڑھ جاتے ہیں اور دوسری طبی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کے غیر قانونی اسقاط خاص طور پر دیر سے کرائے جانے والے۔ عورتوں کی موت کا بڑا سبب ہوتے ہیں۔ ابارشن کے نفسیاتی اثرات عورتوں کی شخصیت کو عرصۂ دراز تک متاثر کرتے رہتے ہیں اور انہیں فیملی میں ایڈجسٹمنٹ کی بڑی دشواریاں اٹھانا پڑتی ہیں۔

پنسلوانیا اسٹیٹ یونیورسٹی اور بروچ (Baruch) کالج نیویارک کے دو Epidemiologists نے ایک تحقیق کی جس میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ایسی عورتیں جو اسقاط کراتی ہیں اُن میں ۳۰ فیصدی کو بریسٹ کینسر ہونے کے امکانات زیادہ قوی ہوجاتے ہیں۔(۱)

اس تحقیق کے ایک ماہر Vernon Chinchilli کا کہنا ہے کہ ان نتائج کو احتیاط سے لیا جانا چاہئے لیکن اگر یہ اعداد وشمار صحیح ہیں تو یہ تشویش کا امر ہے۔ موصوف نے بتایا کہ اس مطالعہ میں 25,967 عورتیں ایسی تھیں جنہیں بریسٹ کینسر ہوا تھا اور 34,977 ایسی عورتیں تھیں جنہیں بریسٹ کینسر نہیں ہوا تھا اور اس Data کو Re-Analyse کیا گیا

(۱) ٹائمز آف انڈیا۔۱۳/اکتوبر ۱۹۹۶ء

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کتنی عورتوں نے اسقاط حمل کرایا تھا۔ اس مطالعہ کے محققین کا کہنا ہے کہ امریکا میں اسقاط حمل کرانے والی پانچ ہزار عورتوں کو بریسٹ کینسر ہر سال ہوتا ہے۔

جنسی ہیسٹیریا: ماہر نفسیات ڈاکٹر گوڈریج کا کہنا کہ امریکی خاتونوں کی ایک بڑی تعداد جنسی ہیسٹیریا کے مرض میں گرفتار ہے اور اس کا سبب امریکا کے فحش وعریاں رسالے اور ہالی وڈ کے نت نئے فیشن ہیں۔ امریکا میں ڈاکٹروں کا بیشتر وقت عورتوں کی اُن بیماریوں کے علاج میں صرف ہوجاتا ہے جن کا باعث ہالی وڈ فلموں کی پیدا کی ہوئی قبل از وقت جنسی جذبات کی بیداری ہے۔ ڈاکٹر مینگ فن لیب (Feinleib) کا کہنا ہے کہ امریکی لڑکیاں جنسی اعتبار سے اب جلد بیدار (Mature) ہونے لگی ہیں اور بہ نسبت زمانہ ماقبل کی لڑکیوں کے جلد بلوغ کو پہنچ جاتی ہیں اور یہ ۵۵ سال سے کم عمر خواتین میں بریسٹ کینسر کے بڑھتے ہوئے کیس کا اہم سبب ہے۔ ایسی صورت میں بیضے (Ovaries) اپنی نارمل نشو ونما سے پہلے ہی اپنا کام شروع کردیتے ہیں اور اس طرح یہ جوان عورتیں بریسٹ کینسر میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔

جلد شروع کی گئی جنسی کارروائیاں اور سروائیکل کینسر

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ (Bethesda, Maryland) پر منعقد ہونے والے اکسپرٹ ڈاکٹروں کے ایک سیمینار میں بتایا گیا کہ جو جوان لڑکیاں آغاز جوانی کے ابتدائی دنوں میں ہی جنسی طور پر سرگرم عمل Sexually Active ہوجاتی ہیں۔ انہیں سروائکل کینسر ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جلد شروع کئے جنسی اختلاط سے Human Papilloma Virus (HPV) کا انفکشن لگ جانے سے سروائکل کینسر پیدا ہوجانے کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ سروائکل کینسر ایک ایسا عجیب وغریب Solid Tumour ہوتا ہے جو ہر کیس میں Induce ہوجاتا ہے۔ غیر سرکاری سائنس دانوں کی اس کمیٹی نے ایک مبسوط رپورٹ سروائکل کینسر کے علاج اور احتیاطی تدابیر پر جاری کی جس میں بتایا گیا کہ امریکا میں ہر سال سروائکل کینسر کے 15,700 نئے کیس ڈائگنوز (Diagnose) کئے جاتے ہیں جو کینسر کے کل کیسس کا چھ فیصدی ہوتے ہیں اور پوری دُنیا میں ہر سال چار لاکھ ستر ہزار سروائکل کینسر کے کیسس ڈائگنوز کئے جاتے ہیں جو

بریسٹ کینسر کے بعد عورتوں میں سب سے بڑی Malignancy ہوتی ہے۔

Louisiana گائنا کولوجیکل کینسر ایکسپرٹ Dr. Patricia S. Braly State University نے کہا کہ اب تقریباً ہر عورت سروائکل کینسر کی ہائی رسک کیٹگری میں شامل ہے جنسی سرگرمی جلد شروع ہو جانے نیز HPV کے پھیلنے کی وجہ سے۔ انہوں نے بتایا کہ HPV انفکشن اب اتنا زیادہ پھیل گیا ہے کہ لڑکیوں کے ایک کالج کے جائزہ میں 25 فیصدی لڑکیاں ایک سال کے اندر ہی اس وائرس سے متاثر پائی گئیں۔ حالانکہ اوسطاً ان کے صرف دو میل پارٹنر تھے۔ ڈاکٹر Braly نے یہ بھی کہا کہ جتنے زیادہ جنسی پارٹنر ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ HPV انفکشن لگنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ صرف وہ لڑکیاں ہائی رسک میں نہیں ہوتیں جو ۱۸ سال کی عمر تک جنسی اختلاط سے بچی رہتی ہیں اور ۱۸ سال کے بعد بھی دو لائف ٹائم پارٹنر تک ہی اپنے کو محدود رکھتی ہیں اور ان کے وہ دو لائف پارٹنر بھی ایسے ہوں جن کے خود کے لائف پارٹنر بھی دو ہی تک محدود ہوں۔

ڈاکٹر Richard L. Sweet پروفیسر یونیورسٹی آف پیٹسبرگ نے بتایا کہ HPV ستر قسم کے ہوتے ہیں لیکن صرف چھ قسم کے سروائکل کینسر سے متعلق ہوتے ہیں۔ تقریباً ۳۰ ملین امریکی HPV سے Infected ہیں جن میں نصف عورتیں ہیں۔ تقریباً ایک فیصدی Infected عورتیں سروائکل کینسر میں مبتلا ہو جائیں گی۔ ڈاکٹروں کے پینل نے کہا کہ کنڈوم کے استعمال سے اس وائرس کو پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن نوجوانوں کو ہمارا مشورہ یہی ہے کہ انہیں بالغ ہونے تک جنسی اختلاط سے بچے رہنا چاہئے۔ Reproductive Tract میں Cellular Changes کا پتہ صرف PAP ٹسٹ سے لگ سکتا ہے جسے روٹین کی طرح اپنایا جانا چاہئے تاکہ وائرس کے پھیلتے ہی اس کا پتہ لگ جائے اور علاج شروع کیا جا سکے۔

جان ہاپکنس یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن کے پروفیسر کے. وی. شاہ نے اپنی تحقیقات کی بنیاد پر یہ بتایا کہ ایسے مرد جو پرامسکوس (Promiscuous) تعلقات دوسری عورتوں سے رکھتے ہیں وہ اپنی بیویوں کو کینسر دے سکتے ہیں۔ 97 فیصدی تک سروائکل کینسر HPV وائرس سے ہوتے ہیں۔ جو مرد کئی جنسی رفیق رکھتے ہیں یا بیسواؤں کے پاس جاتے ہیں انہیں پانچ سے گیارہ گنا تک اس مرض میں مبتلا ہو جانے کے امکانات بڑھ

جاتے ہیں۔ اس لئے طبی ماہرین نے ایسے لوگوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ گھر پر رہیں اور اپنی رفیق حیات کے وفادار رہیں Stay Home & Be Faithful To Your Wives

سروائکل کینسر پانچواں سب سے عام کینسر ہے اور دنیا میں ہر سال کینسر کے جو پانچ لاکھ نئے کیسس ہوتے ہیں ان میں تین چوتھائی ترقی پذیر ملکوں میں ہوتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر سال چار لاکھ عورتیں اس مرض سے فوت ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کی عورتوں کو یہ مرض کثرت سے ہوجاتا ہے اور ایک لاکھ نئے کیس ہر سال Detect ہوتے ہیں۔

حال میں فرانس میں Hepatitisc انفکشن پھیلنے کے امکانات سے ماہرین صحت کو تشویش لاحق ہوگئی ہے جہاں ساڑھے چھ لاکھ افراد اس میں مبتلا پائے گئے۔ ہے پاٹائٹس C کا یہ Blood Borne مرض جنسی اختلاط اور Tainted بلڈ ٹرانسفیوزن سے پھیلتا ہے اور آگے چل کر جگر کا کینسر پیدا کر دیتا ہے۔ جاپان کی MIE یونیورسٹی کے دو محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُورل کنٹراسیپٹیوز میں جو Synthesised Female Sex ہارمون استعمال کئے جاتے ہیں وہ جگر کا کینسر پیدا کر سکتے ہیں۔

امراضِ قلب: ماڈرن لائف اسٹائل کو اپنانے کی وجہ سے امراض قلب میں بھی نمایاں اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ کارڈیو ویسکلر امراض (CVD) اور سرکولیٹری سسٹم کے دوسرے امراض مل کر آج دنیا میں ایک چوتھائی اموات کا سبب بن گئے ہیں۔ صرف امریکا میں ایک ملین افراد ہر سال امراض قلب سے وفات پا جاتے ہیں اور دوسرے تین لاکھ افراد قلب میں Electrical Short-Circuiting کی وجہ سے سڑکوں پر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ صنعتی ملکوں کے نوجوانوں میں یہ مرض اور زیادہ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر جی. پی اگروال کا کہنا ہے کہ "آج امریکا میں ہر چار افراد میں ایک فرد دل کا مریض ہے۔ اعلیٰ معیار زندگی، انتہائی سوقیانہ طرز رہائش، چکنی غذائیں، مے نوشی و سگریٹ نوشی اور ان سب سے بڑھ کر اعصاب پر زبردست تناؤ، جلد بازی اور سرعت دل کو کمزور بنانے کے اہم اسباب میں سے ہیں۔ دراصل یہ جدید تمدن کا تحفہ ہیں۔"

عالمی ادارۂ صحت نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی بتایا کہ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے لائف اسٹائل کی وجہ سے کارونری ہارٹ ڈزیز ماڈرن سوسائٹی کا سب سے بڑا Killer ہو گیا

ہے اور اسی لائف اسٹائل کو ترقی پذیر ملکوں میں اپنائے جانے سے دل کے امراض وہاں بھی بڑھ رہے ہیں۔ چربی کے زائد جزو اور نمک کی غذاؤں الکحل اور نکوٹین کے کثرت استعمال کی وجہ سے اب یہ امراض ان ملکوں میں بھی بڑھنے لگے ہیں۔ چکنائی اور کلیسٹرال کی سطح میں کمی سے ہی اِن امراض میں کافی کمی لائی جاسکتی ہے۔ Myocardial Infraction (MI) زیادہ تر مردوں کو ہو رہا ہے اور ۳۵ سے ۶۴ سال کی عمر کے مردوں میں ہارٹ اٹیکس کی شرح اسی عمر کی عورتوں سے چار پانچ گنا زیادہ پائی گئی۔

ہندوستان میں بھی ہائپر ٹنشن اور امراض قلب میں گذشتہ چند سالوں میں 200 فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر کے۔ جی۔ نائر نے کہا کہ صنعتی ترقی انڈسٹرلائیزیشن اور طرز رہائش میں تبدیلیوں کی وجہ سے 45 سے 60 سال کی عمر والوں میں امراض قلب تو بڑھتے ہی ہیں لیکن اب ملک کی 30 فیصدی بالغ آبادی کے افراد کارونری ہارٹ ڈزیز کے Prone ہوگئے ہیں اور 40 سال سے کم عمر کے لوگوں میں ہارٹ اٹیک کے کیسس میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح سروائکل کینسر کے واقعات بھی ملک میں بڑھ رہے ہیں جس کا اہم سبب کمسنی کی شادی اور ۱۶ سال کی عمر سے پہلے لڑکیوں کا مباشرت میں مبتلا ہوجانا بتایا گیا جو Malignancy کے امکانات کو بڑھا دیتا ہے۔ (۱)

امراض دماغی وخودکشیاں

ڈاکٹر جان ریس (ڈائریکٹر ورلڈ فیڈریشن فار منٹل ہیلتھ) کا کہنا ہے کہ جذباتی اور دماغی بیماریاں خصوصاً اعصابی امراض دُنیا کے ہر ملک میں بڑھ رہے ہیں۔ یہ بیماریاں اعلیٰ معیارِ زندگی کی تلاش کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ قوم پروری میں غلو اور دیگر اقتصادی، معاشرتی نیز تکنیکی تبدیلیاں امراض دماغی میں اضافہ کا بنیادی سبب ہیں۔ پروفیسر سوروکن لکھتے ہیں کہ ''حد سے متجاوز جنسی انہماک خلل اعصاب کا ایک اہم سبب ہے۔ دماغی امراض کثرت مےنوشی سے بھی پیدا ہوجاتے ہیں جو عموماً آزادانہ جنسی تعلقات میں سہیم وشریک رہتی ہے۔ بدمستی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی دماغی الجھنیں بھی امراض دماغی کا ایک اہم سبب ہوتی ہیں۔ جنسی بداعتدالیوں کے جسمانی اثرات مختلف دماغی امراض Manic

(۱) شراب نوشی، ڈرگس، تمباکو اور سگریٹ نوشی کے مضر صحت نقصانات کے لئے دیکھیں مصنف کی کتاب ''نشے کی لت: موت کا سایہ''

Depressive Schizophrenic وغیرہ بھی پیدا کردیتے ہیں۔ خواہشات اور اخلاقی قدروں میں عدم توازن فرد میں مسلسل دماغی تناؤ نیز تصادم پیدا کرنے کا بھی خاص سبب ہوتا ہے''۔

عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ''آج دُنیا میں چالیس ملین افراد شدید قسم کی دماغی بیماریوں میں مبتلا ہیں اور اس سے دُگنے افراد شراب نیز ڈرگس سے پیدا ہونے والے امراض میں مبتلا ہیں، ان کے علاوہ تقریباً دوسو ملین افراد دیگر دماغی امراض Schizophrenia وغیرہ میں مبتلا ہیں اور دماغی شفاخانوں میں داخل ہونے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف منٹل ہیلتھ (واشنگٹن) نے اپنے جائزہ میں یہ پایا کہ ۲۰ فیصدی سے زیادہ امریکی کسی نہ کسی دماغی مرض کا شکار ہیں اور اُن میں بڑی تعداد مےنوشوں کی ہے۔ ڈاکٹر سی سی نڈیلسن (Nadelson) (صدر امریکا سائکٹرک ایسوسی ایشن) کا کہنا ہے کہ تقریباً ۱۲ ملین امریکی بچے ایسی دماغی معذوری میں مبتلا ہیں جن کے صحیح اسباب کا ابھی پتہ نہیں چل پایا ہے لیکن اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان کے والدین کے رشتۂ ازدواج کا انتشار اور ان کی کثرت مےنوشی بڑی حد تک اسکے لئے ذمہ دار ہے۔

ڈیوڈ انالس لکھتے ہیں کہ برطانیہ میں ہر نو مردوں اور چھ عورتوں میں ایک اپنی عمر کے کسی حصہ میں دماغی طور پر بیمار ہوں گے۔ آئندہ دس سال میں دس لاکھ سے زیادہ اشخاص دماغی علاج کے لئے رُجوع کریں گے، اسپتالوں کے آدھے سے زیادہ پلنگ دماغی مریضوں نے گھیر رکھے ہیں جس سے 38 ملین ورکنگ ڈیز کا نقصان ملک کو اٹھانا پڑتا ہے اور منٹل اسپتالوں کے مریضوں کی تعداد میں گذشتہ چھ سال میں 300 فیصدی کا اضافہ ہوا ہے (۱)۔

ٹکنالوجیکل سوسائٹی کی تیز گامی، پروفیشنلس میں Deadline کو پورا کرنے کی فکر اور تنہائی کا احساس خاص طور پر اسٹریس (Stress) پیدا کردیتا ہے۔ فکر وتردد (Worry) آج کے انسان کے لئے انتہائی مہلک مرض ثابت ہو رہا ہے جس کی وجہ سے وہ سکون کی نیند بھی نہیں سو پاتا اور Insomania کے مریضوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور خواب آور گولیوں کا کثرت استعمال اسی مرض کی نشاندہی کرتا ہے۔

(۱) کتاب ''OUT OF MIND'' از David Anals

Anxiety اور Depression مغربی ملکوں کے ماہرین نفسیات کے لئے زبردست چیلنج بن گئے ہیں۔ دل کے امراض بڑھنے کا ایک خاص سبب موجودہ زمانے کا بڑھتا ہوا اسٹریس پایا گیا۔ اس سے دماغی امراض اور کینسر بھی ہوسکتے ہیں۔ اسٹریس سے متعلق امراض کے علاج و معالجہ کا بار امریکی اقتصادیات پر سو بلین ڈالر سالانہ پڑتا ہے۔ صرف Executives کے علاج پر بیس بلین ڈالر سالانہ کے مصارف ہوتے ہیں۔ پروفیسر سرٹوریس (Sartorius) کا کہنا ہے کہ Urbanisation اور Industrialisation کی وجہ سے سب سے زیادہ مہلک اسٹریس کے مرض پیدا ہوتے ہیں۔

خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات بیمار معاشرہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مشاہدہ میں یہ دیکھنے میں آرہا ہے اور اعداد و شمار سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ جو ممالک جتنے زیادہ خوشحال ہیں وہاں خودکشی کی شرح بھی اسی اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی مادیت، ذہنی خلفشار، فرسٹریشن، اعصابی تناؤ اور تنہائی کا احساس دور کرنے کے لئے لوگ شراب و منشیات کا سہارا لیتے ہیں اور جب ان کے عادی ہوجاتے ہیں تو یہی چیزیں ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوتی ہیں اور اقدام خودکشی پر آمادہ کرتی ہیں۔ کئی یورپی ملکوں میں نوجوانوں میں خودکشی موت کا دوسرا یا تیسرا سبب بن گئی ہے۔ اسکنڈی نیوی ممالک، امریکا اور جرمنی جو دُنیا کے امیر ترین ملک شمار کئے جاتے ہیں وہاں خودکشی کی شرح بھی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ The Greater The Affluence The Higher The Suicide Rate مہلک ہیلتھ ریسرچ فنڈ (لندن) نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ بیشتر خودکشیاں معاشرتی عدم استحکام Social Instability کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں اور سویڈن، ڈنمارک و سوئزرلینڈ میں مرنے کی خواہش زیادہ قوی Death Wish Is Stronger ہے اسی لئے وہاں خودکشی کی شرح بھی بڑھی ہوئی ہے، اس کے برعکس اسپین، پرتگال اور آئرلینڈ جو نسبتاً کم خوشحال ہیں وہاں خودکشی کی شرح بھی کم ہے۔ جرمنی میں زندگی سے نفرت نے وبائی شکل اختیار کرلی ہے اور اسی لئے اقدام خودکشی کے واقعات بڑھ رہے ہیں اور کثرت مے نوشی اور ڈرگ ابیوز اس کی نشانی ہیں Good Samaritans کی ٹیلیفون سروسز کو متعدد ایسے افراد سے کال ملتی رہتی ہیں جو ڈپریشن یا کہنہ بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یورپ کے مغربی ملکوں میں 35 سال سے کم عمر کے لوگوں میں خودکشی کا جنون

(Suicide Mania) بڑھ رہا ہے۔

عالمی ادارہ صحت نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ "دُنیا میں اوسطاً ہر روز ایک ہزار سے زیادہ افراد خودکشی کرتے ہیں ویسے پانچ لاکھ افراد کا اپنے ہاتھوں جان لینے کا مسئلہ دراصل اس بڑے مسئلہ کا بہت معمولی حصہ ہے۔ کیونکہ صرف اقدام خودکشی کرنے والوں کی تعداد اس کی آٹھ گنی ہوتی ہے۔ خودکشی کے اصل اعداد ہر ملک سے Under Reported ہوتے ہیں پھر بھی جو اعداد مستند رپورٹوں سے ملے ان کی بنیاد پر خودکشی کی شرح فی لاکھ آبادی پر سب سے زیادہ ہنگری میں پائی گئی۔ دُنیا کے کچھ دوسرے ملکوں میں خودکشی کی شرح یہ رہی:

ملک	خودکشی کی شرح فی لاکھ آبادی	ملک	خودکشی کی شرح فی لاکھ آبادی
ہنگری	40	ڈنمارک	24.2
آسٹریلیا	30	سویڈن	21.7
فن لینڈ	29	امریکا	18.0
مغربی جرمنی	33.9	برطانیہ	15.1
مشرقی جرمنی	28.4	کناڈا	18.5
جاپان	25.4		

برٹانیکا بک آف دی ایر ۱۹۷۵ء کے ایک مقالہ میں لکھا گیا کہ "خودکشی اب بھی امریکا میں صحت عامہ کا ایک بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے جہاں ہر سال پچیس ہزار افراد خود اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لیتے ہیں اور نوجوانوں میں یہ موت کا چوتھا سبب بن گیا ہے۔ اقدام خودکشی کے واقعات ہر سال آٹھ لاکھ سے اوپر ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں خودکشیاں دس سال قبل کے مقابلہ میں دو ہزار کم ہوئیں اور اب یہاں خودکشی کی شرح فی لاکھ آبادی پر ۱۲ ہے جبکہ کیلیفورنیا میں ۱۸ اور ہنگری میں ۳۰ ہے"۔

خورشید عالم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں (۱):

(۱) "امریکی معاشرہ۔ جرائم کی آماجگاہ" قومی آواز ۲۱ جنوری ۱۹۹۵ء

''مالی وسائل سے مالا مال اس جنت ارضی میں ہزاروں افراد اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء کے دوران مرنے والوں میں سے 29,760 افراد نے خودکشی کی جبکہ HIV (ایڈز) جراثیم کی موجودگی سے 33,590 افراد کی موت واقع ہوئی۔ 26,570 افراد اپنے ہی بھائی یا باپ کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ۱۹۹۲ء کے دوران 5,546 افراد کاروں کے نیچے آ کر ہلاک ہو گئے۔ مرنے والوں کے خون کے لیباریٹری ٹسٹ سے معلوم ہوا کہ کم وبیش ایک تہائی افراد شراب پی کر سڑکوں پر ٹہل رہے تھے اور موت کا نوالہ بن گئے۔''

امریکا میں ٹین ایج لڑکوں و لڑکیوں میں خودکشی کی شرح برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ کانگریشنل کمیٹی کو بتایا گیا کہ اس سال (۱۹۸۶ء) ڈھائی سے پانچ لاکھ تک نوجوان خودکشی کا اقدام کریں گے اور چھ ہزار کامیاب بھی ہو جائیں گے۔ ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے نوجوانوں میں یہ موت کا تیسرا سبب ہو گیا ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف منٹل ہیلتھ اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک موثر پروگرام بنا رہا ہے۔ ڈاکٹر ٹریفرٹ (Treffert) نے ایک سروے میں پایا کہ ۲۱ سال سے کم عمر کے 30 نوجوان ہر روز خودکشی کرتے ہیں۔ خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات کا اہم سبب بڑھتے ہوئے دماغی امراض اور نوجوانوں میں پھیلا ہوا عدم اطمینان ہے جو معاشرہ کے کھوکھلا پن کی نشاندہی کرتا ہے۔

"Increasing Hollowness and Sense Lessness of Life of the Society" بیشتر تحقیقی جائزوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خودکشی اور اقدام خودکشی کرنے والوں کی بڑی تعداد شراب و منشیات کا استعمال کرنے والوں کی ہوتی ہے یا پھر ایسے نوجوانوں کی جو شکستہ گھرانوں (Broken Homes) کے ہوتے ہیں اور عرصہ سے دماغی امراض ڈپریشن وغیرہ میں مبتلا رہے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے معاشرہ سے ایڈجسٹ نہیں کر پاتے۔ لڑکیوں میں بڑی تعداد نہ چاہے جانے والے حمل رکھنے والیوں کی ہوتی ہے یا وہ جو قریبی رشتہ داروں کی ہوس کا شکار بنی ہوں۔

ڈنمارک میں خودکشی کی شرح تمام مغربی یورپ کے ملکوں سے بڑھی ہوئی ہے یہاں ہر سال جتنے لوگ کار کے حادثات میں ہلاک ہوتے ہیں اس سے دگنے خودکشی کر کے مرجاتے ہیں۔ جو عورتیں کیریر میں داخل ہوتی ہیں ان میں خودکشی کی شرح بڑھ رہی ہے اور عام عورتوں کے مقابلہ میں یہ دس گنی زیادہ ہے۔ باہر کام کرنے سے عورتوں کو جس اسٹریس

کے حالات سے گذرنا پڑتا ہے وہ ان کے اعصاب پر تناؤ ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ خودکشی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

گذشتہ تیس سال کے عرصہ میں **سویڈن** کے نوجوانوں میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے اور ۱۵ سے ۱۹ سال کی لڑکیوں میں یہ تعداد تگنی ہو گئی ہے۔ سویڈن کی لیڈی ڈاکٹروں میں خودکشی کے واقعات عام عورتوں کے مقابلہ میں چھ گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ پانچ سے پندرہ سال کی درمیانی عمر میں خودکشی کرنے والوں میں چھٹواں مقام پولینڈ، ہنگری، ذیکوسلواکیا، چلی اور تائیوان کے بعد جرمنی کا ہے۔ فیڈرل ری پبلک آف جرمنی میں ۱۳ ہزار خودکشیاں ہر سال ہوتی ہیں۔ بیماریاں لوآفیر، اور نوجوانوں میں نشہ آور ادویات کا بڑھتا ہوا استعمال اس کے اہم سبب بتائے گئے۔

سینٹرل منٹل انسٹی ٹیوٹ (جرمنی) کا کہنا ہے کہ ۱۵ سے ۱۹ سال کے نوجوانوں میں خودکشی کی شرح بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۳ء کے درمیان اقدام خودکشی کی شرح میں لڑکیوں میں 340 فیصدی اور لڑکیوں میں 140 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ (۱)

فرانس میں ۱۹۸۵ء میں ۱۲ ہزار خودکشیاں ہوئیں اور ایک لاکھ ۲۰ ہزار اقدام خودکشی کئے گئے۔ معاشرتی بحران، بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور خاندانی انتشار اس کے اہم سبب بتائے گئے۔ وہاں ایک کتاب Suicide Users Instructions شائع ہوئی جس میں درد کے احساس کے بغیر خودکشی کرنے کی متعدد تدابیر بتائیں گئیں اس کتاب کی ایک لاکھ ۲۰ ہزار کاپیاں اُسی وقت فروخت ہوگئیں۔ فرانس میں خودکشیاں برابر بڑھتی جارہی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۸۷ء میں حکومت کو ایک قانون وضع کرنا پڑا کہ جو کوئی خودکشی کی ترغیب دے گا اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا اور سزا بھی دی جائے گی۔

برطانیہ میں ہر سال دو لاکھ سے زیادہ اشخاص اقدام خودکشی کرتے ہیں اور چار ہزار سے زیادہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے طلباء میں خودکشیاں عام آبادی کے مقابلہ میں تین سے پانچ گنا زیادہ ہوتی ہیں۔

جاپان میں خودکشی کی شرح میں دوسری جنگ کے بعد تیزی سے اضافہ ہو رہا

---

(۱) پانیر ۲۳ فروری ۱۹۸۶ء

ہے۔ جنگ عظیم ثانی کے بعد جاپان میں خودکشیوں کا اوسط بیس ہزار سالانہ رہتا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں یہ بڑھ کر 25,202 اور ۱۹۸۶ء میں 25,524 تک پہنچ گیا جس میں 9,027 عورتیں تھیں۔ وزارت صحت نے بتایا کہ ۵۰ سال کی عمر والوں میں ۵۰ فیصدی، 40 سال کی عمر والوں میں ۳۳ فیصدی اور ۶۰ سال سے زیادہ عمر والوں میں ۳۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اسکولی طلباء میں کیے گئے ایک جائزے میں بتایا گیا کہ بڑی تعداد میں طلباء نے اپنی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں خودکشی کا ارادہ کیا۔ ہائی اسکول کے طلباء میں 30.2 فیصدی اور ابتدائی کلاس کے طلباء میں 23.3 فیصدی اپنے ہاتھوں اپنی جان لینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ کہنہ امراض، کثرت مینوشی، اقتصادی پریشانیاں اور خانگی اُلجھنیں اہم اسباب بتائے گئے۔

امراض جنسی اور ایڈز

عالمی ادارۂ صحت کی اور دوسری طبّی تحقیقاتی رپورٹوں سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ دُنیا کے تمام ملکوں میں جنسی امراض تشویشناک حد تک پھیلتے جا رہے ہیں۔ امراض خبیثہ کی کوئی بارہ قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم مباشرت ناجائز سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ گذشتہ صفحات میں تفصیل سے دکھایا جا چکا ہے کہ آزادانہ جنسی تعلقات، تلذذ بالمثل اور پراسٹی ٹیوشن کتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ جنسی امراض کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سب سے زیادہ یہ امراض نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں پھیل رہے ہیں اور یہ رجحان صرف امریکا اور یورپ کے ملکوں میں ہی نہیں بلکہ ترقی پذیر ملکوں میں بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ کنڈوم اور دوسری احتیاطی تدابیر کے باوجود ان جنسی بیماریوں کے بڑھنے کی رفتار انتہائی تیز ہے اور نوجوانوں میں جنسی بیماریوں کا بڑھتا ہوا یہ سیلاب صحت کا بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔

میسوچٹس یونیورسٹی (امریکا) کے دو محققین Brenda Baker اور George Armelagos نے اپنی نئی تحقیق میں یہ بتایا کہ اب سے پانچ سو سال قبل کولمبس نے امریکا سے واپسی پر آتشک کے مرض کو یورپ میں پھیلایا۔ محققین میں اس بارے میں عرصے سے اختلاف رائے تھا کہ آیا یہ مرض ۱۴۹۳ء میں کولمبس کی واپسی سفر امریکا کے بعد یورپ میں پھیلا یا یہ یورپ میں کرانک انفکشن کی طرح پہلے سے ہی پھیلا ہوا تھا جسے ڈاکٹر صاحبان

Leprosy سمجھتے رہے۔ ان محققین کا کہنا ہے کہ یہ مرض ایک بیکٹیریم Treponema Palledium کے ذریعہ پھیلتا ہے جس کی ابتدائی دُنیا میں ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ مرض امریکی براعظم میں پانچ ہزار سال قبل Endemic Non-Viral انفکشن کی طرح پھیلا ہوا تھا جو کہ Casual Non Sexual Contact سے پھیل جاتا تھا۔ کولمبس کے ساتھ جانے والے ملاح جب یورپ واپس آئے تو اس مرض کو وہاں پھیلا دیا۔ کولمبس کی اسپین میں واپسی کے تین چار سال بعد ہی یورپ کے شہری ماحول میں اس مرض نے پھیل کر Sexually Transmited Disease کی شکل اختیار کر لی۔

عالمی ادارۂ صحت کا کہنا ہے کہ بعض ملکوں میں آتشک کی بیماری ایک بار پھر اُسی نوبت کو پہنچ گئی ہے جس نوبت کو دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے وقت تھی اُس وقت یورپ کے ملکوں میں آتشک کی بیماری وبائی شکل میں پھیل گئی تھی۔ پینسلین کی دریافت اور استعمال کے بعد اس مرض میں کچھ کمی ہوئی لیکن اس کے بعد نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے یہ امراض پھر تیزی سے بڑھنے لگے۔ ڈاکٹر ارنسٹ کلیکسٹن (Ernest Claxton) لکھتے ہیں کہ ''آزادانہ جنسی تعلقات آج برطانیہ کا قومی مسئلہ بن گئے ہیں اور اس کا اچھا خاصا اندازہ امراض جنسی کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ وی۔ڈی کلنکس میں مریضوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس نئے نظام اخلاق کا اثر قوم کی صحت پر یہ ہوا کہ کثرت سے پھیلے ہوئے ناجائز تعلقات کی وجہ سے امراض جنسی وبائی شکل میں نمودار ہو گئے ہیں''۔

ڈاکٹر ڈسل سوگرین نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

''شادی سے قبل جنسی ملاپ سے جو جسمانی خطرے ہیں اُنہیں نظر میں رکھنا لازمی ہے۔ حمل کا اندیشہ تو ہمیشہ ہی لگا رہے گا۔ جنسی بیماریوں کا امکان بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔ کثرت سے ملکوں میں آتشک و سوزاک دونوں جنسی ملاپ سے پیدا ہو جانے والی بیماریاں روز افزوں ہیں''۔

ڈاکٹر ڈنکن کیٹرال Dr. Duncan Catterall کا کہنا ہے ''امراض جنسی آزاد جنسی تعلقات (Casual Sex) سے پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے پوری طرح بچا جا سکتا ہے''۔

"STD Are Most Likely To Be Caught By Casual Sex And So Can Be Completely Avoided"

منی ٹوبا مرکز کے ڈائریکٹر Dr. Emmanel Snell نے بتایا کہ ''جنسی امراض شمالی امریکا نیز تمام مغربی ملکوں میں قابو سے باہر ہو چکے ہیں''۔ ڈاکٹر ولیم براؤن کا کہنا ہے کہ سوزاک کے کیسس اب حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں اور یہ مرض ہر پیشہ اور ہر آمدنی والوں کے طبقہ میں بڑھ رہا ہے۔ آزاد جنسی اختلاط (Promiscuity) اس مرض کے پھیلنے کا سب سے بڑا واحد سبب ہے''۔ ڈاکٹر کوہن (Dr. Cohen) کا کہنا ہے کہ ''عورتوں میں پلس کا استعمال سوزاک کے مرض کا وبائی صورت میں پھیلنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔ پلس کے استعمال نے حمل کے اندیشہ کو ختم کردیا ہے جس سے آزادانہ جنسی اختلاط اور جنسی امراض دونوں بڑھ رہے ہیں''۔

جنسی امراض دُنیا کے ملکوں میں

جنسی امراض کا علاج بہت سے لوگ پوشیدہ طریقے سے کرالیتے ہیں اس لئے جو اعدادوشمار رپورٹوں میں ملتے ہیں وہ بسا اوقات کم ہی ہوتے ہیں پھر بھی عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹ (۱۹۹۱ء) میں بتایا گیا کہ دُنیا میں ہر سال پچیس کروڑ (250 Million) افراد جنسی امراض (STD) کے انفکشن میں مبتلا ہوتے ہیں جن میں آتشک، سوزاک، Genital Herpes اور ایڈز شامل ہیں اور ان امراض میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ اسی ادارہ نے اپنی دوسری رپورٹ (۱۹۹۵ء) میں یہ اعتراف کیا کہ گذشتہ رپورٹ میں 250 ملین کا جو تخمینہ لگایا گیا تھا وہ کافی کم تھا اب راک فیلر فاؤنڈیشن کے اشتراک سے جو تازہ ترین جائزہ لیا گیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگلے سال (یعنی ۱۹۹۶ء میں) دُنیا میں جنسی امراض کے 33 کروڑ 30 لاکھ Curable STD کے نئے کیسس ہوں گے جس میں

آتشک کے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ	12 Million
سوزاک کے ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ	62 Million
Chlamydia کے ۸ کروڑ ۹۰ لاکھ	89 Million

Trichomonas کے ۱۷ کروڑ	170 Million

کیسس ہوں گے۔ STD`s کے یہی چار امراض ایسے ہیں جن کے بروقت علاج سے فائدہ ہونے کا امکان رہتا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے شہری علاقوں میں ان امراض کے پھیلنے کا خطرہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ صنعتی ملکوں میں آتشک وسوزاک کے کیسس میں کمی واقع ہوئی ہے لیکن دوسرے STD`s تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ امریکا میں ہر ایک ہزار افراد پر Chlamydia انفکشن کے دو نئے کیسس ہر سال ہوتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت نے اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کیا کہ جو اشخاص STD`s میں مبتلا ہوتے ہیں اُن میں HIV وائرس کے پھیلنے کا امکان بھی قوی ہوجاتا ہے جو ایڈز کے مرض کا خاص سبب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس انفکشن کے بڑے سنگین اثرات افراد کی صحت پر پڑتے ہیں کیونکہ یہ بانجھ پن، کم زرخیزی، Stil Birth، قبل ازوقت حمل کا گرنا، اندھاپن، اعضاء میں ٹیڑھا میڑھا پن، پیدا کرنے کینسر اور موت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ امراض نئے پیدا ہونے والے بچوں کو بھی لاحق ہوجاتے ہیں کیونکہ ماں سے ہوکر یہ بچوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔ بہت سے ملکوں میں ان امراض نے وبائی شکل اختیار کرلی ہے اور لوگوں کو کافی فکرمند بنادیا ہے۔ ان امراض میں مبتلا ہونے والوں کی سب سے بڑی تعداد ۲۰ سے ۲۴ سال کی عمر والوں کی اور اس کے بعد ۲۵ سے ۲۹ سال والوں کی ہوتی ہے (۱)۔

بین الاقوامی ماہرین صحت کی کوپن ہیگن سے شائع ہونے والی رپورٹ (1997) میں بتایا گیا کہ دُنیا میں ہر سال سولہ کروڑ تیس لاکھ (163 Million) افراد جنسی امراض جیسے آتشک، سوزاک اور Chlamydia میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ امراض عورتوں کے لئے زبردست خطرہ پیدا کردیتے ہیں کیونکہ ان کے Reproductive Tract (RTIs) میں یہ متعدد انفکشن پھیلادیتے ہیں اور انہیں بانجھ بنادیتے ہیں۔

دُنیا میں ہر سال دس لاکھ سے زیادہ عورتیں اور بچے RTIs سے مرجاتے ہیں۔ یہ انفکشن نوزائدہ بچوں اور ایسی عورتوں کو لگ جاتے ہیں جو بچہ پیدا کرنے کی عمر میں ہوتی ہیں۔ RTIs سے ذہنی کلفتیں بھی ہوتی ہیں کیونکہ یہ زرخیزی کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں اور بڑی تعداد میں عورتیں بچے پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اگر دوران حمل RTI انفکشن لگ

(۱) Times of India 27.8.95/2.1.91

جاتا ہے تو Still Birth ہوسکتی ہے یا نوزائدہ بچے کی موت واقع ہوسکتی ہے۔ غیر محفوظ ولادت، جنسی اختلاط اور اسقاطِ حمل بھی اس انفکشن کے پھیلنے کے اہم اسباب ہیں۔ ایچ۔ آئی۔ وی انفکشن اور ایڈز بھی اس سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ STDs اگر مناسب علاج کے بغیر چھوڑ دیئے جاتے ہیں تو RTIs پھیلنے کے امکانات دس گنا زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔

افریقہ میں پندرہ بیس فیصدی حاملہ عورتوں کو STDs ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے حمل گر جانے کے کیسس بڑھ جاتے ہیں۔ Still Births ہوتی ہیں اور معذور واپاہج بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں جنسی امراض ترقی پذیر ملکوں میں زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ یہاں کے لوگ احتیاطی تدابیر بہت کم اختیار کرتے ہیں لہٰذا آتشک وسوزاک کے کیسس آبادی کے دس سے بیس فیصدی لوگوں کو ہوجاتے ہیں۔

چین میں بھی وی۔ڈی کیسس میں کافی اضافہ ہوا ہے بلکہ وی ڈی کے بیس Strains یہاں ہونے لگے ہیں جبکہ کچھ عرصہ قبل صرف چار Strains ہوتے تھے۔ بردہ فروشی کے کاروبار میں لگی ہوئی عورتیں حفظانِ صحت کے اصولوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے پیسہ کی لالچ میں اس میں مصروف رہتی ہیں اور ان امراض میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔

ہندوستان کے ڈائریکٹر جنرل آف ہیلتھ سروسز نے ماہرین امراض جنسی کی ایک کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں جنسی امراض بہت تیزی سے پھیلتے جارہے ہیں اور ہر بیس افراد میں ایک فرد اس میں مبتلا ہورہا ہے جس سے Morbidity اور Mortality دونوں میں اضافہ ہورہا ہے۔ بچوں کے ساتھ بدفعلی کے بڑھتے ہوئے واقعات نے اُن میں بھی STDs پھیلا دیا ہے۔ ڈاکٹر آر۔کے۔ پنڈھی (ڈپارٹمنٹ آف ڈرمیالوجی AIIMS دہلی) کا کہنا ہے کہ اب سے دس سال قبل مشکل سے کوئی کیس بچوں میں STD کا آتا تھا لیکن ادھر جیسے جیسے بچوں سے بدفعلی کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے بچے بھی ان امراض میں مبتلا ہونے لگے ہیں۔ آتشک وسوزاک کے علاوہ اُن میں وائرل انفکشن Genital Warts اور Herpes کے کیسس بھی ہونے لگے ہیں۔ ڈاکٹر کے۔ جی۔ سنگھ کا کہنا ہے کہ STD کا انفکشن وائرل یا بیکٹیریل ہوتا ہے لہٰذا STD میں اضافہ ایچ۔ آئی۔ وی انفکشن کے خطرات کو اور بڑھا دیتا ہے۔ آتشک کا انفکشن ایچ آئی وی انفکشن کے امکانات کو نو گنا اور سوزاک کا پانچ گنا بڑھا دیتا ہے۔

اسٹیٹ آف ورلڈ پاپولیشن رپورٹ میں بتایا گیا کہ نوجوانوں میں بڑھتا ہوا جنسی اختلاط ایڈز جیسے امراض کے اضافہ کا سبب ہورہا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت نے ایک مطالعہ میں یہ پایا کہ اس وقت دُنیا میں ایچ آئی وی انفکشن میں مبتلا ہونے والوں میں تقریباً پچاس فیصدی نوجوان ہیں جن کی عمر ۱۵-۲۴ سال کے درمیان ہے۔ اسی مطالعہ کی بنیاد پر عالمی ادارۂ صحت نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر نوجوانوں کو جنسی تعلیم دی جائے تو جنسی اختلاط کے نتیجہ میں ہونے والے بہت سے خطرات سے انہیں بچایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں نوجوانوں کے سامنے دو چوائسس ہیں:

(۱) شادی ہونے تک جنسی اختلاط سے کامل اجتناب برتیں۔
(۲) جو نوجوان جنسی اختلاط میں مبتلا ہیں انہیں کنٹرا سپٹیوس کے استعمال پر آمادہ کیا جائے تا کہ وہ مباشرت کے وقت محفوظ رہیں۔ لیکن ان جنسی امراض کے پھیلنے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں یہ اُمور مانع ہوتے ہیں:

(۱) انفکشن کا آسانی سے پھیل جانا۔
(۲) جنسی برتاؤ میں تبدیلی کا نہ آنا۔
(۳) ویکسین (Vaccines) کی کمی۔
(۴) وسائل کی کمی۔
(۵) سفر اور مائیگریشن میں اضافہ۔
(۶) ڈرگس اور الکحل کا ناروا استعمال۔
(۷) ایسے Strains کا پیدا ہوجانا جو اینٹی بائکس کا علاج اکثر قبول نہیں کرتے۔

عالمی ادارۂ صحت نے سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سب سے بڑی رکاوٹ سبب نمبر دو ثابت ہورہا ہے۔ لوگوں کے جنسی برتاؤ میں تبدیلی پیدا کرنا انتہائی دشوار ثابت ہورہا ہے۔ اور اسی لئے یہ مرض وبائی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اور STDs سے ایڈز کے وائرس کے پھیلنے کا خطرہ تین فیصدی بڑھ جاتا ہے۔ امریکا میں ایڈز کے خطرات سے عورتیں اتنی زیادہ خوفزدہ ہوگئی ہیں کہ وہ اب Male Virigns یعنی ایسے مردوں کی تلاش میں رہتی ہیں جنہوں نے کسی سے صحبت نہ کی ہوتا کہ وہ ایڈز اور دیگر جنسی امراض سے بچی رہیں۔

HIV ایڈز گلوبل وبائی مرض

انسان کی جنسی بے راہ روی سے پیدا ہونے والا مہلک ترین اور لاعلاج عالمی وبائی مرض ایڈز ساری دُنیا میں تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اور بیس سال سے کم عرصہ میں ہی HIV انفکشن نے دُنیا کے ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ (30.6 Million) اشخاص کو متاثر کر دیا ہے اور اگلے بیس سال میں سات کروڑ (70 Million) اشخاص اس مرض سے موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ ایڈز کی سب سے پہلے پہچان یو۔ ایس۔ اے میں ۱۹۸۱ء میں ہوئی اور اس کے ٹرانس مشن کا ذریعہ جنسی اتصال معلوم ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ Contaminated Blood Products بھی اس انفکشن کے پھیلانے کا ایک اہم سبب ہے۔ ایک سال کے اندر ہی کافی کیس ہوگئے اور تب یہ واضح ہوگیا کہ ایک نیا مرض ایڈز (Aids) پیدا ہوگیا ہے۔

Dr. Luc Montagnier (Pasteur انسٹی ٹیوٹ پیرس) نے ۱۹۸۳ء میں اس کی دریافت کی اور اس کا نام LAV رکھا بعد میں اسے HIV کہا جانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وائرس بندروں Apes میں صدیوں سے رہا ہے اور اب یہ آدمیوں تک پہنچا ہے۔ اس کی ابتدا شاید افریقہ میں ہوئی اور Surface وایر ٹرانسپورٹ کی وجہ سے یہ دُنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گیا اور اب ہر ملک میں اس انفکشن میں مبتلا ہونے والوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ سب سہارا افریقہ دُنیا کا وہ علاقہ ہے جہاں ایڈز کے مرض نے زبردست وبائی شکل اختیار کر رکھی ہے اور وہاں یہ مرض سب سے بڑا Killer ثابت ہو رہا ہے۔ اضافہ کی شرح سب سے زیادہ ایشیا میں رہی جہاں تین سال میں 444 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ امریکیوں میں ریاستہائے متحدہ میں سب سے زیادہ کیسس ایڈز کے ہیں۔ یورپ میں (Gay) کمیونٹی میں سب سے زیادہ ایڈز کے کیسس ہوئے ہیں اور ہندوستان میں سب سے زیادہ HIV انفکشن کے کیسس ہیں!

ایڈز کا مرض اتنا سنگین کیوں؟

محققین کا کہنا ہے کہ ایڈز کا مرض اتنا سنگین ثابت ہو رہا ہے جتنا کہ اب تک کوئی دوسرا مرض نہ تھا۔ یہ جسم کے Immunity System کو متاثر کرنے کے علاوہ دماغ اور

Bone Marrow کو بھی متاثر کر دیتا ہے اس سے Meningitis دماغ میں سوجن اور یادداشت میں کمی ہوجاتی ہے اس کے علاوہ دیگر نیورولاجیکل امراض بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔ HIV انفکشن میں مبتلا شخص بہ ظاہر تندرست دکھائی پڑتا ہے لیکن اندر اندر اس کا جسم کھوکھلا ہوتا جاتا ہے اور مرض کو Blow Up ہونے میں پانچ سال تک کا وقت لگ جاتا ہے اور پھر یہ شخص ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ دوسرے جنسی امراض کی طرح اس کا کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ ایڈز کے مشہور معالج و محقق Dr. David Ho کا کہنا ہے کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ایڈز کا کوئی بھی مریض اچھا نہیں ہو سکا ہے۔ حالانکہ علاج کی نئی تدابیر سے کچھ اُمید بڑھی ہے لیکن ابھی منزل بہت دور ہے۔ جو افراد اس وائرس سے متاثر ہوئے ہیں اُن میں نوّے فیصدی غریب ملکوں میں رہتے ہیں جہاں قیمتی Multi Drug Therapies اُن کی دسترس سے باہر ہیں۔ ڈاکٹر پیٹر پائٹ (Peter Piot) کا کہنا ہے کہ HIV انفکشن سے متاثر مریض بڑی تعداد میں ترقی پذیر ملکوں میں رہتے ہیں جہاں اس کے علاج کی سہولتیں بھی بہت کم ہیں اور لوگوں کے اقتصادی حالات بھی اس قابل نہیں کہ وہ اتنے گراں علاج کے متحمل ہو سکیں۔ اس مرض سے نجات کے لئے احتیاطی تدابیر، عوام کے شعور کی بیداری اور ویکسن کی دریافت ہے" موصوف نے بتایا کہ اس وقت ایڈز اور HIV انفکشن کی تحقیقات پر صرف کی جانے والی رقم میں صرف ایک فیصدی ویکسن کی دریافت پر خرچ کیا جا رہا ہے۔

ایڈز کے مرض کے سنگین ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بالعموم یہ مرض ۲۰ سے ۳۰ سال کی عمر میں ہوتا ہے جو عمر کا قیمتی دور ہوتا ہے (Most Productive years of Life) اعلیٰ منصبی فرائض ادا کرنے اور تخلیقی کام کرنے والے اسی عمر کے ہوتے ہیں اور اس مرض میں مبتلا ہو جانے سے اچھے فعال افراد کی کمی واقع ہو جاتی ہے جو ملک کی صنعت و تجارت کے لئے زبردست خسارہ ثابت ہوتا ہے۔ پچھتر 75% فیصدی HIV انفکشن جنسی ملاپ سے پھیلتا ہے جس میں ہوموسکشول اور Bisexual اتصال شامل ہے۔ ۱۲ فیصدی انفکٹڈ خون سے 6.5 فیصدی انفکٹڈ سوئی سے اور 30 سے 50 فیصدی تک ماں سے بچے کو لگ جاتا ہے۔ نشیلی ادویات کے انجکشن، جسم کے مادّے (Fluids) خون، منی اور سلائیوا سے بھی یہ انفکشن پھیل جاتا ہے۔

نوجوانوں کے علاوہ بچے بھی بُری طرح اس انفکشن سے متاثر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ حاملہ عورتیں جو HIV سے متاثر ہو جاتی ہیں ان کے پیدا ہونے والے بچے بھی اس وائرس سے متاثر ہو جاتے ہیں جو ان کی قبل از وقت موت کا سبب بن جاتا ہے۔ افریقہ، تھائی لینڈ اور ہندوستان میں ایسے بچوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ انتہائی غربت کی وجہ سے یہاں ایسے والدین نہ خود اپنا علاج کروا پاتے ہیں اور نہ ایسے بچوں کا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یتیم ہو جانے کے بعد ان بچوں کو انتہائی عُسرت کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ اب تک دُنیا میں ایک کروڑ ۳۲ لاکھ بچے یتیم ہو چکے ہیں جن کے ماں باپ ایڈز سے وفات پا گئے ہیں۔ ایسے یتیم بچے نہ اپنی تعلیم جاری رکھ پاتے ہیں اور نہ کسی ملازمت میں لگ پاتے ہیں، انہیں زبردست نفسیاتی وجذباتی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر وہ زندہ رہ بھی جاتے ہیں تب بھی انتہائی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اپنے والدین کی غلطیوں کا خمیازہ ساری عمر انہیں بھگتنا پڑتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے تخمینہ لگایا ہے کہ ۱۹۹۰ سے ۲۰۰۰ کے دس سالوں میں ۵۰ سے ۱۰۰ لاکھ بچے اس انفکشن سے متاثر ہوئے خواہ پیدائش کے وقت یا ماں کا دودھ پینے سے۔ ایسے بچوں کی اکثریت سب سہارا افریقہ میں ہے۔ اسی مدت میں وہاں پندرہ سے تیس لاکھ عورتیں ایڈز سے مر جائیں گی اور یتیم بچوں کی بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑ جائیں گی۔

HIV انفکشن ایڈز کی وسعت

ورلڈ ایڈز ڈے (یکم دسمبر ۱۹۹۷ء) کے موقع پر بتایا گیا کہ اس وقت ساری دُنیا میں تقریباً تین کروڑ ساٹھ لاکھ (30.6 Million) افراد HIV انفکشن ایڈز میں مبتلا ہیں جس میں ۵۰ لاکھ ۸۰ ہزار اشخاص صرف اس سال اس میں مبتلا ہوئے۔ دُنیا کے تمام ملکوں میں ہر روز سولہ ہزار افراد اس انفکشن سے متاثر ہو رہے ہیں۔ جس میں نوے فیصدی ترقی پذیر غریب ملکوں کے باشندے ہوتے ہیں۔ اس انفکشن سے متاثر ہونے والے بچوں کی تعداد ۸ لاکھ ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ آخر ۱۹۹۶ء تک ۶۴ لاکھ افراد ایڈز کے مرض سے مر چکے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک اس انفکشن ایڈز کے مرض سے مرنے والوں کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ جائے گی!

پیرس سے شائع ہونے والی اقوامِ متحدہ کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ دُنیا بھر میں ۳ کروڑ (30 Million) اشخاص اس وائرس سے متاثر ہیں اور 6,000 نئے مریض ہر روز اس مرض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ اس وائرس سے انفکٹڈ مریض ہیں۔ ہر ایک سو Sexually Active Adult میں ایک فرد اس انفکشن سے متاثر ہے اور لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ دس میں صرف ایک شخص یہ جانتا ہے کہ وہ اس وائرس سے متاثر ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۹۹۶ء میں ۵۳ لاکھ اور ۱۹۹۷ء میں ۵۸ لاکھ اشخاص اس انفکشن میں مبتلا ہوئے اور ۱۹۹۷ء میں ۲۳ لاکھ ایڈز کے مریض موت کے منہ میں چلے گئے جن میں نصف عورتیں تھیں اور 4,60,000 پندرہ سال سے کم عمر کے بچے۔

اسی رپورٹ میں سب سہارا افریقہ کی بڑی بھیانک تصویر پیش کی گئی ہے جہاں ۱۵-۴۹ سال کی عمر کے 7.4 فیصدی افراد اس انفکشن میں مبتلا ہیں۔ بوتسوانا میں اس انفکشن کی شرح پانچ سال میں دگنی ہوگئی اور یہ 25 سے 30 فیصدی کے درمیان ہے۔ زمبابوے اور زمبیا میں 25 فیصدی سے زیادہ بچے فوت ہو رہے ہیں اور اس کا سبب ایڈز ہے۔ ایڈز کی فرنٹ لائن اب افریقہ ہے نہ کہ امریکا یا یورپ۔

افریقہ کے بعد براعظم ایشیا کو ایڈز کا زبردست خطرہ لاحق ہے۔ ہندوستان، پاکستان، برما اور تھائی لینڈ میں یہ مرض سب سے زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ ایشیا اور Pacific کے علاقوں میں دُنیا کے ۲۵ فیصدی ایڈز کے مریض رہتے ہیں۔ حالانکہ تھائی لینڈ میں ایڈز کی روک تھام کا سب سے بہتر تربیتی پروگرام چل رہا ہے لیکن مرض برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ صرف دارالسلطنت بینگ کاک میں ہی دس ہزار ایڈز کے مریض ہیں 64 فیصدی افراد کو یہ مرض جنسی مباشرت سے اور 18 فیصدی کو سوئیوں سے لگ گیا ہے۔ ۳۰ سے ۳۴ سال کی عمر کے لوگ سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ حکومت کی طرف سے کنڈوم کے استعمال کی زبردست تشہیر کی جا رہی اور عالمی ادارہ صحت نے AIDS & the Family کا سلوگن دیا تا کہ فیملی کے تحفظ کے پیش نظر لوگ اس غلط راہ سے باز رہیں لیکن خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے۔ پرائی ٹیوشن اور نشلی ادویات کے استعمال سے یہ مرض اس بُری حد تک پھیل گیا ہے کہ کئی صنعتوں کے لئے کام کرنے والے نہیں مل پا رہے ہیں اور متعدد کارخانے ٹھپ پڑ گئے ہیں۔

انڈونیشیا کے بارے میں بتایا گیا کہ اگر احتیاطی تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو اس صدی کے اختتام تک چار کروڑ HIV ایڈز کے مریض ہو جائیں گے۔ یہاں امریکا اور یورپ سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ایڈز کے کیسس ہو رہے ہیں اور ملک میں عام شعور کی کمی اس مہلک مرض کو اور بڑھاوا دے رہا ہے۔

پاکستان میں اس انفکشن کی جو اسکریننگ کی گئی اس کے مطابق تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ملک میں ۸۰ ہزار افراد HIV انفکشن سے متاثر ہیں اور 4,600 ایڈز کے مریض ہیں لیکن عالمی ادارۂ صحت کے تخمینہ کے بموجب ملک میں پچاس ہزار مریض ایڈز میں مبتلا ہیں۔ پنجاب میں ڈرگ نوشی اور قحبہ گری زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اس لئے وہیں ایڈز کے مریض بھی زیادہ ہیں۔ اس مرض کا مقابلہ کرنے کے لئے 25 ملین ڈالر کی امداد ورلڈ بینک سے ملی ہے جو احتیاطی تدابیر پر صرف کی جائے گی۔

بنگلا دیش میں بیس ہزار اشخاص HIV سے انفکٹڈ ہیں۔ امیگرنٹ ورکرس، بیسوائیں اور ٹرک ڈرائیورس اس مرض کو پھیلانے کا ذریعہ ہیں۔

چین کے متعلق ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ ملک میں ایک لاکھ پچاس ہزار HIV کے Positive کیسس ہیں اور ۲۰۱۰ء تک ایک کروڑ افراد کے اس مرض میں مبتلا ہونے کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ یہاں ایڈز کے پہلے کیس کا پتہ ۱۹۸۵ء میں لگا تھا اور وزارت صحت کے احتیاطی پروگرام اور تعلیم کے باوجود مرض میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ Hotline پر معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

جاپان میں ایڈز کے مرض میں مبتلا ہونے والوں کے صحیح اعداد و شمار کا علم اس لئے نہیں ہو پا رہا ہے کہ یہاں ایسے معاملات میں کافی اخفا برتا جاتا ہے پھر بھی یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہاں سیاحوں، ہوموسکشولس اور بیسواؤں کی وجہ سے ایڈز کے مریض بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ شرمندگی کی وجہ سے لوگ اپنے خاندان والوں کو بھی نہیں بتاتے۔

ہندوستان: انڈین ہیلتھ آرگنائزیشن نے بتایا کہ دُنیا میں HIV انفکشن کے سب سے زیادہ کیسس یہاں ہیں اور اس انفکشن سے پیدا ہونے والا مرض ایڈز کے ایشیا میں سب سے زیادہ کیسس بھی ہمارے ہی ملک میں ہیں۔ ملک کی ۵۰ فیصدی کمرشل سیکس

ورکرس اور ۴۰ لاکھ افراد HIV سے متاثر ہیں جو ایڈز پیدا کر سکتا ہے اور ۴۰ ہزار Full Blown ایڈز کے کیسس ہیں۔ ملک میں ۱۸-۲۴ سال کے نوجوان بڑی تعداد میں ایڈز کے مرض کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے شمالی مشرقی علاقوں میں HIV انفکشن کے سب سے زیادہ کیسس ہیں۔ ڈرگ نوشی، سیکس انڈسٹری کا فروغ، علاج و معالجہ کی ناکافی سہولتیں اور اخلاقی و سماجی قدروں میں انحطاط اس اضافہ کا اہم سبب ہیں۔

دُنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی عام طور پر ایڈز کا مرض ۲۰ سے ۳۵ سال کی عمر والوں کو ہو جاتا ہے چونکہ HIV انفکشن کو بڑھ کر پھیلنے میں پانچ سے لے کر دس سال تک کی مدت لگ جاتی ہے اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کم عمر ہی میں لوگ اس انفکشن سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ انڈین ایکسپریس کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ مدراس کے کئی اسکولوں میں لڑکے HIV انفکشن میں مبتلا پائے گئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لڑکے جنسی اعتبار سے سرگرم عمل تھے۔ اسی طرح سنٹر فار کمیونٹی میڈیسن (AIIMS دہلی) کے ایک جائزہ سے یہ امر منکشف ہوا کہ دہلی کے اسکولوں کے گیارہویں اور بارہویں جماعت کے طلباء بھی جنسی طور پر سرگرم عمل رہتے ہیں اور کوئی بھی لڑکا کنٹراسپٹو تدابیر یا جنسی بیماریوں سے واقف نہ تھا اور نہ کوئی لڑکی یہ جانتی تھی کہ استقرار حمل کے کتنے دور رس نتائج خود اس کی صحت پر، اس کے خاندان کے وقار پر اور معاشرہ پر پڑتے ہیں۔ جائزے میں یہ بھی بتایا گیا کہ عام طور سے یہ نوجوان لڑکے و لڑکیاں اپنی جسمانی ساخت سے بھی حیرت انگیز حد تک ناواقف تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ جنسی اختلاط کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں (۱)۔

سدیپ تالکدار اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں (۲) کہ ''ہندوستان میں Hetrosexual Promiscuity اس مرض کے پھیلنے کا سب سے بڑا سبب ہے عورتیں اپنی جسمانی ساخت کی وجہ سے مردوں کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ امکانات اس انفکشن سے متاثر ہونے کے رکھتی ہیں اور ۲۵ سے ۴۴ سال کی عمر کی عورتوں کے لئے یہ چوتھا Leading Killer ثابت ہو رہا ہے۔ اور عورتوں کو بہ نسبت مردوں کے اس انفکشن کے

(1) A family guide to HIV AIDS in India : C. Wing & S. Choudhry p. 4

(2) AIDS Virus (remains a Major Killer) TOI 23.9.95

لگنے کے خطرات بیس گنا زائد ہوتے ہیں۔ اونچی آمدنی رکھنے والے لوگ جو Promiscuous طرز زندگی اختیار کرتے ہیں، بیسوائیں اور ٹرک ڈرائیورس خاص طور پر بڑی تعداد میں اس انفکشن سے متاثر ہورہے ہیں۔ رابرٹ فریڈمن Robert Friedman نے ممبئی کے ریڈ لائٹ ایریا کا تفصیلی سروے کیا اور اپنے مشاہدات "The Nation" میں شائع کئے اس میں بتایا کہ اسی ہزار سے زیادہ بیسوائیں صرف بمبئی شہر میں ہیں اور اُن میں ۶۰ فیصدی تک HIV انفکشن سے متاثر ہیں۔ پچاس ہزار ٹیکسی ڈرائیور ہیں جو اپنے گھروں سے دور معاش حاصل کرنے کے لئے یہاں رہ رہے ہیں یہاں کے چکلوں میں جس طرح کمسن لڑکیوں کو اغوا کرکے لایا جاتا ہے اور انہیں اس پیشہ میں مجبور کیا جاتا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے اور جو مافیا گروہ اس دھندے میں سرگرم عمل ہیں انہیں ارباب سیاست کا تحفظ بھی حاصل ہے اور دھندے کا منافع ان کو بھی پہنچایا جاتا ہے۔ بمبئی شہر میں پانچ فیصدی (دو لاکھ پچاس ہزار) ہوموسکشولس ہیں جو ایڈز کے مرض کے لئے ایک Vulnerable گروپ ہے۔

گجرات کے بڑے شہر احمد آباد، برودہ، سورت، جام نگر اور راجکوٹ میں پندرہ ہزار سے زیادہ کال گرلز ہیں، کالجوں کی طالبات اس پیشہ کی کثیر آمدنی کو دیکھ کر شوقیہ کال گرل بن گئی ہیں اور بہ ظاہر ٹھاٹھ کی زندگی گزارنے لگی ہیں لیکن اندر اندر یہ انفکشن اُن میں سرایت کرجاتا ہے اور آگے چل کر بڑی اندوہناک تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی زندگی جہنم (Living Hell) کا نمونہ بن جاتی ہے۔(۱)

وزیر صحت نے راجیہ سبھا کو بتایا کہ نیشنل ایڈس کنٹرول آرگنائزیشن (NACO) نے ۳۰ رجون ۱۹۹۷ء تک 4,725 ایڈز کے مریض بتائے اور 65,200 HIV Positive کے کیسس رپورٹ ہوچکے ہیں۔ ۱۹۹۶-۹۷ء کے مرکزی بجٹ میں صحت کے پروگراموں کے لئے کل 815 کروڑ روپے رکھے گئے جس میں 141 کروڑ صرف ایڈز کی روک تھام کے لئے رکھے گئے جبکہ ملیریا کی روک تھام کے لئے صرف 135 کروڑ روپے الاٹ کئے گئے۔

(۱) گوتم مہتا نے ایسی لڑکیوں کا انٹرویو لیا جس کی تفصیلات ٹائمس آف انڈیا ۹۷-۷-۱۳ میں شائع ہوئیں۔

ہندوستان ٹائمس نے NACO کی دوسری رپورٹ کے حوالہ سے بتایا کہ ملک میں ۵ ہزار ایڈز (۱) کے Full Blown کیسس ہیں اور ۶۶ ہزار سے زیادہ اشخاص HIV Positive کے لئے ٹیسٹ کئے جاچکے ہیں۔ NACO کا کہنا ہے کہ ایڈز کے ۸۹ فیصدی مریض ۴۵ سال سے کم عمر کے ہیں جو کہ ورک فورس کی Productivity کی بہترین عمر ہوتی ہے Confederation of Indian Industries (CII) کا کہنا ہے کہ اگر ایڈز کی روک تھام کے لئے مناسب کارگر تدابیر نہ کی گئیں تو ملک کی اقتصادیات کو 23,500 کروڑ روپے کا خسارہ اٹھانا پڑے گا۔ لہٰذا دہلی چیپٹر آف CII نے ایڈز کے مہلک مرض کے بارے میں لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کا کارگر پروگرام بنایا ہے جو CII کی 3,800 کمپنیوں میں بروئے عمل لایا جائے گا اس پروگرام میں یہ اُمور شامل ہیں:

فیکٹریوں میں کام کرنے والے عملہ کے لئے لکچر اور کاؤنسلنگ۔

شعور بیدار کرنے والے پوسٹرز اور سلائڈ شوز۔

محفوظ جنسی اختلاط کی تدابیر کی واقفیت کیونکہ Management کے جائزوں میں یہ پایا گیا کہ لوگ اب بھی Casual Sex کو بڑی سرسری نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایس. آر. اے ملک SRK Malik لکھتے ہیں کہ ''ایڈز کے پھیلتے ہوئے مہلک مرض سے ہماری آنکھیں کھل جانا چاہئیں اور ہمیں مناسب طریقے سے جنسی آسودگی حاصل کرنا چاہئے۔ آزادانہ تعلقات اور رشتۂ ازدواج سے باہر ناجائز تعلقات سے HIV انفکشن میں مبتلا ہونے کے قوی امکانات ہوجاتے ہیں۔ بچاؤ کی طبی تدابیر اور اخلاقی قدروں میں کتنی ہم آہنگی ہے۔''

(۱) اب تازہ ترین تخمینہ سے یہ اعداد ۴۰ ہزار تک پہنچ چکے ہیں۔

باب ۱

معاشرتی زندگی پر اثرات

معاشرہ کا سب سے قدیم اور اہم بنیادی ادارہ خاندان ہے اور اس کے استحکام پر ہی افراد کی فلاح و بہبود اور معاشرہ کی خوشحالی کا دارومدار ہوتا ہے۔ شادی خاندان کے بقا اور تحفظ کی ضامن ہوتی ہے اور اسی سے اجتماعی شعور (Collective Conciousness) پیدا ہوتا ہے جو معاشرہ کو ایک منضبط گروپ (Cohesive Group) کی شکل دیتا ہے۔ جدید زندگی کی تگ و دو اور کشمکش میں سب سے پہلا سانحہ خاندانی زندگی کے خاتمہ کا ہوا۔ پروفیسر سوروکن کے الفاظ میں ”ایک طرف شوہر اور بیوی میں الفت و یگانگت کم ہوتی جا رہی ہے اور دوسری طرف والدین اور بچوں میں شفقت و پیار کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے، طلاق و تفریق کے بڑھتے ہوئے واقعات سے بڑی تعداد میں بچے پدرانہ شفقت و محبت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جس سے شادی کا ادارہ بھی کمزور پڑتا جا رہا ہے اور خاندانی تحفظ بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے“۔ بغیر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے ساتھ رہنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکا میں ۱۹۷۰ء کے مقابلہ میں ایسے Live-in-Couples کی تعداد میں ۱۳۱ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ جدید لائف اسٹائل نے انفرادیت کو بڑھاوا دیا ہے جس سے خانگی ڈسپلن کمزور پڑتا جا رہا ہے والدین اور بزرگوں کا ادب و لحاظ بھی مائل بہ انحطاط ہے امریکا میں اب لڑکے اپنے باپ DAD کو My Moms boy friend کہتے ہیں!

ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق لکھتے ہیں کہ ”امریکہ اور یورپ کے اکثر ملکوں میں خاندانی زندگی تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ برطانیہ میں بیس ہزار افراد سے بات چیت کر کے بی بی سی نے

جو جائزہ مرتب کیا اس کے مطابق وہاں ایک چوتھائی گھرانوں میں روایتی کنبے رہتے ہیں یعنی میاں بیوی اور بچے باقی دو تہائی بغیر شادی اکٹھے رہتے ہیں یا تنہا زندگی گزارتے ہیں“۔(۱) خاندان کے افراد آپس میں ہی بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں ماں باپ اپنا زیادہ تر وقت گھر کے باہر گزارتے ہیں وہ کام میں مصروف ہوتے ہیں یا تفریح میں بچوں کے لئے ان کے پاس وقت نہیں۔ ایک جائزے کے مطابق ایک امریکی باپ اپنے بچوں کو ۲۴ گھنٹے میں صرف سات منٹ اور ماں صرف تیس منٹ دے پاتی ہے۔ مغربی جرمنی میں ایک فیملی کے پاس دن بھر میں صرف ۴۶ منٹ اپنے لئے ہوتے ہیں۔ بچے بڑے ہونے کے بعد خود بھی اپنا وقت باہر گزارنے لگتے ہیں اور چھوٹے بچے گھر میں ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں کیونکہ ایک امریکی کے الفاظ میں ٹی وی ان کے لئے کبھی اتنا زیادہ مصروف نہیں ہوتا: Because the T.V. is Never Too Busy For Them (۲)

صنعتی و تجارتی نظام کی تیز روی اور پیسہ کمانے کی دوڑ نے خاوندوں اور بیویوں تک میں (۳) فاصلے بڑھا دیئے ہیں اور انہیں ۲۴ گھنٹے میں بمشکل چند لمحے باہمی ملاقات کے لئے میسر آتے ہیں۔ چنانچہ ان دلائل کی بنیاد پر چند سال پہلے برطانوی پارلیمنٹ کے متعدد ارکان نے مطالبہ کیا تھا کہ ہفتے میں تین دن چھٹیاں کی جائیں۔

نوجوانوں میں اخلاقی قدریں پیدا کرنے میں معاشرتی اداروں کی ناکامی

ایک سرکاری امریکی کمیٹی نے اعتراف کیا کہ خاندان، کمیونٹی اور اسکول نیز دوسرے سوشیلائزیشن اور انٹیگریشن کے ادارے ویسے فرائض انجام نہیں دے پا رہے ہیں جیسے کہ وہ پہلے انجام دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ بڑی تعداد میں امریکی اپنے معاشرہ سے الگ تھلگ (Alienated) ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں میں ڈرگس کا بڑھتا ہوا استعمال، جرائم اطفال، کمسنی کے حمل، بے روزگاری اور اسکولوں سے ڈراپ

(۱) ”یہ ہے مغربی تہذیب“ ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق۔ ص ۱۲۔
(۲) الرسالہ جولائی ۱۹۹۱ء۔
(۳) یہ ہے مغربی تہذیب۔ از ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق۔ ص ۱۵

آوٹ کی وجہ سے لاکھوں امریکی ٹین ایجرس ملک کے لئے مفید کارگر شہری نہ ثابت ہو سکیں گے۔ مشہور امریکی کالم نویس راسکو ڈرمنڈ Rosco Drummond لکھتے ہیں کہ ''امریکی معاشرہ میں متعدد ایسے پیچیدہ مسائل ہیں جو تشویش کا باعث ہیں۔ ڈرگس کا روز افزوں استعمال، طلاق کی شرح، شادی کے بغیر جوڑوں کا ایک ساتھ رہنا اور پورنو گرافی میں بھیانک اضافہ۔ ان تمام اُمور نے ڈیموکریٹک حکومت کے لئے زبردست چیلنج پیش کردیئے ہیں۔''

کارنیگی کارپوریشن (Carnegie) کے ایک مطالعہ میں بتایا گیا کہ ملک کے ستر لاکھ نوجوان کو (جو دس سے سترہ سال کی عمر والوں کا چوتھائی ہیں) شراب نوشی، نشیلی ادویات، قبل از وقت غیر محفوظ جنسی اختلاط نیز دوسرے غیر اخلاقی افعال کی وجہ سے شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ نیویارک کے سابق گورنر Mario Cuoumo نے انتہائی تاسف کے ساتھ کہا کہ ''امریکہ اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تعلیم دینے میں ناکام ثابت ہورہا ہے جو اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے''۔ انہوں نے اس کے لئے بڑھتے ہوئے تشدد، ناخواندگی، فیملی اسکول، چرچ اور حکومت۔ سب ہی اداروں کو ذمہ دار قرار دیا جو ملک کے نونہالوں میں اخلاقی قدروں کی اہمیت، اچھے اور برے کی تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہورہے ہیں۔ امریکی نوجوانوں میں تعلیم و ہنر حاصل کرنے کی اہلیت رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے''۔

ایڈورڈ گولڈ اسمتھ لکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام انڈسٹریل سوسائٹیاں کثرت مے نوشی، نشیلی ادویات کے ناروا استعمال، جرائم وتشدد، دماغی امراض اور خودکشیوں کے بڑھتے ہوئے واقعات سے جوجھ رہے ہیں جو معاشرہ کے انحطاط کی نشانیاں ہیں۔ آبادی کے بے پناہ اضافہ نے ماحولیات کو بری طرح آلودہ کردیا ہے اور اگر اسے روکا نہ جاسکا تو مزید سماجی انحطاط ہوگا اور انسانی زندگی کی کوالیٹی خاصی حد تک متاثر ہوگی۔ ہمیں اس نظریہ کو ترک کردینا چاہئے کہ صرف پروڈکشن میں اضافہ ہی انسانوں کو آسودہ بنا سکتا ہے''۔

لیبرفورس میں عورتوں کی شمولیت

دوسری جنگ عظیم میں بڑی تعداد میں مردوں کے میدان جنگ میں ہلاک، زخمی

اور گمشدہ ہوجانے کی وجہ سے یورپ میں کارخانوں کو چلانے کے لئے لیبر فورس کی کمی ہوگئی، لہٰذا اسے پورا کرنے کے لئے مجبوراً عورتوں کو کام پر لگانا پڑا۔ رفتہ رفتہ دوسری عورتیں بھی بھرتی کی جانے لگیں اور اس طرح عورتوں کے قدم گھر سے باہر فیکٹریوں اور دفاتر کی جانب بڑھنے لگے۔ آئی۔ ایل۔ او کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ دنیا کے سب ہی ملکوں میں اب عورتیں بڑی تعداد میں ورک فورس میں شامل ہورہی ہیں۔ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں تو یہ اضافہ بڑی تیزی سے ہوہی رہا ہے لیکن ترقی پذیر ممالک بھی اس دوڑ میں اب پیچھے نہیں رہے۔ لاطینی امریکا اور ایشیا کے کچھ ملکوں میں یہ اضافہ کافی نمایاں ہے۔

یو۔ ایس۔ لیبر ڈپارٹمنٹ نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ۲۰ سے ۳۴ سال کی عمر کی شادی شدہ خواتین میں دو تہائی کام کرتی ہیں اور وہ اپنے خانگی فرائض کے ساتھ کیریر کی ذمہ داریاں بھی بخوبی نبھاتی ہیں۔ امریکا کے ایک نیشنل پروجیکشن میں بتایا گیا کہ ۲۰۰۰ء تک عورتیں ورک فورس کا ۴۷ فیصدی ہوجائیں گی۔ واشنگٹن ڈی سی میں اب بھی 68.1 فیصدی سفید فام اور 72.2 فیصدی سیاہ فام عورتیں کام کرتی ہیں۔ مشرقی یورپ کے کچھ ملکوں میں ۷۰ سے لے کر ۸۰ فیصدی تک عورتیں کام کرتی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں عورتوں کے اقتصادی اعتبار سے سرگرم ہوجانے اور Female Participation Rate کے بڑھ جانے سے ملک کی پیداوار میں اضافہ ضرور ہوا لیکن بچوں کی نوجوان ماؤں کو جو اہم فرائض بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے گھر پر انجام دینا چاہئے تھا وہ ممکن نہ ہوسکا۔ جیسا کہ برطانیہ کی قومی مجلس بہبود اطفال کے صدر لارڈ ویرولم نے کہا کہ ''ہمیں فیکٹری گرلز اور گلیمر گرلز سے زیادہ اچھی ماؤں اور بیویوں کی ضرورت ہے۔ ملک صنعتی لحاظ سے بھلے ہی ترقی کررہا ہو لیکن گھریلو زندگی تباہ ہوئی جارہی ہے۔'' بچوں کی مناسب تربیت و پرورش نہ ہونے سے وہ متعدد نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں، آوارہ گردی اور جرائم کا شکار ہورہے ہیں اور معاشرہ میں ایسے پرابلم چائلڈ کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے بچوں کے مسائل حل کرنے کے لئے متعدد فلاحی انجمنیں قائم کی جارہی ہیں لیکن وہ ان بچوں کو وہ راحت، سکون اور تحفظ دینے میں قاصر رہتی ہیں جو خوشیوں سے بھرپور گھرانہ دے سکتا ہے۔ اسی لئے سابق امریکی صدر جیمی کارٹر نے اپنا عہدہ سنبھالتے ہی First Nation's Office for Families قائم کیا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ ہمیں اپنی فیملی کے ساتھ زیادہ

سے زیادہ وقت گزارنا چاہئے۔

پری پورنا نندورما لکھتے ہیں۔(۱) "عورتیں اب اتنی مصروف ہوگئی ہیں کہ انہیں خود اپنے پیدا کردہ بچوں کی پرورش کے لئے وقت نہیں ہے۔ والدین کی خودغرضی نے عدم توجہی اور غیر ذمہ داری کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ ڈاکٹر وی فنٹانا (Dr. V. Fontana) کا کہنا ہے کہ ۱۱-۱۲ اور ۱۳ سال کی عمر کے بچے قتل عمد کے مرتکب ہورہے ہیں اور یہ ایسے گھروں کے ہوتے ہیں جہاں وہ خود مظالم کا شکار رہے ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں ہندوستان کے مقابلہ میں چار گنا زائد بچے ہر سال مختلف جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے Brewer نے کہا کہ یہ ایسے حقائق ہیں جو اس دعوی کو مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں کہ برطانیہ میں انسانی حقوق اور رحم کی بنیادوں پر معاشرہ قائم ہے۔ شادی کے بغیر جو بچے پیدا ہوجاتے ہیں ان کے ساتھ سخت بدسلوکی کی جاتی ہے جس سے جرائم اطفال کا مسئلہ اور زیادہ سنگین ہوتا جارہا ہے۔"

بچوں کی طرف بے توجہی کی ایک تازہ مثال جاپان کا یہ واقعہ ہے جس میں ایک ماں جوئے گھر میں مسلسل آٹھ گھنٹے جوا کھیلنے میں مصروف رہی اور اپنے ایک اور دو سال کی عمر کے دونوں بچوں کو کار میں بند کرگئی جس کا انجن اور ایئر کنڈیشنگ چلتا رہا جب وہ واپس آئی تو دونوں بچوں کو مردہ پایا تب وہ اسپتال چیختی چلاتی دوڑی لیکن بچے پہلے ہی مرچکے تھے!

عورتوں کے بڑی تعداد میں کام کاج پر جانے سے خاندان کا نظام بگڑ گیا، مائگریشن اور طلاق کی وجہ سے ایک فریق کے خاندان Single Parent Family کی تعداد بڑھنے لگی، بہت سے خاندان Matriarcal ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں عورتوں کو ہی اکیلے گھر چلانا پڑتا ہے جو ان کے اعصاب پر زبردست دباؤ ڈالتا ہے اور ان میں تنہائی کا احساس شدت سے پیدا ہوجاتا ہے۔ کچی عمر کی شادیاں (Immature Marriage) خاندان کے استحکام کے لئے زبردست چیلنج ثابت ہورہی ہیں۔ نوجوان کم عمر میں اپنی پسند سے شادی کرکے والدین سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ والدین بڑی تعداد میں اولڈ ایج ہومز میں اپنی زندگی تنہائی میں گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مشہور ماہر نفسیات

(۱) "Sex Offences In India & Abroad" pp 196

ڈاکٹر این۔این۔وگ (Dr. N.N. Wig) کہتے ہیں کہ "مغربی متمدن ممالک میں اولڈ ایج ہومز جو اتنی بڑی تعداد میں کھلتے جارہے ہیں وہ گویا جوائنٹ فیملی سسٹم کی جگہ لے رہے ہیں لیکن ان کا پروفیشنل سٹ اپ بڑی حد تک غیر انسانی Dehumanised ہوتا جارہا ہے۔" پروفیسر سوروکن (Sorokin) نے بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر بے لوث محبت کا یہ سرچشمہ خشک ہوجائے گا تو آپسی اشتراک و تعاون کے دوسرے انسانی ادارے بھی معطل ہوجائیں گے اور معاشرہ میں صرف خودغرض اگوئسٹ (Egoist) رہ جائیں گے جو نہ اچھے ہمسایہ ثابت ہوں گے اور نہ ان میں رحم و ہمدردی کے جذبات ہی فروغ پاسکیں گے۔ زندگی کی جدوجہد اور زیادہ سخت ہوجائے گی اور معاشرہ میں انتشار بھی بڑھ جائے گا۔"

شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنے کا دستور

برطانیہ کے نامور فلسفی لارڈ برٹرینڈ رسل (Russel) اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ "میرا سن بارہ سال کا تھا جب مجھے جنس و جنسیات سے واقفیت ہوگئی اور مجھ پر اسی وقت سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ معقول رشتہ تو صرف آزادی اختلاط کا ہی ہوسکتا ہے اور قید نکاح والا دستور تو ہم پرستی پر مبنی ہے"۔ مصنفہ ہیلن براؤن اپنی کتاب Sex And The Single Girl میں ماڈرن لڑکی کو یہ مشورہ دیتی ہیں: "میں سمجھتی ہوں کہ شادی تمہاری زندگی کے خراب دنوں کے لئے ایک انشورنس ہے۔ اپنی زندگی کے بہترین دور میں تمہیں شوہر کی ضرورت نہیں ہے"۔ اسی طرح ملیشیا شوڈاف (Melissa Shadoff) اپنی بسٹ سیلر کتاب (۱) میں لکھتی ہیں: میں پوچھتی ہوں کہ کیا آپ ایک آئیڈیل ماں بننے کا ارادہ رکھتی ہیں اور پھر خود ہی جواب دیتی ہیں "ہرگز ایسا نہ سوچئے اس طرح آپ اپنے شوہر کے لئے معیاری بیوی، صحیح معنوں میں اس کی شریک حیات اور صرف اس سے بے پناہ محبت کرنے والی بیوی نہ بن سکیں گی۔"

"Hinder your role as excellent wife
and a lover and a friend to your husband"

وہ بچوں کے بارے میں بھی اچھے خیالات نہیں رکھتیں اور انہیں خودغرض اور صرف اپنا آرام چاہنے والا بتاتی ہیں:

(۱) The Woman as Chameleon or How to be an Ideal Woman

'Spoilt Brats, Demanding And Self Centred'

ایسے مشوروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کو ایک غیر ضروری بندھن سمجھا جانے لگا اور بغیر رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے ایک ساتھ رہنے کا دستور فروغ پانے لگا۔ امریکی سنس بیورو کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ یہ دستور اب تیزی سے رائج ہوتا جارہا ہے۔

Prelude To Entering The More Conventional Living اور ۱۹۷۰ء کے مقابلہ میں اس طرز رہائش میں ۱۳۱ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں ایسے غیر شادی شدہ جوڑوں کی تعداد ۵ لاکھ ۳۲ ہزار تھی جو ۱۹۸۰ء میں بڑھ کر ۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار ہوگئی! بوسٹن کے ایک میرج گون ڈیزائنر نے بتایا کہ اب جوڑے اس بات کو چھپاتے بھی نہیں کہ وہ ایک ساتھ رہ رہے ہیں اور ایسی بیشتر شادیوں میں دلہن کی ماں اس کے بچہ کو لئے چرچ میں شادی کی تقریب کے دوران بیٹھی رہتی ہے۔

برطانیہ میں بھی یہی لائف اسٹائل اپنایا جانے لگا ہے اور وہاں بھی تقریباً گیارہ لاکھ جوڑے ایسے موجود ہیں۔ یہ طریقہ صرف نوجوانوں میں ہی مقبول نہیں بلکہ اچھے معمر اشخاص جو عہدے سنبھالے ہوئے ہیں وہ بھی اسی طرح رہ رہے ہیں اور ایسے تین افراد میں ایک کی گرل فرینڈ کام پر بھی جاتی ہے۔ جرمنی میں بھی یہ طریقہ تیزی سے اپنایا جانے لگا ہے اور ایسے تعلق سے پیدا ہونے والے بچوں پر کوئی کلنک بھی نہیں لگتا۔ ۱۹۸۱ء میں وہاں ایسے Live in Couples کی تعداد ۹ لاکھ ۵ ہزار سے زیادہ تھی۔ ایسے جوڑوں کا کہنا ہے کہ وہ آپس میں سمجھوتہ سا کر لیتے ہیں اور باہمی رضامندی سے ایک ساتھ رہتے ہیں کوئی قانونی بندش نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ زیادہ بہتر طریقے سے ایک دوسرے کو سمجھ پاتے ہیں اور اپنے کو زیادہ آزاد محسوس کرتے ہیں!

منولا بی جارا (Manola B. Jara) لکھتے ہیں کہ یورپ اس وقت ایک ڈیمو گرافک ٹرانزیشن (Demographic Transision) سے گزر رہا ہے جس کی نشانیاں Live in Couples کی تعداد میں اضافہ اور شادی کے ادارہ کی طرف سے بے اعتنائی ہے اسی کے ساتھ زرخیزی کی شرح میں بھی گراوٹ نمایاں ہے۔ ماہر عمرانیات ڈاکٹر ڈرگ وان ڈی کا Dr. Drik Van De Kaa نے اس کا سبب ترقی پسندی اور انفرادیت بتایا۔ یورپ کا پہلا ٹرانزیشن ۱۹۳۰ء میں آیا تھا جب خاندان اور بچوں سے لگاؤ بڑھ گیا تھا اب

King Child کا دور ختم ہو چکا ہے اور چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے یورپ میں بچوں کی پیدائش میں کمی واقع ہو رہی ہے اور اس کا سبب شادی اور Parenthood کی ذمہ داریوں سے کترانا ہے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے بغیر ہمبستر ہونے (Cohabitation) کا چلن بڑھتا جارہا ہے اور Out Of Wedlock Fertility کا تصور زیادہ قابل قبول ہوتا جارہا ہے اور Greater Self Fulfilment کے جذبہ سے ہی بچے پیدا کئے جانے لگے ہیں۔ یورپ کے لوگ عرصۂ دراز سے چلے آرہے Behavioural Pattern کو ترک کرتے جارہے ہیں۔

انفرادیت میں اضافہ زرخیزی (Fertility) میں کمی کا اہم سبب ہے۔ نزرلینڈ اور دوسرے مغربی یورپی ملکوں میں یہ نظریہ زیادہ تیزی سے پھیلتا جارہا ہے اور متعدد معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی سوالات کے جواب اس بیس سال کے درمیان بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ بڑی تعداد میں عورتیں بغیر شادی کے شعوری طور پر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہنے لگتی ہیں اور بچے بھی جب وہ چاہتی ہیں تب پیدا کرتی ہیں اور اس قسم کے Out Of Wedlock Births پر انہیں کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ سویڈن اور ڈنمارک جیسے ملکوں میں تو ایسے بچوں کی پیدائش ۴۰ فیصدی تک ہوگئی ہے (جبکہ ۱۹۶۰ء میں یہ صرف دس فیصدی تھی) اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو شمالی اور مغربی یورپ کے ملکوں میں ۵۰ سے ۶۰ فیصدی مرد و عورتیں شادی ہی نہیں کریں گی۔ شادی کے بجائے اب ساتھ رہنے کا رواج جسے Live in کہا جاتا ہے بڑھ رہا ہے۔ سویڈن اور ڈنمارک وغیرہ ملکوں میں Cohabitation ایک سوشل انسٹی ٹیوشن بن گیا ہے اور اسے نارمل Behaviour مانا جاتا ہے نہ کہ Deviant Behaviour۔ ڈاکٹر Kaa کا کہنا ہے کہ کئی دوسرے ممالک بھی سویڈن اور ڈنمارک کی راہ پر گامزن ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے دہے میں Cohabitation کو ٹرائل میرج کے طور پر اپنایا جاتا تھا لیکن اب اسے شادی کا نعم البدل سمجھا جانے لگا ہے!

فلوریڈا میں چرچ حکام کی روحانی سرپرستی میں ٹرائل میرجس (Trial Marrigaes) کی تلقین کی جارہی ہے۔ پادری Rev. Adrin Melott نے بتایا کہ ایسی شادیوں میں میاں بیوی کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، نہ شادی کی انگوٹھی دی جاتی ہے اور نہ کوئی میرج لائسنس۔ اسکی کوئی قانونی حیثیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مرد و عورت صرف ساتھ رہنے اور بچہ نہ

پیدا کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ امریکا میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ تین سال کیلئے ٹرائل میرج کی اجازت دے دی جائے اور ہر تین سال کے بعد میرج لائسنس کی تجدید کر دی جائے۔ لیکن اس تجویز کی سخت مخالفت کرتے ہوئے معروف سوشل ورکر Mrs. Betty Walch نے کہا کہ یہ تجویز رکھنے والے صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ تین سال کا Snack up Contract ہے، اگر آپ تین سال کے لئے شادی کی تجویز رکھتے ہیں تو اُن معصوم بچوں کے لئے کیا سوچتے ہیں اور ان کا مستقبل کیا ہوگا جو پوری زندگی جینا چاہتے ہیں؟

طلاق وتفریق کے واقعات کی کثرت

خاندان کی تاسیس ازدواج کے ذریعہ عمل میں آتی ہے اور ازدواج مرد و عورت کے ایسے جنسی اتحاد کا نام ہے جو افزائش نسل کی خاطر عمل میں آتا ہے۔ مغربی ملکوں میں مرد وزن کی معاشی وسیاسی آزادی نیز مساوات نے ازدواج کو محض حصول حظ (Sexual Enjoyment) کا ایسا ذریعہ بنا دیا ہے جس میں اولاد پیدا کرنے اور خاندان کے قیام کے تصورات بہت ہی دھندلے ہو گئے ہیں۔ آزادانہ ڈیٹنگ اور شادی سے قبل ہی جنسی ملاپ کے تمام مرحلوں سے گزر چکنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شادی کے تھوڑے ہی دنوں میں تھرل (Thrill) اور رومانس ختم ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ایک دوسرے کو پھیکے لگتے ہیں۔ معاشرہ میں آزادانہ خلط ملط کے مواقع مہیا ہی رہتے ہیں۔ تعلیمی زندگی میں بھی اور معاشی مشاغل، کھیل کود، رقص وسرود سیر وتفریح اور مخلوط غسل وغیرہ میں، لہٰذا وہ جلد ہی دوسرے Encounter میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ نئے فریق کی رعنائی ودلکشی جلد ہی ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور ان کی ازدواجی زندگی میں رخنے پڑنے لگتے ہیں اور بہت جلد طلاق وتفریق کی نوبت آجاتی ہے اس لئے طلاق کا سب سے بڑا سبب 50-45 فیصدی تک فریقین کی بدچلنی Adultery ہوتا ہے اور سب سے زیادہ شادیاں یا تو شروع کے ہی چار پانچ سال کے اندر ٹوٹتی ہیں یا پھر بیس سال کے بعد۔ ایگن فریڈل Egon Friedell لکھتے ہیں (۱) ''ہر وہ چیز جس سے خاندان کے استحکام کا سوال پیدا ہوتا ہے بری سمجھی جاتی ہے۔ شوہر یا زوجہ کا ایک دوسرے سے وفادار رہنا ایک مضحکہ خیز چیز ہے۔ جس عورت کے عاشق نہ ہوں اس کو نیک چلن نہیں بلکہ غیر دلچسپ اور بدوضع سمجھا جاتا ہے اور جس شادی

(۱) A Cultural History of Modern Age

شدہ مرد کی داشتائیں نہ ہوں اس کو نامرد یا تباہ حال قرار دیا جاتا ہے''۔

کے۔ ڈی۔ شرما نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''امریکہ میں طلاق وتفریق نے شادی کی وہ مٹی پلید کر دی ہے اور اس کے اتنے خراب نتائج پیدا ہو رہے ہیں جس کی کوئی مثال جدید تاریخ میں نہیں ملتی، ہر چوتھی شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے۔ دُنیا میں ہونے والی کل طلاقوں کی ۳۰ فیصدی صرف امریکا میں واقع ہوتی ہیں حالانکہ یہاں کی آبادی دُنیا کی کل آبادی کا صرف چھ فیصدی ہے!'' برطانیہ میں شادی شدہ گھرانوں میں بھی طلاق کی بھرمار ہے اور ان طلاقوں کے حوالے سے حکومت جو اخراجات برداشت کرتی ہے وہ ۳۵ ملین پاؤنڈ سالانہ ہیں۔ ان حالات میں سب سے زیادہ معصوم بچے متاثر ہوتے ہیں جن کی تعداد فی الحال ڈیڑھ لاکھ سالانہ ہے''۔ برطانیہ میں شادیاں ٹوٹنے کے سانحوں کے باعث ہر سال سرکاری کارروائی پر ۱۴۴ بلین (Billon) پونڈ کی رقم خرچ ہوتی ہے۔ خیراتی ادارہ ون پلس ون کے مطابق برطانیہ میں شرح طلاق یورپ بھر میں سب سے زیادہ ہے جہاں ہر ایک ہزار کی آبادی میں تین جوڑوں کی شادی ٹوٹ جاتی ہے جبکہ یورپ میں یہ اوسط 1.7 ہے!(۱)

ایک ڈیموگرافک رپورٹ میں بتایا گیا کہ یورپ میں طلاقیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ای۔ ای۔ سی (EEC) کے دس ملکوں میں طلاق کی شرح میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک نسل قبل ان دس ملکوں میں ہر پندرہ شادیوں پر ایک طلاق ہوتی تھی۔ ۱۹۸۱ء تک یہ شرح بڑھ کر تین گنی ہو گئی اسی عرصہ میں ناجائز ولادتوں میں بھی خاصا اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں ہر ایک ہزار ولادتوں میں ۴۶ ناجائز ولادتیں ہوتی تھیں، اب یہ تعداد بڑھ کر دگنی (یعنی ۹۲) سے بھی زائد ہو گئی ہے، سب سے زیادہ ناجائز ولادتیں ڈنمارک میں ہوتی ہیں، ہر ہزار ولادتوں میں ۳۸۲ ناجائز بچے!

بریڈفورڈ (برطانیہ) کے ایک ٹیکنیکل ادارہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فرینک کا کہنا ہے کہ ''شادیوں کے ٹوٹنے میں اب جو اتنا اضافہ ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں عورت کو غیر معمولی آزادی حاصل ہو گئی ہے اور ماہرین حیاتیات کا تجزیہ ہے کہ جب سوسائٹی پر اُن کا قبضہ ہو جاتا ہے تو رشتۂ ازدواج کمزور پڑ جاتا ہے اور جس معاشرہ میں باپ

(۱) یہ ہے مغربی تہذیب' ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق۔ ص ۱۳

کے اقتدار کا غلبہ رہتا ہے وہاں یہ تعلق مستحکم رہتا ہے"۔

امریکا میں طلاق کی شرح

امریکا میں طلاق کی شرح دنیا کے تمام ملکوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں وہاں ہر ایک ہزار شادیوں پر دس طلاقیں ہوتی تھیں۔ ۱۹۷۰ء میں دفعتاً اس میں نمایاں اضافہ ہوا اور یہ ایک ہزار میں ۱۴ تک پہنچ گئیں! اس کے بعد اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بیورو آف سنس کے مطابق ۳۰ سے ۴۴ سال کی عمر کی ۴۰ فیصدی عورتیں طلاق حاصل کر لیتی ہیں۔ ۴۵ سے ۵۴ سال کی عمر کی عورتوں میں طلاق کا تناسب ۳۶ فیصدی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ۱۱ لاکھ ۸۷ ہزار اور ۱۹۹۲ء میں ۱۲ لاکھ ۱۵ ہزار طلاقیں وقوع پذیر ہوئیں۔ ۱۹۹۳ء کے پہلے ۳ ماہ میں ۴ لاکھ ۱۲ ہزار شادیاں سرانجام پائیں اور شادیوں کے تین ماہ کے اندر ۲ لاکھ ۹۲ ہزار طلاقیں واقع ہو گئیں۔ طلاق کی کثرت سے نوجوانوں میں بغیر شادی کے زندگی گزارنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ طلاق کی بیشتر وجہ یہ تھی کہ:

☆ ان لڑکیوں نے شادی سے قبل ہی غیر مردوں سے جنسی تعلقات قائم کر لئے تھے یا پھر شادی سے قبل کسی بچے کو جنم دیا تھا۔

۱۹۹۲ء میں ۱۹ سال سے کم عمر لڑکیوں نے جن بچوں کو جنم دیا تھا اُن میں ۶۵ فیصد ناجائز اولاد تھی۔ ہسپانوی آبادی میں یہ شرح ۶۰ فیصد اور سفید نسل میں ۵۶ فیصد تھی۔ (۱)

امریکا میں کامیاب شادیاں معجزہ ہو گئیں

چد انندراج گھٹا لکھتے ہیں :

امریکا میں جہاں طلاق کی شرح ۵۰ فیصدی تک پہنچ گئی ہے اور ایک تہائی خاندان ایک پیرنٹ Single Parent کے گھرانے ہو گئے ہیں۔ شادی کا ادارہ بحرانی دور سے گزر رہا ہے جس کا سب سے تباہ کن اثر بچوں کی نشو و نما پر پڑ رہا ہے۔ ۱۹۹۵ء میں ہوئے ایک سرکاری سروے کے مطابق ۱۴ سے ۱۸ سال کی عمر کے صرف ۴۲ فیصدی بچے پہلی شادی والے (First Marriage) خاندان میں رہتے ہیں جہاں ماں اور باپ

---

(۱) "امریکا جرائم کی آماجگاہ" قومی آواز، ۲۱ رجنوری ۱۹۹۵ء

دونوں ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ ۲۱ فیصدی بچے صرف ایک پیرنٹ کے ساتھ رہتے ہیں جن کے ماں یا باپ میں سے ایک فریق یا تو طلاق حاصل کر چکے ہوتے ہیں یا علحدہ رہ رہے ہوتے ہیں۔

۲۲ فیصدی بچے ماں اور باپ دونوں (Two Parent) فریقین کے گھرانوں میں رہتے ہیں جن میں یا تو ماں یا باپ سوتیلے ہوتے ہیں۔ باقی ۱۵ فیصدی بچوں میں ۶ فیصدی بچے ایسے اکیلے ماں یا باپ کے ساتھ رہتے ہیں جو کبھی رشتہ ازدواج میں منسلک ہی نہیں ہوئے۔ اور ۶ فیصدی بچے ایسے بالغ افراد کی اولاد ہوتے ہیں جن میں صرف جنسی تعلق بنا رہتا ہے (اور نکاح کا کوئی سوال ہی نہیں) اور ۳ فیصدی بچے بیوہ ہو گئے ماں یا باپ کی اولاد ہوتے ہیں !

حال میں اسکولی بچوں کے درمیان شوٹنگ کے واقعہ سے اور دوسرے عبرتناک واقعہ سے جس میں ۱۲-۱۳ سال کی عمر کے دو بچوں نے اپنے والد کو مار ڈالا تھا۔ ازدواجی ادارہ کے کمزور پڑ جانے پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔ ایسے واقعات میں وہی بچے ملوث پائے گئے جو شکستہ گھرانوں کے تھے۔

خاندان کے اس بحران نے ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے کہ فیڈرل انتظامیہ اور کئی ریاستوں کے حکام کو اس ادارہ کی اصلاح کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑ رہا ہے۔ امریکا کے صدر جارج بش نے کہا کہ مستحکم (Stable) خاندان امریکا کی فلاحی پالیسی کا بنیادی مقصد ہونا چاہئے۔" انہوں نے ہر سال ۳۰۰ ملین ڈالر ایسے منصوبوں پر خرچ کرنے کی منظوری دی جس کا مقصد شادی کے ادارہ کو مضبوط بنانا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکا میں شادی کے ادارہ کو بچانے کے لئے غیبی امداد کی زیادہ ضرورت ہے بہ نسبت حکومت کے پروگراموں کے۔

"America needs divine intervention more than government programmes to save its marriages." (TOI 17-11-02)

فیملی پالیسیز اسڈیز سنٹر کے ذریعہ کئے گئے ایک پول (Poll) میں بتایا گیا کہ ۱۲ ملکوں پر مشتمل یورپین کمیونٹی میں برطانیہ کی شرح طلاق سب سے بڑھی ہوئی ہے اور ناجائز ولادتوں میں اس کا تیسرا نمبر ہے۔ یہاں کی شرح طلاق ایک ہزار شادیوں پر 12.9

ہے (دوسرے نمبر پر ڈنمارک 12.8 اور تیسرے نمبر پر نیدرلینڈ 8.7 ہے) ناجائز ولادتوں کی سب سے بڑھی ہوئی شرح ڈنمارک کی ہے 43.8 فیصدی اور اس کے بعد فرانس 21.9 فیصدی اور برطانیہ 20.9 فیصدی کا نمبر آتا ہے!(۱) ۱۹۸۴ء سے برطانیہ میں طلاق کے قوانین میں مزید ڈھیل دی گئی۔ پہلے قانون کی رو سے طلاق کی کارروائی شادی کے تین سال بعد ہی شروع کی جاسکتی تھی اس سال ہاؤس آف کامنس نے نیا قانون پاس کردیا جس میں اس مدت میں تخفیف کرکے ایک سال کردیا گیا اور سابق بیویوں کے (Alimony) نان ونفقہ کے حقوق کی بھی حد مقرر کردی گئی۔ چرچ کے حکام نے ان قوانین کی سخت مخالفت کی کہ اس سے ازدواجی ادارہ مزید کمزور پڑ جائے گا۔ طلاق اب اتنی آسان ہوگئی ہے کہ جو لوگ ازدواجی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ان مسائل کا دوسرا حل ڈھونڈھنے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہے کہ طلاق حاصل کرلی جائے۔

امریکا اور برطانیہ میں طلاق وتفریق کے بڑھتے ہوئے واقعات نے وہاں کے ماہرین سماجیات کے سامنے بڑا فکر انگیز مسئلہ پیدا کردیا ہے۔ طلاق وعلیحدگی سے خاندانوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ گہرے اثرات معاشرے پر پڑتے ہیں مثلاً ۱۹۸۷ء میں ایک لاکھ ستر ہزار طلاقیں ہوئیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر تین شادیوں میں ایک طلاق میں ختم ہوئی اور سولہ سال سے کم عمر کے ہر پانچ بچوں میں ایک بچہ ایسے شکستہ گھرانے کا ہوتا ہے۔ ماہرین سماجیات یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معاشرہ میں طلاق حاصل کرنے کی سہولتیں ہونا چاہئیں لیکن اس امر کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ طلاق سے معاشرہ کا اقتصادی نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ فریقین کی صحت برباد ہوجاتی ہے اور ان کی اولاد کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ان کی شخصیت کی نشوونما میں بے شمار نفسیاتی مسائل پیدا کردیتے ہیں۔ برطانوی میرج ریسرچ سینٹر نے اندازہ لگایا ہے کہ صرف برطانیہ میں طلاقوں سے معاشرہ کو دو بلین پونڈ کا خسارہ ہر سال اٹھانا پڑتا ہے جس میں 1.11 بلین پونڈ طلاق شدہ عورتوں کو گزارہ کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ 134 ملین پونڈ طلاق کے بعد ایک فریق کے خاندان کے خرچ کے لئے 300 ملین پونڈ بچوں کی نگہداشت پر اور 108

(۱) نیشنل ہرلڈ۔ ۱۷رجون ۱۹۸۹ء

ملین پونڈ طلاق کے مقدمات پر خرچ کئے جاتے ہیں۔(۱)

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ طلاق وتفریق سے لاکھوں بچوں کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے اور وہ متعدد ذہنی وجذباتی اُلجھنوں کا شکار ہوجاتے ہیں لہٰذا ازدواجی رشتوں کے استحکام کے لئے زوجین کو کاؤنسلنگ دینے کا معقول انتظام کیا جانا چاہئے تاکہ وہ ایسے طرز کی زندگی گزار سکیں جس میں آپس کی غلط فہمیاں نہ پیدا ہوں اور تعلقات خوشگوار بنے رہیں اس کے لئے ڈاکٹروں، سماجی کارکنوں اور ٹرینڈ کاؤنسلرس کی خدمات مہیا رہیں تاکہ بروقت مشورہ سے رشتوں کو ٹوٹنے سے بچایا جاسکے۔ اسکولوں میں جہاں بچوں کو جنس کے حیاتیاتی پہلو کی تعلیم دی جاتی ہے وہیں آپس میں میل ملاپ، خوشگوار تعلقات اور شادی میں باہمی اُنس ومحبت جیسے موضوعات کی بھی تعلیم دی جانا چاہئے۔ ڈاکٹر جیک ڈومینین نے کہا کہ ہمیں سیکس ایجوکیشن کے بجائے پیار کرنے کی تعلیم دینا چاہئے۔ "We Must Move From Sex Education To Education For Loving"

اسی طرح امریکا میں کیلیفورنیا پہلی ریاست تھی جس نے ۱۹۷۰ء میں No Fault Divorce کا نفاذ اپنے یہاں کیا جس کے تحت شادی شدہ جوڑے صرف یہ بتاکر کہ شادی ٹوٹ رہی ہے طلاق حاصل کرسکتے تھے انہیں ایک دوسرے پر کسی قسم کا الزام لگانے یا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان قوانین کے تحت اگر دوسرا فریق شادی ختم کرنے کے لئے رضامند نہ ہو تب بھی طلاق حاصل کی جاسکتی تھی۔ یہ قوانین اس مقصد سے وضع کئے گئے تھے کہ طلاق میں جو ناخوشگواری یا خشونت (Acrimony) پیدا ہوجاتی ہے اسے رفع کیا جاسکے۔ حالانکہ جج صاحبان جائیداد کے بٹوارے اور بچوں کی کفالت کے معاملہ میں کافی دشواریاں محسوس کرتے رہے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے امریکا کی دوسری ریاستوں نے بھی اپنے یہاں اسی طرح کے ڈھیلے قوانین نافذ کردیے لیکن ان قوانین کا اتنا زیادہ غلط استعمال ہوا کہ بات بات پر طلاق لی جانے لگی اور خاندانی نظام بالکل درہم برہم ہوگیا اور بچوں کی عدم کفالت نے نازک صورت اختیار کرلی اور معاشرہ میں ہر طرف انتشار پھیل گیا۔

اس دگرگوں حالت کو بہتر بنانے کی غرض سے اب امریکا کی کئی ریاستوں میں یہ

(۱) ٹائمز آف انڈیا 23.12.87

رائے عامہ بن رہی ہے کہ طلاق کے موجودہ قوانین میں سختی (Tighter) لانے کی ضرورت ہے تاکہ فریقین اپنی خانگی ذمہ داریوں کا بھی احساس کریں اور بچوں کی کفالت ونگہداشت کے فرائض سے پہلوتہی نہ کریں۔ میشاگن ریاست کے ایک نمائندہ جیسی ڈلمان نے یہ تجویز پیش کی کہ خاندانی قدروں کو پامال ہونے سے بچانے نیز اسکے نظم واستحکام کو برقرار رکھنے کیلئے طلاق چاہنے والے جوڑوں پر یک گونہ سختی کا نفاذ کیا جانا چاہئے تاکہ اتنی آسانی سے وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے سبکدوش نہ ہوسکیں۔ بہت سے وکلاء نے اس تجویز کی مخالفت کی، میشاگن بار ایسوسی ایشن کے چیئرمین نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ آپ لوگوں کو ساتھ رہنے پر مجبور کرسکتے ہیں یا اگر آپ رہنے پر مجبور بھی کردیں تب بھی انہیں ایک دوسرے سے خندہ پیشانی سے ملنے پر تو بالکل ہی مجبور نہیں کرسکتے۔ اسی ایسوسی ایشن نے اپنے ممبران میں ایک سروے کیا تو 84 فیصدی وکلاء نے Fault Based Divorce کی مخالفت کی۔

جرمنی میں طلاق کے واقعات کثرت سے ہورہے ہیں اور ایک غور طلب امر یہ ہے کہ عورتیں بڑی تعداد میں چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تقریباً 58 فیصدی طلاق کے مقدمات عورتوں کی طرف سے دائر کئے جاتے ہیں اور نو سال تک ساتھ رہنے کے بعد علیحدگی کی نوبت آجاتی ہے۔ تقریباً ہر چوتھے کیس میں طلاق کی کارروائی دوسرے فریق۔ زیادہ تر شوہر۔ کی رضامندی کے خلاف ہوتی ہیں۔

برطانیہ میں ٹین ایجرس کی دس فیصدی شادیاں دو سال بھی مشکل سے چل پاتی ہیں اور Seven Year Itch کی مدت اب گھٹ کر پانچ سال رہ گئی ہے اور ۴۰ فیصدی شادیاں چھ سال کے بعد ٹوٹ جاتی ہیں اور طلاقوں کی ۷۰ فیصدی کارروائیاں بیوی کی طرف سے شروع کی جاتی ہیں!

سویڈن میں گزشتہ دس سال کے عرصہ میں طلاقوں کی تعداد دُگنی ہوگئی اور شادی کے چند سال بعد ہی ۶۰ فیصدی شادیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

بلغاریہ میں 45.4 فیصدی طلاقیں فریقین کی بدچلنی کے باعث ہوتی ہیں۔

ہنگری میں طلاق کی شرح امریکا اور رومانیہ کے بعد سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

چیکوسلوا کیا کے شہری علاقوں میں ہر تیسری شادی طلاق میں ختم ہوجاتی ہے۔

جاپان میں بھی شادیاں بڑی سرعت سے ٹوٹ رہی ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں وہاں طلاق کے واقعات دوسری عالمی جنگ کے بعد سب سے زیادہ بڑھ گئے، ہر تین منٹ پر ایک طلاق۔ یعنی اگر وہاں پانچ نئی شادیاں ہوتی تھیں تو ایک طلاق واقع ہوتی تھی۔ ۱۹۹۴ء میں کئے گئے ایک سروے میں بھی جاپان کی ۴۰ فیصدی عورتوں نے یہ بتایا کہ وہ طلاق حاصل کرنے کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں حالانکہ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ اپنی شادی سے مطمئن ہیں۔

کناڈا کے محکمہ اعداد وشمار کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ملک کے طول وعرض میں طلاقیں کثرت سے واقع ہورہی ہیں۔ آٹھ سال قبل طلاق کے قوانین میں جو تبدیلیاں کی گئیں اس کے بعد طلاقیں بڑھنے لگیں اور اگلے پانچ سال میں مزید ۵۰ فیصدی اضافہ ہوجائے گا اور تب یہاں بھی وہی صورتحال ہوجائے گی جو اب امریکا میں ہے یعنی ہر ایک لاکھ اشخاص پر ۳۰۰ طلاقیں!

آسٹریلیا میں تقریباً ۴۰ فیصدی شادیاں طلاق میں ختم ہوجاتی ہیں اور بڑی تعداد میں فریقین صرف علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں۔ باضابطہ طلاق کی کارروائی بھی نہیں ہوتی۔

رُوس: ڈی۔ ایس۔ مہتا لکھتے ہیں (۱) ”روس میں جلد ٹوٹتی ہوئی شادیاں اور طلاقوں کی بڑھتی ہوئی شرح نے ملک میں شرح پیدائش کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ ہر سال تقریباً دس لاکھ شادیاں طلاق میں ٹوٹ جاتی ہیں جن میں دو تہائی طلاقوں میں پہل عورتوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ طلاق شدہ مردوں میں نصف اور ۴۰ فیصدی عورتیں دوبارہ شادی کرتی ہیں۔ حکومت نے کئی ایسے اقدام کئے جس سے رشتوں میں استحکام پیدا کیا جاسکے مثلاً شادی کرنے کی عمر میں تخفیف، شادی شدہ جوڑوں کو مکان تعمیر کرانے اور قرض دینے میں ترجیح اور ٹیکس میں رعایت وغیرہ۔

پراودا میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں بتایا گیا کہ روس میں بڑھتی ہوئی طلاقوں نے تشویشناک صورت اختیار کرلی ہے۔ ۳۷ فیصدی شادیاں تین سال کے اندر ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور ۷۰ فیصدی دس سال کے اندر! ۱۹۸۱ء میں 6,36,200 طلاقیں ہوئیں جو ۱۹۸۳ء میں بڑھ کر 80,00,000 ہوگئیں (۲)! طلاق کا سب سے بڑا سبب پہلے

(۱) "USSR Through Indian Eyes" D.S. Mehta

(۲) ٹائمز آف انڈیا ۸/ جولائی ۱۹۸۶ء

فریقین کی کثرت مینوشی بتایا گیا تھا اور اب پیسہ کی کمی بتایا گیا۔ ایک دوسری رپورٹ میں بتایا گیا کہ روس میں ہر سکنڈ پر ایک شادی ٹوٹتی ہے۔ سال گذشتہ (۱۹۸۷ء میں) وہاں 92,587 شادیاں ہوئیں اور 40,519 ٹوٹ گئیں۔

چین: اقتصادی ریفارم اور باہری دُنیا سے بڑھتے ہوئے تعلقات نے جہاں ایک طرف چین کے باشندوں کا معیار زندگی اونچا کر دیا ہے وہیں دوسری طرف طلاقوں کی شرح میں بھی اضافہ ہوگیا، خاص طور پر بیجنگ اور شنگھائی جیسے بڑے شہروں میں۔ ان شہروں میں ہر ایک ہزار شادی شدہ جوڑوں میں دس طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ یہ شرح پانچ سال قبل سے تین فیصدی بڑھ گئی ہے۔ بیجنگ اسٹیٹسٹکس بیورو کے مطابق طلاقوں کی شرح میں سب سے زیادہ اضافہ ۵۰ سال سے کم عمر والوں میں ہوا ہے۔ ۳۰ سے ۳۹ سال کی عمر والوں میں طلاق کا اندیشہ سب سے زیادہ ہوتا ہے جبکہ پانچ سال قبل زیادہ شادیاں ۴۰ سے ۵۹ سال کی عمر میں ٹوٹتی تھیں۔ راجدھانی بیجنگ (آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ) میں رشتۂ ازدواج میں خاصی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ غیر شادی شدہ رہنے والوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے لیکن نوجوان شادی کرنے میں تاخیر کرنے لگے ہیں۔ ۱۵ سال سے زائد عمر کے نوجوانوں میں 18,9 فیصدی نوجوان غیر شادی شدہ رہ جاتے ہیں۔ اس فیصدی میں ۱۹۹۱ء کے مقابلہ میں 3.23 فیصدی کی کمی ہوئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ بیجنگ میں معمر اشخاص کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ شنگھائی جو ملک کا صنعتی علاقہ ہے یہاں بھی طلاق کی شرح میں اضافہ ہوا ہے۔ شادی سے قبل پراپرٹی اگریمنٹ جو ترقی یافتہ ملکوں میں پہلے سے مقبول ہے اب شنگھائی کے امیر باشندوں میں بھی مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

۱۹۹۶ء سے متعلق سرکاری اعداد وشمار میں بتایا گیا کہ اس سال ملک میں 93,39,615 شادیاں ہوئیں اور 11,32,215 جوڑوں نے طلاقیں حاصل کیں۔ چین میں شادی کی شرح ہر ایک ہزار اشخاص پر 7.7 رہتی ہے۔ چینیوں کی اخلاقی زندگی میں جو تبدیلیاں آئیں ان کے نتیجہ میں بیرون از ازدواج جنسی تعلقات اور طلاقوں میں اضافہ ہوا۔ آل چائنا ویمنس فیڈریشن نے بتایا کہ ملک میں ایک چوتھائی طلاق کے کیس فریقین کی بدچلنی کی بنا پر ہوتے ہیں ''تیسرے فریق'' کی مداخلت طلاق کے بڑھتے ہوئے واقعات کا اہم سبب ہے!

بچوں پر مضر اثرات:

خاندان کے استحکام کے لئے بین الاقوامی کوششیں

والدین کے تعلقات میں کشیدگی اور طلاق وتفریق بچوں کی نشو ونما پر بڑے گہرے اور دور رس اثرات ڈالتی ہے خاندان کے ٹوٹ جانے (Break Up) سے بچوں کی صحت اور ان کی جذباتی زندگی بہت بری طرح متاثر ہوتی ہے اور اُن میں متعدد نفسیاتی الجھنیں پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ چسر رپورٹ میں بھی یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ''طلاق والدین کی موت سے بھی زیادہ بچوں کی نشو ونما کو متاثر کرتی ہے۔ طلاق یافتہ جوڑوں کے مشکل سے 25 فیصدی بچے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا بچپن پر مسرت رہا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ 75 فیصدی بچوں کی زندگی غارت ہوجاتی ہے اور وہ آئندہ زندگی میں متعدد پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں''۔ والدین کے پیار وشفقت، تعلیم وتربیت سے محروم ہونے کی وجہ سے گمراہی کے راستہ پر پڑ جاتے ہیں اور جرائم کے ارتکاب میں بھی ملوث ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر جوئسٹ مارٹینس (ماہر نفسیات Max Planck Institute) کا کہنا ہے کہ ''ایسے بچوں کا معاشرتی ڈیولپمنٹ تھم سا جاتا ہے اور ان میں جرائم کی شرح اُسی عمر کے دوسرے بچوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ سماجی تقاضوں سے مطابقت نہیں کر پاتے اور اپنے کو Maladjusted محسوس کرتے ہیں اور قانون شکنی کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ لڑکیاں دوسروں کے بہلاوے پھسلاوے میں آکر اپنی عصمت وعفت بھی کھو بیٹھتی ہیں''۔

خاندان کی اہمیت کی طرف دُنیا کے ملکوں کی توجہ منعطف کرانے کے لئے اقوام متحدہ نے ۱۹۹۴ء کو بین الاقوامی پیمانے پر خاندان کا سال International Year Of Family منایا اور ''دنیا کا مستقبل خاندان میں ہے''۔ "Family Is Where The Future Lives" کے موٹو (Motto) کو اپنایا۔ دنیا کے سو ملکوں نے معاشرہ کی بنیادی اکائی خاندان کی افادیت کو واضح کرنے کیلئے 1.7 ملین ڈالر کے پروجیکٹ بنائے تاکہ یورپ اور دوسرے مغربی ملکوں میں عوام کے شعور کو بیدار کیا جا سکے جہاں خاندان کا ادارہ ٹوٹتا (Disintegrate) جا رہا ہے۔ شادیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے اور طلاقوں

کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ شادی کے باہر پیدائشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ Single Motherhood زیادہ رائج ہوتا جارہا ہے۔ جہاں شادی کا ادارہ نسبتاً مضبوط بھی ہے وہاں بھی چونکہ ماں باپ دونوں کماتے ہیں اس لئے ٹی وی نے ماں (Mom) کی جگہ لے لی ہے جو بہرحال ایک آئیڈیل نعم البدل نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ تشدد اور جرائم سے بھرپور ان ٹی وی پروگراموں نے بہت سے نوجوانوں کو جرائم کے راستہ پر لگا دیا ہے۔

ایک آئیڈیل خاندان اپنے ممبروں کے جذباتی نشو ونما، اقتصادی اور مالی تحفظ کا ضامن ہوتا ہے پُر انتشار خاندان جہاں اقتصادی تحفظ اور جذباتی ہم آہنگی نہ ہو وہاں ایک ایسی نسل تیار ہوتی ہے جس کے شہری جذباتی انتشار کا شکار ہوتے ہیں جو انہیں غیر سماجی برتاؤ، تشدد اور جرم کے راستہ پر لے جاتا ہے۔ یونیسف کا کہنا ہے کہ مادی قدروں کا اپنایا جانا، روزگار کی تلاش میں دیہاتی علاقوں سے شہروں کی طرف مائیگریشن، بڑھتی ہوئی بے روزگاری نیز گرانی نے خود شہروں میں جرائم کی شرح میں زبردست اضافہ کردیا ہے۔ چائلڈ پراسٹی ٹیوشن نیز شہروں میں آوارہ پھرنے والے بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ یہ سب اُن سماجی بیماریوں (Social ills) کی نشاندہی کرتے ہیں جو خاندان کے ٹوٹنے سے پیدا ہورہے ہیں!

مغربی ملکوں میں ہر قسم کے بڑھتے ہوئے جرائم کا تجزیہ کرتے ہوئے ماہر عمرانیات ڈاکٹر ڈائن رسل (Dian Russell) نے کہا کہ اس کا بنیادی سبب فحش رسالوں کی بہتات، مخرب اخلاق عریاں ٹی۔ وی پروگرام جنسی فلمیں اور سب سے بڑھ کر خاندانی نظام کی تباہی میں مضمر ہے۔ فحش پروگرام اور گلی کی ہر نکڑ پر بکنے والے عریاں رسالوں سے جنسی طوفان اُبل رہا ہے اسے روکنے کے لئے محض قانون سازی کافی نہیں بلکہ ڈی ڈی ٹی چھڑکنے کے ساتھ ساتھ ان جوہڑوں کا پاٹنا بھی ضروری ہے۔''

باب ۱۱

جرائم وتشدّد

جرائم وتشدد دنیا کے تمام ملکوں میں خوفناک حد تک بڑھ گئے ہیں اور برابر تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں اور ترقی وخوشحالی کے جو ثمرات حاصل ہوئے ان پر پانی پھیرتے چلے جارہے ہیں، حیرت وتاسف کی بات یہ ہے کہ جو ملک صنعتی اعتبار سے جتنے زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال ہیں وہیں جرائم کی شرح میں بھی تیزی سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایم۔ کے۔ سنگھ اپنی کتاب (۱) میں لکھتے ہیں: ''جو ملک صنعتی اعتبار سے جتنا زیادہ ترقی یافتہ ہے اتنا ہے وہاں جرائم کی شرح بھی بڑھی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جرائم اور ملک کی تکنالوجیکل۔ ثقافتی ترقی میں براہ راست تعلق ہے''۔

The more industrialised and developed is a country
the higher is the level of ciminianlity and vice versa.
It seems that the degree of criminality is directly linked
to the technological - cultural and economic
presperity of the nation.

اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ملان (Milan) میں منعقد ہونے والی ساتویں کانگریس برائے امتناع جرائم کی رپورٹ میں بھی بتایا گیا کہ ''جن ملکوں میں اقتصادی صنعتی ترقی ہوئی ہے وہاں جرائم کی شرح میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اس حقیقت کو پسماندہ ممالک کو ذہن نشین رکھنا چاہئے اور اپنے ترقیاتی منصوبوں میں ایسے حفاظتی اقدام کرنا

(۱) "Economic Development & Crime" pp 89 M.K. Singh

چاہئے جس سے جرائم کو قابو میں رکھا جا سکے۔ کانگریس کے ایک ترجمان نے بتایا کہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک بُری طرح جرائم کی زد میں آ گئے ہیں اور بہت سے ترقی پذیر ملکوں کا یہ افسوسناک تجربہ ہے کہ جو فوائد وہ ترقی کر کے حاصل کرتے ہیں وہ بے اطمینانی، معاشرتی عدم تحفظ اور جرائم سے ضائع ہو جاتے ہیں۔

عالمی دہشت زدگی، طیاروں کی ہائی جیکنگ، منظم جرائم سنڈیکٹس، اور بین الاقوامی وسعت رکھنے والے مافیا گروہوں نے جرائم کی نوعیت ہی کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب جرائم کا ارتکاب ایک پُرمنفعت کاروبار بن گیا ہے۔ نشیلی ادویات کی اسمگلنگ، جنسی استحصال کے لئے عورتوں اور کمسن بچیوں کا اغوا، بنکوں پر ڈاکے، دھوکہ دھڑی اور جعل سازی، کاروں کی چوریاں، اور شاطرانہ انداز سے منظم کی گئی اونچی چوریاں اور مجرموں کو ارباب اقتدار و سیاست سے حاصل پشت پناہی۔ ان تمام اُمور نے جرائم کے مسئلہ کو انتہائی سنگین و نازک بنا دیا ہے۔ گلوبل کرائمس اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ۱۳۸ ملکوں کے بین الاقوامی پولیس ادارہ (INTERPOL) کو اپنے اسٹاف میں برابر اضافہ کرنا پڑ رہا ہے اور اپنے کو جدید ترین آلات و اسلحہ جات سے لیس کرنا پڑ رہا ہے یہ اپنا ہیڈ کوارٹر پیرس سے ہٹا کر Lyons میں لے آیا ہے جہاں Million 17 پاؤنڈ کی ایک زبردست عمارت کو سیکورٹی کے جدید ترین آلات اور الکٹرانک Devices سے محفوظ ترین بنانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ انٹرپول کا اسٹاف 280 افراد پر مشتمل ہے لیکن اس کا کل سالانہ بجٹ صرف Million 9 پاؤنڈ ہے۔ جو لاکھوں بلین ڈالر کے جرائم کی پکڑ دھکڑ کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ یہ اپنے بجٹ کا ۳۰ فیصدی اقتصادی جرائم اور دھوکا دھڑی، ۳۰ فیصدی نشیلی ادویات کی اسمگلنگ اور ۱۱ فیصدی دہشت گردی کے جرائم کی تفتیش پر خرچ کرتا ہے۔ ۱۹۸۴ء کے بعد سیاسی طور سے Motivetsd جرائم کی تفتیش بھی اس ادارہ کو سونپی جانے لگیں۔ انٹرپول (Interpol) کے ایک افسر نے بتایا کہ اقتصادی جرائم دنیا کے سب ہی ملکوں میں جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں وہ بہت سے ملکوں کی اقتصادی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دیں گے۔ غیر قانونی طور سے حاصل شدہ دولت Laundering کے بعد (جس کا تخمینہ دنیا کی گراس ڈومسٹک پروڈکٹ کا دو سے پانچ فیصدی تک کیا گیا ہے) دنیا کے مختلف بنکوں میں خفیہ طریقوں سے Money جمع کر دیا جاتا ہے۔ وسط ۱۹۷۰ء سے

وسط ۱۹۸۰ء کے دہے میں رپورٹ کئے جانے والے جرائم میں پانچ فیصدی سالانہ کی در سے اضافہ ہوا جو آبادی کے اضافہ سے بھی زائد تھا۔ بہت سے ممالک نے جرائم کی نوعیت میں بڑے پیچیدہ رجحانات کی نشاندہی کی ہے۔ امریکا میں ہر سال بیس لاکھ افراد تشدد انہ جرائم کا نشانہ بنتے ہیں۔ برازیل میں ہر روز چار بچوں کا قتل ہوتا ہے جہاں کمسنوں کے قتل میں ۱۹۹۲ء میں ۴۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ صنعتی ملکوں سے ہر سال ایک لاکھ تیس ہزار ریپ کے واقعات رپورٹ کئے جاتے ہیں۔ منیلا (فلپائن) کو Murder City of Asia کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر ایک لاکھ افراد پر 30.5 قتل ہوتے ہیں جبکہ بنگ کاک میں 7.6 کراچی میں 5.7 ڈھاکہ میں 2.4، شنگھائی میں 2.3 اور کلکتہ میں 1.1 قتل ہوتے ہیں۔

نیپلس (Naples) میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں سب ہی ملکوں نے یہ طے کیا کہ ایسے جرائم کی تفتیش میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تا کہ منی لانڈرنگ پر بندش لگائی جا سکے۔ ویسے نیپلس کو یورپ میں جرائم کی راجدھانی کہا جاتا ہے۔ روم اور ملان کے بعد اٹلی کے اس تیسرے شہر میں ہر ایک لاکھ اشخاص پر 3.4 قتل ہوتے ہیں یہ شرح براعظم یورپ میں سب سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ کاروں کی چوریوں کی شرح ایک لاکھ اشخاص پر 1312 ہے یہ شرح نیویارک سے بھی بڑھی ہوئی ہے جہاں کی شرح 1300 ہے۔ مقامی مافیا Camorra کے نام سے جانا جاتا ہے جس سے سات ہزار افراد وابستہ ہیں اس کے علاوہ 76 اور دوسرے Clans ہیں جو آپس میں بھی مڈبھیڑ کرتے رہتے ہیں۔ صرف نیپلس میں 50Clans ہیں جن سے پانچ ہزار افراد وابستہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں جعل سازی، فراڈ اور کرپشن جیسی کارگزاریوں کو باعزت Respectable سمجھا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو معاشرہ میں عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

White Collor Crimes Enioy A Kind Of Social Sanction اور اُن کے ان سیاہ کارناموں کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ معاشرہ کی اس روش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے منظم مجرموں کے گروہ اب بڑی تعداد میں سفید پوش جرائم کی طرف راغب ہو گئے ہیں۔ جہاں جعلی کرنسی، جعلی دستاویزیں اور جعلی ٹریولرس چیک بنانے کا کام بڑی مہارت سے انجام دیا جاتا ہے (۱)۔ مارٹیمر لکھتے ہیں کہ ''جرم بھی اب دوسری

(۱) جعل سازی اتنے وسیع پیمانے پر کی جانے لگی ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت سے ملکوں نے اپنی کرنسی چھاپنے میں Magnetic Ink کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

انٹر پرائزز کی طرح فلک بوس عالی شان عمارتوں کے ٹھاٹھ دار دفتروں سے سرانجام پاتے ہیں۔''

"Crime Linke Other Great Enterprises Functions From
Skyscrapper Offices And Swank Hotel Suits.

ایڈگر ہور کا کہنا ہے کہ ''آج جرائم پر کوئی ایسا لیبل نہیں ہے جہاں اُسے ایمانداری سے علیحدہ کیا جا سکے''۔

"Present Day Crime No Longer Bears
A Label To Seperate It From Honesty.

امریکا ایک ٹکنگ کرائم بم

انفلیشن (Inflation) کے بعد خون خرابے سے بھرپور جرائم امریکا کا سب سے بڑا سنگین داخلی مسئلہ بن گیا ہے۔ گن کلچر پوری طرح حاوی ہو گیا ہے اور تشدد کے واقعات کثرت سے بڑھ رہے ہیں۔ بہیمانہ جرائم ۱۰-۱۲ سال کے نوجوانوں کے ذریعہ بڑی مہارت سے کئے جا رہے ہیں اور بڑے شہروں کے علاوہ اب مضافات میں بھی جرائم تیزی سے بڑھ رہے ہیں جہاں کچھ ہی عرصہ قبل تالے بھی نہیں لگائے جاتے تھے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۲ء کے درمیان قتل میں ماخوذ کمسن مجرموں کی تعداد بڑھ کر 14,296 ہو گئی۔ ہینڈ گن اب نوجوانوں کا پسندیدہ ہتھیار ہے۔ ۱۹۹۲ء میں قتل کی جو وارداتیں ہوئیں ان میں 55,496 کیسس میں ہینڈ گن استعمال کی گئی۔ نوجوان اب آپس میں یہ کہتے ہیں کہ جب ہر شخص کے پاس ہینڈ گن ہے تو ہم کیوں نہ رکھیں؟ گن کنٹرول ہر سیاسی مدبر کے ایجنڈا میں ہے لوگ ناراض ہیں کہ حکومت کی طرف سے سخت اقدام کیوں نہیں کئے جاتے اور عوام کے دشمن اس (۱) نمبر ایک کے ہتھیار پر آخر پابندی کیوں نہیں لگائی جاتی؟ پہلے سخت سزائیں لوگوں کو جرم سے باز رکھتی تھیں لیکن اب امریکیوں کی اکثریت اس پر شک کرنے لگی ہے اکثریت کو یقین ہو گیا ہے کہ پولیس اپنے فرائض ٹھیک سے انجام نہیں دے رہی

(۱) مہلک ہتھیاروں کے استعمال پر معقول اور سخت پابندیاں عائد کرنے پر امریکا میں عرصہ سے غور وخوض ہو رہا ہے لیکن گن لابی ہر ایسی کوشش کو ناکام بناتی رہی ہے۔ ملیٹری کے اسٹائل کے اسلحہ جات سویلین کے پاس بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر نومبر ۹۳ء میں امریکی سینٹ نے ۱۱۹ ایسے ہتھیاروں پر بندش عائد کرنے کا مسودہ قانون پاس کیا۔

ہے اور انہیں ملک کے قانونی نظام پر اعتماد نہیں رہ گیا ہے۔ سینٹر موئن ہان (Moynihan) نے سماجی اداروں میں انحطاط اور خاندان کے انتشار پر اظہار تاسف کیا۔ جج Torres نے جرائم کے معاملہ میں معاشرہ میں پائی جانے والی بے حسی کا بھی شکوہ کیا اور کہا کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں حقوق کی پامالی اور ناجائز دست اندازی کا احساس فنا ہو جائے بہت جلد زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

"A Society That Loses Its Sense Of Outrage
Is Doomed To Extinction"

امریکا کے ماحول پر تشدد پوری طرح چھا گیا ہے۔ ہتھیاروں کی خریداری کے لئے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ میسوچسٹس کے ایک جج نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجرموں اور سویلین آبادی کے درمیان سول وار چھڑی ہے ہر روز اوسطاً 29 امریکی ہینڈ گن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۹۴ء کے ایک تازہ جائزے میں بتایا گیا کہ امریکا میں بندوق سے مرنے والوں کی تعداد۔ قتل، خودکشی اور حادثات، سب سے زیادہ ہے۔ یہاں فی ایک لاکھ آبادی پر 14.24 موتیں بندوق سے واقع ہوتی ہیں جبکہ جاپان میں یہ شرح سب سے کم 05. ہے۔ بندوق کا آسانی سے فراہم ہو جانا اور معاشرہ میں تشدد کا تسلیم کیا جانا اس کا اہم سبب ہے۔ امریکا میں ہی ہر سال کروڑوں ڈالر امراض کے نئے طریق علاج کی دریافت اور انسانی زندگی کی توسیع کی تحقیقات پر صرف کئے جاتے ہیں لیکن وہ خود اپنے شہریوں کو سب سے مہلک اسلحہ۔ ہینڈ گن۔ سے بچانے کی کوئی تدبیر نہیں کر پاتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کے شروع سے لے کر ۱۹۸۰ء تک ۸۰ لاکھ امریکی مجرموں کی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو چکے ہیں۔

ہر دو گھنٹہ پر اوسطاً ایک امریکی بچہ گن سے ہلاک ہوتا ہے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۱ء تک پچاس ہزار امریکی بچے آتشیں ہتھیاروں سے ہلاک ہوئے (تقریباً اتنے ہی بچے ویٹ نام کی جنگ میں ہلاک ہوئے تھے) امریکی نوجوان بے روزگاری اور صحت کی دیکھ بھال سے بھی زیادہ بڑھتے ہوئے جرائم سے فکرمند رہتے ہیں۔ دنیا کا یہ سب سے خوشحال اور امیر ملک جو اپنی زبردست فوجی اور نیوکلیائی طاقت کا سکہ ساری دنیا پر جمائے ہوئے ہے خود اپنے ملک میں بڑھتے ہوئے جرائم کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں

بلکہ اپنے ملک کی بہت سی معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے پر بھی قادر نہیں ہو پا رہا ہے جس کی وجہ سے بہت سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

امریکا کی غیر سرکاری کرائم کونسل نے اپنی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا کہ سرکاری ادارہ ایف بی آئی کی رپورٹ جو محکمۂ پولیس کے اعداد و شمار کی بنیاد پر تیار کی جاتی ہے ملک میں جرائم کی صحیح صورتحال کی عکاسی نہیں کرتی۔ سرکاری رپورٹیں صرف جرم کا شکار ہونے والے Victims کے سروے سے تیار کی جاتی ہیں جب کہ ہر قسم کے جرائم۔ قتل عمد، حملہ مجرمانہ، تشددانہ، زدوکوب، ریپ، ڈکیتی اور نقب زنی کے واقعات اس سے پانچ چھ گنا زیادہ ہوتے ہیں جتنے کہ رپورٹ میں بتائے جاتے ہیں۔ ان ماہرین کا کہنا ہے کہ امریکا میں تشددانہ جرم کا شکار ہونے کے امکانات اس سے زیادہ ہیں جتنے کہ موٹر کار کے حادثہ میں زخمی ہوجانے سے۔ امریکا میں ہر ایک ہزار بالغ افراد میں 22 کار کے حادثہ میں زخمی ہوتے ہیں جبکہ 55.5 افراد تشددانہ جرم کا شکار ہوتے ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ جرم کرنے والوں کی اوسط عمر اب کم ہوتی جا رہی ہے اور سب سے زیادہ قتل نوجوانوں کے گروہوں کے ذریعہ کئے جا رہے ہیں یہ صحیح نہیں کہ اب قتل زیادہ تر انجان لوگوں کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ اس کونسل نے مجرموں کو زیادہ سخت سزائیں دیئے جانے کی بھی مانگ کی اور زیادہ جیل خانوں کی تعمیر کرانے کی بھی تجویز رکھی اور کانگریس میں ری پبلکن کے ذریعہ اسلحہ جات پر پابندی لگانے کی مخالفت کرنے سے بھی اتفاق نہیں کیا۔ کونسل کی یقینی رائے ہے کہ ایسے اسلحہ جات کے رکھنے اور ان کے استعمال پر بندش عائد کی جانا چاہئے۔

اس حقیقت کو ذہن نشین رکھئے کہ سرکاری رپورٹوں میں اعداد و شمار صحیح صورتحال کی عکاسی نہیں کرتے محکمہ انصاف کی ہی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ اگر امریکا میں موجودہ شرح جرائم برقرار رہی تو ہر چھ افراد میں پانچ۔ یعنی آج ۱۲ سال کی عمر کے شہریوں میں 83 فیصدی باشندے اپنی آئندہ زندگی میں کسی نہ کسی تشددانہ جرم کا شکار ہوں گے جن میں نصف ایک سے زیادہ بار Victim ہوں گے۔ اسی رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ امریکا میں سیاہ فام نسل کے باشندے جرائم سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں دوسرے امریکیوں کے مقابلہ میں ان کے قتل کے چودہ گنے قوی امکانات تھے۔ سیاہ فام نسل کے ۱۲ سے ۲۴ سال کے نوجوانوں میں قتل انسان (Homicide) کی شرح فی ایک لاکھ آبادی

پر 114.9 تھی بلکہ دوسرے امریکیوں میں یہ شرح 8.5 تھی۔ ۲۴ سال سے زیادہ عمر کے مرد سیاہ فاموں کی قتل انسان کی شرح فی ایک لاکھ آبادی پر 67.5 تھی جبکہ عام امریکیوں میں یہ شرح 7.8 فیصدی تھی۔ حالانکہ سیاہ فام نسل کے باشندے کل آبادی کا 1.3 فیصدی ہیں لیکن قتل انسان کا Victim ہونے میں ان کا تناسب 17.7 فیصدی رہا (۱)۔

مجرموں کی گرفت میں انگلیوں کے نشانات کافی اہم رول ادا کرتے ہیں، چنانچہ یو ایس فیڈرل ایجنسی کے پاس 200 ملین انگلیوں کے نشانات ہیں جس میں 29 ملین مشتبہ مجرموں کے ہیں۔ جدید ترین تحقیقات سے مجرموں کے خاندانی پس منظر سے حاصل شدہ Genetic Characterstics پائی گئی ہیں لہٰذا Biotechnology کی مدد سے مجرموں کے Heridity Substance کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا جا رہا ہے تاکہ مجرموں کی شناخت آسانی سے کی جاسکے۔

امریکی محکمہ انصاف کے بیورو آف اسٹیٹکس (Bureau Of Statisics) نے پچاس ہزار امریکی گھرانوں کے ایک لاکھ سے زائد افراد کا سروے ۱۹۹۳ء میں کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ ۱۲ سے ۱۵ سال کی عمر کے ٹین ایجرس کے جرائم کا شکار ہونے کے امکانات ہر آٹھ میں ایک ہیں (1:8) جب کہ سینئر شہریوں (۶۵ سال سے اوپر کی عمر والوں) میں 179 افراد پر ایک کو جرم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ دیہی علاقے نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں۔ شہر میں رہنے والوں کے موٹروں کی چوری کے امکانات پانچ گنے زائد ہوتے ہیں بہ نسبت دیہات کے رہنے والوں کے اور شہریوں پر حملہ مجرمانہ کے امکانات بھی تین گنا زائد ہوتے ہیں (۲)۔

بڑے شہروں کا حال زار

دنیا کے تمام شہروں میں نیویارک کی شرح جرائم سب سے زیادہ ہے۔ ایف بی آئی نے اعتراف کیا کہ اسے دُنیا کے جرائم کی راجدھانی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں کے مجرموں نے محسوس کرلیا ہے کہ بلیو کالر جرائم، بزنس ریکٹ وغیرہ کے مقابلہ میں وہائٹ کالر جرائم میں دولت اکٹھا کرنے کے امکانات کہیں زائد ہیں۔ اس لئے اب وہ انشورنس،

(۱) ٹائمز آف انڈیا 10.12.94

(۲) ٹائمز آف انڈیا 2.6.1995

ٹیلیفون کارڈس، دستاویز کی جعل سازی وغیرہ کی طرف زیادہ دھیان دینے لگے ہیں۔ Mobsters نے اپنی توجہ کا مرکز ایسی کارگزاریوں کو بنایا ہے۔ Bruce Ritter (صدر کووینٹ ہاؤس) نے ٹائمس اسکوائر کو ''دوزخ کی ایک سڑک بتایا''۔

It Is A Street Right Out Of Hell اور ایک مضمون میں لکھا کہ ''یہ بدمعاشی سکھانے کا دنیا کا سب سے بڑا کلاس روم ہے۔ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں جو یہاں نہ پائی جاتی ہو۔ آپ نو دس سال کے بچے کو دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان سے لاکر یہاں چھوڑ دیجئے اور ایک سال یہاں رہنے دیجئے وہ کبھی سدھر نہ سکے گا۔'' ایک ماں نے اسے ''گناہ کا مینار'' Tower Of Sin بتایا۔

نیویارک میں رہنے کا مطلب ہے جرائم کے درمیان رہنا یہاں مکان ڈھونڈتے وقت سب سے پہلے لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ پڑوس کتنا محفوظ ہے، ہر مکان کے صدر دروازے پر تین تالے لازمی ہیں، ٹورسٹ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ شہر میں گھومنے کے وقت بھڑکیلے زیورات وقیمتی گھڑیاں نہ پہنیں، اگر مگرس (Muggers) کا سامنا ہو جائے تو کچھ دے کر چھٹکارا حاصل کریں کیونکہ حملہ آور اپنے شکار کو خالی پاکر غصہ میں مارتے پیٹتے یا چھرا بھونک دیتے ہیں۔ گرہ کٹوں کی ٹریننگ کے لئے باقاعدہ اسکول ہیں۔ پولیس کے ریکارڈ میں ۵۰ ہزار سے زیادہ گرہ کٹوں کے فوٹو ہیں۔ سب ویز (Subways) سے گزرنے والے اشخاص عام طور پر جرم کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن نیویارک اور پیرس کے سب ویز زیادہ خطرناک مانے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جاپان اور روس کے 'سب ویز' جرائم سے تقریباً مبرّا رہتے ہیں۔ روس میں سب ویز کے نیچے تقریباً ڈھائی بلین افراد زندگی گزارتے ہیں جبکہ نیویارک میں صرف ایک بلین لیکن یہاں ایک ایک سال میں ۶ ہزار ڈکیتیاں ہوتی ہیں جبکہ لندن کے سب ویز میں صرف چھ سو!

ایک یورپین مصنف رولف ونز نے لکھا کہ واشنگٹن میں آفتاب غروب ہوتے ہی ایسا لگتا ہے جیسے یہ شہر بھوتوں کا مسکن ہو۔ یہاں کے شہری بڑھتے ہوئے جرائم سے بےحد خوف زدہ ہیں اور اپنے بچوں کے تحفظ کے لئے فکرمند رہتے ہیں۔ ایک مراسلہ نگار نے ''واشنگٹن پوسٹ'' میں لکھا ''کہ پولیس اب اسے کنٹرول نہیں کرسکتی ہے ضرورت فوج کو طلب کرنے کی ہے''۔ اسکولوں میں بھی تشدد کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ ہر بڑے شہر

میں قتل عمد کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ فی ایک لاکھ آبادی پر کولمبیا میں قتل کی شرح 59.4 ڈیٹرائٹ میں 58 اور ڈلاس میں 36.5 ہے۔ ۱۹۸۷ء میں نیویارک میں ۶ لاکھ ۵۶ ہزار سنگین جرائم کا ارتکاب ہوا جو سال گزشتہ سے ۲۰ ہزار زائد تھے۔ ۱۹۸۸ء میں واشنگٹن میں ۳۷۲ قتل ہوئے۔

قتل عمد: امریکا میں قتل کی شرح دنیا کے سب ملکوں سے زیادہ ہے وہاں ہر ہفتہ 450 قتل ہو جاتے ہیں (۱)۔ ۱۹۶۷ء میں جب پھانسی کی سزا پر سپریم کورٹ نے پابندی عائد کردی تھی وہاں 12,090 قتل ہوئے تھے اس کے بعد قتل کے واقعات بڑھنے لگے اور ۱۹۷۶ء میں 18,780 قتل ہوئے قتل کی وارداتوں میں اتنا زیادہ اضافہ دیکھ کر وہاں 66 فیصدی افراد قتل عمد کے لئے پھانسی کی سزا دیئے جانے کی حمایت میں ہو گئے (۲) چنانچہ سپریم کورٹ نے پھانسی کی سزا پھر سے بحال کردی اس کے بعد بھی قتل کی وارداتیں بڑھتی گئیں اور ۱۹۷۹ء میں 21,460 افراد کا قتل ہوا۔ انڈیانا پولیس کے اٹارنی Rev Stovall نے کہا کہ ''موجودہ شہریوں کے لئے جو تشددانہ جرائم سے عاجز آگئے ہیں پھانسی کی سزا انتہائی یقینی اور ضروری تدبیر بن گئی ہے اور وہی اس کی ضمانت ہے کہ لوگوں کو انصاف ملے گا''۔ اب امریکا میں ہر ۲۴ سیکنڈ پر ایک تشددانہ جرم کا ارتکاب کیا جاتا ہے، ہر ۲۳ منٹ پر ایک قتل اور ہر چھ منٹ پر ایک ریپ کا واقعہ ہوتا ہے۔

ریپ: امریکا کے محکمہ انصاف نے عورتوں پر ہونے والے حملہ مجرمانہ (Sexual Assault) اور ریپ کے تازہ ترین (1995) اعداد فراہم کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ: (۳)

☆ امریکا میں ہر سال پانچ لاکھ عورتوں پر حملہ مجرمانہ Violent Attacks کئے جاتے ہیں اور

☆ ایک لاکھ ستر ہزار ریپ اور ایک لاکھ چالیس ہزار ریپ کی کوشش کرنے کے

(۱) ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۸ء تک ستر افراد کو پھانسی دی گئی اور ۱۹۰۰ مقدمات زیر سماعت تھے۔

(۲) ۱۹۵۷ء میں ۶۵ لوگوں کو پھانسی کی سزا دی گئی تھیں۔ ۱۹۹۷ء کے ابتدائی ۹ ماہ میں ہی ۵۷ لوگوں کو سزائے موت دی گئی، اس طرح ۱۹۵۷ء کے بعد ایک سال میں سب سے زیادہ پھانسی دیئے جانے کے واقعات ہوئے۔

(۳) ٹائمز آف انڈیا۔ 20.8.95

واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

☆ ۱۹۹۱ء کے مقابلہ میں یہ اعداد بہت زیادہ ہیں جب ایک لاکھ ۳۳ ہزار ریپ اور ریپ کی کوشش کے واقعات درج کرائے گئے تھے۔

☆ ریپ وحملہ مجرمانہ کے ۲۶ فیصدی واقعات ایسے اشخاص کے ذریعہ کئے جاتے ہیں جو ان عورتوں سے پہلے سے واقف ہوتے ہیں۔ ۵۴ فیصدی واقعات واقف کاروں کے ذریعہ ۳ فیصدی رشتہ داروں کے ذریعہ اور ۱۸ فیصدی اجنبی اشخاص کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔

☆ امریکا میں فی لاکھ آبادی پر ریپ کی شرح ۱۹۷۱ء میں 20.5 تھی جو ۱۹۷۸ء میں بڑھ کر 30.8 ہوگئی۔

جرنل آف کلینکل سائکالوجی میں Mary Koss نے اپنی ایک تحقیق شائع کی جس میں انہوں نے بتایا کہ امریکا کے کالجوں کی ۲۸ فیصدی لڑکیاں ۱۴ سال کی عمر سے ریپ یا ریپ کی کوشش کا شکار ہو چکتی ہیں۔

امریکا میں قتل اور ریپ کی شرح یورپ کے ہر ملک سے زیادہ ہے، فرانس سے بھی زیادہ اور برطانیہ سے تو بہت زیادہ۔ آج امریکا میں عورت کی عصمت غیر محفوظ ترین ہوگئی ہے۔ شکاگو، لاس انجلز وغیرہ کئی شہروں میں دن کے وقت بھی عورتیں گھر سے باہر تنہا نکلنے کی جرأت نہیں کرتیں اور بہت سی عورتیں چھوٹے ریوالور وآنسو آور انگوٹھیاں پہنے رہتی ہیں تاکہ حملہ آوروں کی زد سے اپنے کو بچاسکیں۔ اس گھناؤنے جرم کے اکثر مجرم بہ ظاہر بڑی صاف ستھری زندگی رکھنے والے معزز شہری ہوتے ہیں جو معاشرہ میں عزت و وجاہت رکھتے ہیں۔

دوسرے جرائم: قتل اور ریپ کے علاوہ ڈاکہ زنی، جعل سازی، کاروں اور سامان کی چوری دوسرے جرائم ہیں جن کی تفصیلات بڑی حیرتناک ہیں۔ مال واسباب کی چوریوں سے ۱۶ بلین ڈالر، فراڈ اور جعل سازی سے ۲۰ ہزار بلین ڈالر، ٹرکوں کی ہیجکنگ سے چھ ہزار بلین ڈالر، اور جوئے سے ۲۲ بلین ڈالر کا خسارہ ہر سال ہوتا ہے۔ منظم جرائم سے مجرموں کو ہر سال ۶۵ بلین ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے، جو امریکا میں جرائم کی Life Line کہا جاتا ہے۔ جوا (Gambling) امریکا کی انڈر گراؤنڈ بلیک منی اکانومی کا تخمینہ ۱۹۸۱ء میں

ہندوستان کی قومی آمدنی سے تین گنا زیادہ بتایا گیا تھا جس میں ایک تہائی آمدنی حسب ذیل ذرائع سے حاصل ہوتی تھی۔ ("INDIA TODAY" 15.5.82)

ڈرگس کی اسمگلنگ سے	۲۷ ہزار کروڑ روپے
چوری کے مال سے	۱۶ ہزار کروڑ روپے
فراڈ سے	۹ ہزار کروڑ روپے
پورنوگرافی سے	۵ ہزار کروڑ روپے

امریکا میں ۱۹۹۲ء کے دوران مختلف الزامات کے تحت ایک کروڑ چالیس لاکھ ۷۵ ہزار افراد کو گرفتار کیا گیا، کچھ گرفتار کئے جانے والوں کی تفصیل ذیل کے نقشہ میں پیش ہے: (قومی آواز 21.1.95)

نوعیت جرم	گرفتاریوں کی تعداد	
	ہزار	لاکھ
۱۔ جائیداد میں جعل سازی	-	۲۱
۲۔ منشیات استعمال کرنے میں	۶۰	۱۰
۳۔ اخلاقی جرائم	۵۰	۷
۴۔ فراڈ کرنے کے سلسلہ میں	۲۵	۴
۵۔ غنڈہ گردی میں	۲۵	۳
۶۔ کاروں کی چوری	-	۲
۷۔ پرس راہ گیروں سے چھیننے میں	۸۰	۱
۸۔ ڈاکہ زنی میں	۷۵	۱
۹۔ زنا بالجبر میں	۳۹	-
۱۰۔ قتل عمد میں	۲۲.۵	-
۱۱۔ جوئے بازی میں	۱۷	-
۱۲۔ لوفربازی میں	۱۳	-

امریکی کانگریس کی متعدد تحقیقاتی کمیٹیوں سے اس امر کا انکشاف ہو چکا ہے کہ ملک بھر میں ایسے سنڈیکٹس کا جال پھیلا ہوا ہے جو 'کوسانوسٹرا' کے نام سے مشہور ہیں ان کے ذریعہ ناجائز دولت سوئزرلینڈ کے بنکوں کے کھاتوں میں منتقل کردی جاتی ہے۔ یہ دولت عالمی دہشت گردی، حکومتوں کے تختے پلٹنے اور ناپسندیدہ اشخاص کا صفایا کرنے میں استعمال کی جاتی ہے۔

امریکا میں جرائم کا گراف برابر اونچا ہوتا جارہا ہے، اس کا اندازہ امریکا کے جیلوں میں قیدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ محکمۂ انصاف کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء کے درمیان امریکا کے جیلوں میں رہنے والے قیدیوں کی تعداد میں ۴۳ فیصدی کا اضافہ ہوا اور اس کے لئے دوسو نئے جیل تعمیر کرانا پڑے۔ قیدیوں کی تعداد سات لاکھ ۱۵ ہزار سے بڑھ کر دس لاکھ ۲۰ ہزار ہوگئی۔ (۱) اسی مدت میں ۴۳ پرائیوٹ جیل بھی تعمیر ہوئے لیکن پھر بھی جیلوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ کو کم نہ کیا جاسکا، اسی محکمہ کی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۳۰/ جون ۱۹۹۷ء کو قیدیوں کی تعداد دس لاکھ ستر ہزار ہوگئی۔ ایک سال کے عرصہ میں ۹۶ ہزار قیدیوں کا اضافہ ہوا اور کمسن مجرموں کی تعداد 9,100 بتائی گئی (۲)

ملک کے پانچ بڑے شہروں میں قیدیوں کی تعداد یہ تھی:

کیلیفورنیا	1,09,496
نیویارک	61,736
ٹیکساس	61,178
فلوریڈا	48,302
اوہیو	38,378

امریکا میں نیشنل رائفل ایسوسی ایشن نے اتنی زبردست لابی بنا رکھی ہے کہ وہ کسی طرح بھی اسلحہ جات پر پابندیاں عائد نہیں ہونے دیتی۔ آتشیں اسلحہ جات کے بڑھتے ہوئے تشدد سے عاجز آکر امریکی ماؤں نے مئی ۲۰۰۰ء میں Mothers' Day کے موقعہ

(۱) ۱۹۸۶ء میں یہ تعداد پانچ لاکھ ۲۹ ہزار تھی۔
(۲) ٹائمز آف انڈیا 21.1.98 - 11.8.97

پر Million Mom March منایا۔ اس دن دارالسلطنت واشنگٹن اور دوسرے بیس بڑے شہروں میں اس پُرقوت لابی کے خلاف احتجاج کیا۔ ترجمان نے بتایا کہ یہ مسئلہ امریکی ماؤں کے لئے انتہائی کرب واذیت کا بن گیا ہے کیونکہ ۱۹ سال سے کم عمر کے تقریباً ۱۲ بچے ہر روز بندوق کے نشانے کا شکار ہوکر ہلاک ہوجاتے ہیں۔ یہ احتجاجی جلوس امریکا کی تاریخ میں اب تک کا سب سے بڑا جلوس تھا جس پر دس لاکھ ڈالر کے مصارف ہوئے۔ اس جلوس کے ذریعہ حکومت سے مانگ کی گئی کہ ہینڈگن پر لائسنس لازمی قرار دیا جائے اور اسلحہ جات کے کنٹرول کیلئے سخت قوانین وضع کئے جائیں اور سختی کے ساتھ ان کا نفاذ کرایا جائے۔

نیشنل رائفل ایسوسی ایشن نے اس جلوس کی مخالفت میں Armed Informed Mothers' March تیار کردیا جس نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ ملک میں بڑھتے ہوئے جرائم کو دیکھتے ہوئے ہر شہری کے لئے اسلحہ رکھنا ناگزیر ہوگیا ہے کیونکہ ہر ۱۳ سکینڈ پر کسی نہ کسی امریکی شہری کو اپنے بچاؤ کے لئے حملہ آور کو نشانہ بنانا پڑتا ہے۔

(TOI 4.5.2000)

امریکا میں خانگی جرائم اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ مجرموں کی پکڑ دھکڑ اور انہیں سزا دلانے کے لئے لاکھوں ڈالر کی ضرورت ہورہی ہے جو فیڈرل اور ریاستی حکومتیں مہیا کرنے میں ناکام ثابت ہورہی ہیں، اس کے علاوہ جرائم سے متاثر ہونے والے خاندانوں کو اقتصادی امداد اور سوشل سیکوریٹی کی سہولتیں دینے میں بھی حکومت پر بار برابر بڑھتا جارہا ہے۔ Cox نیوز سروس کا کہنا ہے کہ صرف قتل عمد کے مجرموں کی گرفت اور انہیں Convict کرانے کے لئے لاکھوں ڈالر کی ضرورت ہوگی اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری اگلی نسل ایسے گھناونے جرائم میں ملوث نہ ہو تو بچوں کی معقول ومناسب تعلیم وتربیت Prenatal Care اور جرائم کی روک تھام کے لئے بھی لاکھوں ڈالر کی ضرورت ہوگی۔ حال ہی میں امریکی سینٹ نے ۹۴-۱۹۹۳ء کے لئے 22.3 Billion ڈالر کا اینٹی کرائم بل پاس کیا جس میں نئے جیلوں کی تعمیر اور 8.9 Million ڈالر ایک لاکھ نئے پولیس افسران کی بھرتی کرکے ان کی تنخواہوں پر صرف کئے جائیں گے۔ ستمبر ۱۹۹۴ء میں صدر کلنٹن نے ایک سخت کرائم بل Tough Crime Bill پر دستخط کئے جس میں متعدد جرائم کے لئے موت کی سزا تجویز کی گئی ہے اور جرائم سے سختی سے نپٹنے کے لئے کئی اور تجاویز رکھی گئی ہیں تاکہ جرائم پر

قابو پایا جاسکے۔ امریکا میں ہی نیشنل رائفل ایسوسی ایشن نے ایسی زبردست لابی (Lobby) بنارکھی ہے جو کسی طرح سے بھی گن کنٹرول نہیں ہونے دینا چاہتے لیکن صدر موصوف نے اپنا مصمم ارادہ دہرایا کہ وہ ہر قیمت پر نوجوانوں کو جرائم سے باز رکھنا چاہتے ہیں! "Steer Youngesters Away From A Life Of Crime"

برطانیہ میں جرائم کی لہر

برطانوی ہوم آفس نے اعتراف کیا کہ جرائم نے اپنے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ۱۹۸۳ء میں تین ملین (۳۰ لاکھ) سنگین جرائم ریکارڈ کیئے گئے جس میں پُرتشدد حملہ، نقب زنی، جعل سازی اور چوری شامل ہے، ہر دس سیکنڈ پر ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا جاتا ہے، نقب زنی کے واقعات میں ایک سال کے اندر دس فیصدی کا اضافہ ہوکر آٹھ لاکھ واقعات ہوئے۔ مجرموں کی گرفت کے امکانات کم ہوتے جارہے ہیں صرف لندن شہر میں سنگین جرائم میں آٹھ فیصدی کا اضافہ ہوا، کل واقعات 6,31,328۔ لندن کی سڑکوں پر مگنگ میں ۱۷ فیصدی، نقب زنی میں ۱۲ فیصدی، حملہ مجرمانہ میں ۱۰ فیصدی اور ریپ کے حملے ۵۶ فیصدی بڑھے۔ کاروں کی چوریوں میں ۱۳ فیصدی اضافہ ہوا اب لندن کے باشندوں کے لئے کار کی چوری کے امکانات 1:40 ہوگئے ہیں۔ لندن کے پولیس کمشنر نے بتایا کہ نصف سے زیادہ مجرم ۲۱ سال سے کم عمر کے ہوتے ہیں اور گرفتاری کے وقت انہیں کوئی احساس ندامت نہیں ہوتا۔ پیٹر گلیڈسٹن کا کہنا ہے کہ ''گرہ کٹ ویلٹ اور پرسوں سے کروڑوں پونڈ کی رقمیں اڑالے جاتے ہیں۔ پبلک ٹیلیفون اور پوسٹ آفس Vandalism کا شکار ہوتے ہیں اور پانچ ہزار پونڈ کا خسارہ ہر سال اٹھاتے ہیں۔ شاپ لفٹنگ بڑے پیانے پر جاری رہتی ہے اور دولاکھ پاؤنڈ کی مالیت کا سامان چوری ہوجاتا ہے اور اتنی ہی رقم گرہ کٹوں کو صرف ویسٹ اینڈ کے علاقے سے جیب کتری سے مل جاتی ہے(۱)۔

ریڈرس ڈائجسٹ نے لکھا کہ جرائم خوفناک حد تک بڑھ چکے ہیں اور خوفناک ترین پہلو یہ ہے کہ مجرموں کی بہت بڑی تعداد نوجوان طبقہ کی ہے۔ ہوم آفس کی رپورٹ میں بھی یہ تسلیم کیا گیا کہ کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد جرائم میں زیادہ ملوث ہوتی جارہی

(۱) CRIME EXPLOSION : Peter Gladstone Smith

ہے اور اس کی خاص وجہ خاندان کے ڈسپلن کا کمزور ہوجانا ہے۔ جرائم میں تیزی سے اضافہ ٹیڈی بوائز کے سبب سے ۱۹۵۴ء سے شروع ہوگیا اور اب جرائم میں حصہ لینے والوں کی اوسط عمر کم ہوکر ۲۰ سال تک پہنچ گئی۔

۱۹۸۶ء کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ لندن میں مگنگ، ڈکیتی نیز جنسی حملوں میں تیزی سے اضافہ ہوا مجموعی طور پر جرائم میں ۶ فیصدی کا اضافہ رہا لیکن مگنگ میں ۱۷ فیصدی ڈکیتیوں میں ۱۲ فیصدی اور جنسی جرائم میں ۱۰ فیصدی اضافہ رہا۔ دوتہائی سے زیادہ عورتیں رات میں حملہ مجرمانہ کے خوف سے گھروں سے باہر نہیں نکلتیں ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کی ۷۰ فیصدی عورتوں کو یہ گھبراہٹ رہتی ہے کہ وہ زنا بالجبر کا شکار بنائی جائیں گی اور سب ہی عورتیں یہ تسلیم کرتی ہیں کہ انہیں اور بچیوں کو یہی سب سے بڑا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

جے. ڈی. اختر ''مکتوب لندن'' میں لکھتے ہیں کہ ''برطانوی باشندے بھیانک تشدد کے دور سے گزر رہے ہیں جرائم اور دن دہاڑے ڈکیتیاں ہورہی ہیں اور پولیس اپنے کو ناکام پارہی ہے۔ افراد کے خلاف جرائم بڑھتے جارہے ہیں اور خاص کر قتل عمد کے واقعات۔ ۱۹۷۳ء میں ایک لاکھ ۳۲ ہزار قتل ہوئے جو ۱۹۷۶ء میں بڑھ کر دولاکھ ۶۶ ہزار ہوگئے۔ حالانکہ Opinionpoll یہ بتاتے ہیں کہ عوام سزائے موت کی موافقت میں ہیں لیکن ہاؤس آف کامنس نے گزشتہ بائیس سال میں ۱۹ بار قتل کے لئے سزائے موت بحال کرنے کی تجویز مسترد کردی۔(۱) حالانکہ برطانوی پارلیمنٹ کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ملکہ الزبتھ نے بھی اعتراف کیا کہ ''ملک میں تشدد جرائم تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں۔''

Government was specially concerned at the continued growth in the manifestation of violence.

جان ایم ہل (J.M. Hill) نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''ملک میں تشدد، غارت گری، توڑ پھوڑ اور جنسی حملہ مجرمانہ کی وارداتیں برابر بڑھ رہی ہیں اور اس کا سبب غریبی نہیں بلکہ فلمیں، ٹیلی ویژن اور ماس میڈیا اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ جن کے ہاتھ میں ان ذرائع ابلاغ کی زمام ہے انہیں اپنی ذمہ داری سمجھنا چاہیے اور اسکرین پر پرتشدد مناظر

(۱) اپریل ۱۹۸۷ء میں ایوان عام نے 230 کے مقابلہ میں 342 ووٹ سے اس تجویز کو مسترد کردیا

کی عکاسی اتنی زیادہ نہیں کرنا چاہئے''۔ ہوم آفس نے بھی اپنے جائزے میں یہی پایا کہ جرائم میں اضافہ کے خاص اسباب جلد دولتمند بن جانے کا رجحان، والدین کی نگرانی میں کمی، عدالتوں سے مجرموں کو کافی سزا نہ ملنا اور بیکاری میں کچھ نہ کرنے کے بجائے کچھ کر گزرنے کا رجحان ہے۔

برطانیہ کے جیلوں میں اوسطاً پچاس ہزار قیدی رہتے ہیں اور ان کی تعداد بقدر ایک ہزار ہر سال بڑھتی رہتی ہے۔ تازہ ترین اعداد کے بموجب نومبر ۲۰۰۱ میں برطانیہ کے جیلوں میں کل 68,357 قیدی تھے جس میں عورتوں کی تعداد 4,045 تھی۔

جرمنی: مغربی جرمنی میں ہر روز دو سو عورتوں پر حملہ مجرمانہ کئے جاتے ہیں جن میں ریپ بھی شامل ہیں۔ سال بھر میں 76,000 کیسس یعنی ہر ایک منٹ پر ایک حملہ۔ وہاں عورتیں اپنے بچاؤ کے لئے کریٹ جوڈو کی ٹریننگ لیتی ہیں، بڑے شہروں میں دس فیصدی تک عورتیں ایسی ٹریننگ لیتی ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں وہاں ایک لاکھ تیس ہزار کاروں کی چوریاں ہوئیں جو سال ماقبل سے دگنی تھیں، انشورنس کمپنیوں کو 1.5 بلین مارکس معاوضہ میں ادا کرنے پڑے۔

دریائے رہائن کے کنارے گنجان آبادی میں جرائم کثرت سے واقع ہوتے ہیں۔ چند سال پہلے ۷ لاکھ سے زائد معاملات عدالتوں میں پیش کئے گئے تھے جس میں چھ لاکھ سے زیادہ معاملات اسی علاقے کے تھے۔ ملک میں صنعتی ترقی ۳۰ فیصدی ہوئی لیکن کمسنوں کے جرائم میں ۵۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ کچھ جرائم کے اعداد یہ تھے:

قتل	1400	چوریاں	92,600
عصمت ریزی	7,000	موٹر کاروں کی چوری	94,000
فیکٹریوں پر ڈاکے	83,000	ڈکیتیاں	25,000
بنکوں پر ڈاکے	700	حملہ مجرمانہ	30,000
جان بوجھ کر آگ لگانا	300	جعل سازی	1,96,000

ایئرپورٹ اور ٹرانسپورٹ کے مرکزوں پر تیرہ سو ویڈیو Consoles لگائے گئے ہیں جنہیں وائزیڈن کے کمپیوٹر ڈاٹا بنک سے جوڑا گیا ہے جس سے مجرموں کی گرفت آسانی سے کی جاسکے۔

کناڈا: امیگریشن کی سہولتیں، کمزور کرنسی سسٹم اور ڈھیلے جوڈیشنل سسٹم کی وجہ سے کناڈا جرائم کا مرکز بنتا جارہا ہے۔ دوسرے ملکوں کے منظم مجرموں کے گروہ یہاں سے بہ آسانی اپنی کارگزاریاں انجام دے رہے ہیں اور یہاں کرائم کلچر پنپ رہا ہے۔

جاپان: کمسنوں کے جرائم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں سنگین جرائم کی میزان 15,41,000 تک پہنچی جو دوسری عالمی جنگ کے بعد سب سے بڑا ریکارڈ تھا۔ کمسن مجرم جو مسلسل پولیس کی نگرانی میں رہتے ہیں ان کی تعداد دو لاکھ ۶۲ ہزار بتائی گئی۔

چین میں جرائم تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور نوجوانوں میں مجرموں کی تعداد زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ قحبہ گری، قمار، پارنوگرافی اور ڈرگ ابیوز کے علاوہ اقتصادی جرائم اور کرپشن میں زبردست اضافہ ہورہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں آٹھ لاکھ ۲۷ ہزار جرائم ریکارڈ کئے گئے جو سال گزشتہ سے ۴۵ فیصدی زیادہ تھے، سنگین جرائم دو لاکھ ۳ ہزار تھے جس میں 65.70 فیصدی اضافہ رہا۔ ۱۹۸۹ء میں دس لاکھ ۹۷ ہزار کیسس پولیس میں درج کرائے گئے جو سال ماقبل سے 137 فیصدی کا اضافہ تھا، بعض جرائم کے ارتکاب میں صورت حال کافی سنگین ہوگئی ہے۔ ساٹھ ستر فیصدی تک جرائم کمسنوں کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔

سویڈن: جو خوشحالی میں مثالی ملک مانا جاتا ہے وہاں بھی جرائم کی تعداد روز افزوں ہے۔ گزشتہ پندرہ سال کے عرصہ میں وہاں بڑے جرائم کی تعداد ایک لاکھ ۷۲ ہزار سے بڑھ کر تین لاکھ ۷۳ ہزار تک پہنچ گئی یعنی ۹۷ فیصدی کا اضافہ۔ مجرموں میں دو تہائی نابالغ ہوتے ہیں، موٹروں کی چوری میں 4/5 اور ڈکیتی میں 10/5 سے زائد تعداد ۲۰ سال سے کم عمر والوں کی ہوتی ہے۔ پندرہ سال کے عرصہ میں نقب زنی کے واقعات چوگنے اور موٹر کاروں کی چوری کے واقعات آٹھ گنے بڑھ گئے اور صرف آخری دو سال کی مدت میں جرائم ۲۲ فیصدی بڑھ گئے۔ عصمت ریزی میں ۶۵ فیصدی اور ڈکیتی میں ۶۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ صرف ایک سال میں ڈکیتی اور لوٹ مار کی غرض سے حملوں کی تعداد ۴۰ فیصدی بڑھ کر رہی!

اٹلی جیسے چھوٹے ملک میں ریپ کے واقعات کا سالانہ اوسط ایک ہزار رہتا ہے۔ حال میں اس جرم کی نوعیت میں ایک تشویشناک تبدیلی یہ نظر آئی کہ بجائے انفرادی

واقعات کے نوجوانوں کی ٹولیاں اجتماعی عصمت ریزی کا ارتکاب کرنے لگی ہیں۔

روس میں منظم جرائم میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ سی۔آئی۔اے کے ڈائریکٹر جیمس ولزے Woolsey نے کانگریشنل کمیٹی کو بتایا کہ روس میں تقریباً 5,700 منظم کرائم گروپس ہیں اور ان کے علاوہ ایک ہزار ایسے ہی گروپس سویٹ یونین کی دوسری جمہوریتوں میں ہیں۔ یہ گروپس دنیا کے دوسرے ملکوں کے ایسے ہی مجرمانہ گروہوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور ان کے تعاون سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ یہ منظم گروہ اونچے قسم کی چوریاں جیسے نیوکلیر ہتھیاروں کے پرزے، یورینیم اور ریڈیو ایکٹو میٹریل کی چوریاں نہایت شاطرانہ انداز سے کرتے ہیں۔ وسط ایشیا اور کوہ قاف کے علاقوں سے مجرموں کے منظم گروہوں کے اندر داخل ہوجانے سے گزشتہ پانچ سال میں روس میں جرائم بڑی تیزی سے بڑھ گئے ہیں۔ 500 سے زیادہ تو بڑے خونخوار قسم کے مجرم ہیں۔

۱۹۹۴ء میں ۳۶ لاکھ سے زیادہ جرائم ریکارڈ کئے گئے جس میں دس لاکھ جرائم کے لئے کسی کو بھی گرفت میں نہیں لایا جاسکا۔ بتیس ہزار قتل کے واقعات ہوئے، ایک تہائی قتل کرنے والے پکڑے بھی نہیں جاسکے (۱)۔ راجدھانی ماسکو میں جرائم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ روس کے چیف پرازی کیوٹر Yuri Skuratov نے کہا کہ جرائم زیادہ پرتشدد اور پروفیشنل ہوتے جارہے ہیں۔ "Crime Is Becoming More Professional and More Violent"

اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پولیس جرائم پر قابو پالے گی تو یہ بڑی غلط فہمی ہے، اگر پوری سوسائٹی ملکر جرائم سے نپٹنے کا تہیہ کرے تب ہی بڑھتے ہوئے جرائم پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ ماسکو میں مسلسل قتل کی جو وارداتیں ہوئیں وہ کافی سنگین تھیں، تفتیش کے اداروں اور عوام کے درمیان بہتر تعاون کی ضرورت ہے تاکہ مجرموں کی گرفت کی جاسکے۔ موصوف نے کہا کہ گزشتہ تین سال میں تشددانہ جرائم Armed Gangs Attacks اور Contract Killing میں کافی اضافہ ہوا ہے اور ڈرگس سے متعلق جرائم میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ (۲)

(۱) ٹائمز آف انڈیا۔ Tol 10.3.95
(۲) ٹائمز آف انڈیا۔ Tol 31.7.97

کمسنوں کے جرائم

بڑھتے ہوئے جرائم کا یہ پہلو بھی انتہائی تشویشناک ہے کہ نوعمروں میں بھی جرائم کی شرح کافی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے جس نے انتظامیہ کے سامنے ایک زبردست خلیج پیش کردیا ہے۔ شیلڈن کا کہنا ہے کہ نوعمری کے جرائم ۹-۱۰ سال کی اوسط عمر سے شروع ہوجاتے ہیں۔ اے۔اے۔ ویکس (AA Weeks) نے اپنے جائزہ میں یہ پایا کہ "ناجائز بچے، یتیم بچے اور ایسے بچے جو زوجین کی کشیدگی یا طلاق وتفریق کی وجہ سے لاپرواہی میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ بڑی تعداد میں جرائم کی راہ پر گامزن ہوجاتے ہیں"۔ نشیلی ادویات کی بڑھتی ہوئی لت نے بھی نوعمروں کو جرم کے راستہ پر ڈال دیا ہے۔ لائٹ اور مارٹیمر لکھتے ہیں کہ "جو شہر جتنا زیادہ بڑا اور خوشحال ہوگا اتنی ہی وہاں کمسنوں کے جرائم کی شرح بڑھی ہوئی ہوگی۔ ۱۶ سال کی عمر کے بچے و بچیاں جرائم میں گرفتار کئے جارہے ہیں۔ قانون شکنی کرنے والا سب سے بڑا گروہ ۲۱ سال سے کم عمر والوں کا ہوتا ہے اور اس کے بعد ۲۱-۲۵ سال کی عمر والوں کا۔ پہلے زمانہ میں جب بچے دوکانوں پر محنت وجفاکشی سے کام کرتے تھے، اخبارات بیچتے تھے، بنڈل لے جاتے تھے تب کمسن مجرم پیدا نہیں ہوئے آج خوشحال گھرانوں کے نوعمر لڑکے جرائم میں ملوث ہورہے ہیں"۔ "اکیسیین" نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ "آج کمسن مجرموں کے اعداد سب سے زیادہ امریکا، برطانیہ اور سویڈن سے اسی ترتیب میں آرہے ہیں۔ وہی ممالک جہاں کی متمول سوسائٹی صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ اور فلاح و بہبود سے لیس ہے۔ جاپان میں بھی یہ مسئلہ بڑے پیانے پر موجود ہے اور کچھ ہی تخفیف سے روس، فرانس، اٹلی اور مغربی جرمنی کے لئے بھی یہ دردِ سر بنا ہوا ہے...... اصل دشمن وہ حد سے بڑھی ہوئی مادّیت ہے جس پر موجودہ معاشرہ کی بنیاد ہے۔

"The Real Enemy Is The Crass Materialism On Which Today`s Society Is Based".

چوری، ڈکیتی اور عصمت ریزی کے علاوہ جرم کی ایک نئی قسم جس نے ماہرین کو سخت پریشانی اور تردد میں ڈال دیا ہے وہ ہے بچوں کے ذریعہ اپنے ہی گھروالوں کا قتل (Homicide)۔ حال میں نیویارک کے علاقے سے اسی قسم کی پریشان کن خبریں موصول

ہوئیں مثلاً ایک ۷ سال کے لڑکے نے دو سال کے بچے کو چھت سے ڈھکیل کر مار دیا۔ ایک ۱۳ سال کے لڑکے نے بلا جھجک تسلیم کیا کہ اس نے اپنی ماں کو شوٹ کر دیا۔ ایک پندرہ سال کی بچی نے ایک چھوٹے بچے کو آگ میں پھینک دیا جو جل کر مر گیا! حال میں کولوریڈو کے ایک ہائی اسکول میں طلباء میں باہمی شوٹنگ کا جو عبرتناک واقعہ ہوا اس کے پس منظر میں ''نیوز ویک'' نے عام شہریوں کی رائے جاننے کے لئے ایک جائزہ لیا تو ۶۷ فیصدی شہریوں نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ بندوق کا آسانی سے دستیاب ہو جانا ہی اس قسم کے جرائم میں اضافہ کا خاص سبب ہے اور ۳۴ فیصدی افراد کا یہ کہنا تھا کہ میڈیا میں تشدد کی بڑھتی ہوئی عکاسی بھی اس اضافہ کا ایک اہم سبب ہے (۱)۔ ایف بی آئی نے بتایا کہ ۱۹۸۲ء میں اس جرم میں ملوث ہونے کی بنا پر امریکا کی ہر دس لاکھ آبادی پر 9.88 بچے گرفتار کئے گئے اور ۱۷ سال کے لڑکوں میں یہ شرح باقی عمر والوں سے دگنی یعنی 22.6 تھی۔ جو ٹاسک فورس نوجوانوں کے تشدد کی جانچ کے لئے بنایا گیا اس میں گھریلو تشدد اور گھر والوں کے قتل کو بھی شامل کیا گیا۔ لیسٹر ایڈلسن (Lester Adelson) کا کہنا ہے کہ ہم تشدد کے آئس برگ Ice Berg کی صرف چوٹی دیکھتے ہیں۔ اصل واقعات اور تشدد کا پھیلاؤ اس سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ ان نوجوان قاتلوں کے برتاؤ کا عمیق مطالعہ کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ ان کی اکثریت ایسے گھروں کی ہوتی ہے جہاں ماں باپ دماغی شفاخانوں میں زیر علاج رہ چکے ہوتے ہیں اور دونوں یا ایک مے نوشی کے عادی ہوتے ہیں۔

پنسلوانیا یونیورسٹی کی پروفیسر آف کرمنالوجی مارون والفگنگ (Marvin Wolfgang) لکھتی ہیں کہ ''نوجوانوں کے جرموں میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور اضافہ کی یہ رفتار ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکا میں بھی برقرار ہے۔ شراب اور ڈرگس کے قوانین کی خلاف ورزی ہر جگہ کی جا رہی ہے۔ قانون شکنی کرنے والوں کی اوسط عمر ۱۳-۱۴ سال ہو گئی ہے۔ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی جو نوجوانوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے اس کا اہم سبب ہے:

"Growing Urbanisation Which Cuts At The Social Roots Of Youths Is One Of The Reasons For This".

---

(۱) ToI 25.4.1999

عورتوں کے جرائم

آزادئ نسواں نے عورتوں کو اتنا جری و بیباک بنا دیا ہے کہ وہ بھی ہر قسم کے جرموں میں مردوں کے ساتھ مل کر شاطرانہ انداز سے اپنا کام انجام دینے لگی ہیں۔ بعض قسم کے جرائم میں تو خود سرغنہ کے فرائض انجام دینے لگی ہیں۔ امریکا میں تو Femal Crime Wave آئی ہوئی ہے۔ شاپ لفٹنگ سے لے کر سرقہ، نقب زنی، راہزنی اور بنکوں کی ڈکیتی تک میں وہ شامل پائی گئیں۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ''گزشتہ بیس سال سے عورتیں بڑی تعداد میں جرائم میں شریک ہونے لگی ہیں اور ڈرگ اسمگلنگ کے کاروبار میں عورتیں ہی زیادہ شامل پائی گئی ہیں۔ دہشت زدگی کی کارروائیاں کرنے والے گروہوں میں ان کا تناسب پچاس فیصدی تک پایا گیا۔ اور سیاسی مقاصد کے تحت تشددانہ جرائم میں وہ سربراہی کے فرائض انجام دینے لگی ہیں۔ امریکا میں ۱۹۷۰ء کے بعد سے عورتیں ہر قسم کے جرائم میں بڑی تیزی سے شریک ہونے لگی ہیں جس سے مذکر و مونث جرائم کی تقسیم قریب قریب ختم ہو گئی ہے۔ جاپان میں جرائم میں عورتوں کا تناسب جو ۱۹۶۰ء میں ۷ فیصدی تھا ۱۹۷۰ء میں بڑھ کر ۱۹ فیصدی ہو گیا۔ مشرقی افریقہ کے ملکوں میں بدلتے ہوئے حالات نے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ ڈرگ اسمگلنگ اور غیر ملکی زرتبادلہ کے لین دین میں جو پہلے صرف مردوں کے لئے مخصوص تھے اب ان میں عورتیں بھی شامل ہونے لگی ہیں''۔ (۱)

امریکا میں جرائم اور تشددانہ وارداتوں میں عورتوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دس سالوں میں بڑے جرائم کے لئے عورتوں کی گرفتاری میں 200.6 فیصدی کا اضافہ رہا جبکہ مردوں کی گرفتاری میں صرف 72.7 فیصدی کا اضافہ رہا تھا۔ ایف۔ بی۔ آئی کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکیوں میں جرائم کے اضافہ کی رفتار 256.6 فیصدی رہی جبکہ اسی عمر کے لڑکوں میں اضافہ کی شرح 79.5 فیصدی رہی تھی۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء کی مدت میں ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کے ذریعہ ڈکیتی کی وارداتوں میں ۶۷۴ فیصدی کا اضافہ رہا اور ۱۸ سال سے زیادہ عمر والی لڑکیوں میں ۲۸۷ فیصدی کا۔ اس کے مقابلہ میں ۱۸ سال سے کم

---

(۱) ٹائمز آف انڈیا 16.7.85

عمر کے لڑکوں میں صرف ۲۴۰ فیصدی کا اضافہ رہا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ اب عورتیں صرف فرسودہ قسم کے جرائم جیسے بردہ فروشی اور پلفرنگ (Pilfering) تک محدود نہیں رہتیں بلکہ مردانہ جرائم میں بھی پوری طرح شامل ہوگئی ہیں۔ اور کچن کے چاقو کے بجائے پستول اور شاٹ گن کا استعمال وہ بھی کرنے لگی ہیں۔ مشتبہ افراد کی گرفتاریوں میں ہر سات افراد میں ایک عورت تھی اور ان کی گرفتاریوں کی کل تعداد میں ۱۸ فیصدی کا اضافہ رہا۔ قتل کے سلسلہ میں کی جانے والی گرفتاریوں میں پانچ افراد میں ایک عورت تھی! ۱۹۷۴ء میں ملک میں کی گئی کل گرفتاریوں میں ۳۳ فیصدی عورتیں تھیں۔ اس سال سنگین جرموں کے لئے گرفتار کی جانے والی عورتوں کی تعداد چھ لاکھ ۸۶ ہزار تھی۔ جبکہ ۱۹۶۰ء میں یہ تعداد صرف تین لاکھ ۵۱ ہزار تھی۔

عورتوں میں بڑھتے ہوئے جرائم اب ساری دنیا کا مسئلہ بن گئے ہیں۔ جاپان میں گزشتہ پانچ سالوں میں مجرم عورتوں میں ۲۲ فیصدی کا اضافہ رہا۔ امریکا میں ۱۹۶۹ء سے مجرم عورتوں کی گرفتاری میں تین گنا اضافہ ہوا۔ کناڈا میں گزشتہ ۱۶ سالوں میں مجرم عورتوں میں دگنا اضافہ ہوا۔ مغربی جرمنی میں ہر دو مرد مجرموں کے ساتھ ایک عورت مجرم ہوتی ہے۔ ۱۹۶۳ء سے مردوں کے جرموں میں ۲۷ فیصدی کا اضافہ ہوا لیکن عورتوں کے جرموں میں ۴۸ فیصدی کا اضافہ رہا!

حصہ چہارم

تمدن کا اجمالی جائزہ

باب ۱۲

اختتامیہ

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ مغربی معاشرہ میں اخلاقی قدریں کس حد تک پامال ہوچکی ہیں اور کیسے اخلاقی بحران سے ان کی سوسائٹی گزر رہی ہے۔ شہوانیت سے بھرپور فحش لٹریچر، عریاں فلمیں اور رکیک ٹیلی ویژن پروگرام بے باکی سے نشر کئے جا رہے ہیں۔ شراب اور ڈرگس کا استعمال ہر طبقہ میں بالخصوص نوجوانوں میں روز افزوں ہے جو ان کے جذبات کو برانگیختہ کرکے انہیں جنسی بے راہ روی اور جرائم کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔

عصمت وعفت کے تمام تصورات کو بالائے طاق رکھ کر انتہائی بے باکی کے ساتھ اس نظریہ کی اشاعت کی جارہی ہے کہ محبت کے بغیر جنسی آسودگی میں ناپسندیدگی کی کوئی بات نہیں بلکہ حصول لذت کے لئے یہ بالکل روا ہے۔ باکرہ پن (Virginity) کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور رشتۂ ازدواج کے باہر جنسی تعلق کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور نوجوانوں میں Sex for Fun کا نظریہ مقبول ہوتا جارہا ہے۔ شادی کے بغیر ساتھ رہنا (Living Together) ایک ادارہ بن چکا ہے۔ بردہ فروشی ایک گلوبل انڈسٹری بن گئی ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین فائیو اسٹار فلش ٹریڈ میں بہ رضا و رغبت شریک ہورہی ہیں۔ فریقین کی رضا

مندی سے لواطت کو قانونی جواز حاصل ہو چکا ہے اور ایک ہی جنس کے فریقین میں "شادیوں" کو بھی تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ برطانیہ کی ایک سرکاری کمیٹی نے یہ اعتراف کیا کہ "نجی اخلاقیات کے بعض امور قانون کے دائرہ سے باہر ہیں"۔

"There Is A Realm Of Private Morals Which Lay Outside The Purview Of Law"

موجودہ طرزِ زندگی نے دونوں جنسوں کے فریقین کے خلط ملط کی ایسی صورتیں پیدا کر دی ہیں کہ جنسی اتصال کے مواقع آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں اور امتناع حمل کی بے شمار تدابیر کے باوجود استقرار حمل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ابارشن کو بیشتر ملکوں میں جائز قرار دیا جا چکا ہے اور بے نکاحی ماؤں کے ماتھے سے کلنک (Stigma) دُھل چکا ہے۔ ناجائز بچوں کی پرورش کے لئے حکومتیں فنڈ مہیا کرتی ہیں اور انہیں جائز اولاد کے برابر ہی حقوق ملتے ہیں۔ کمسن لڑکیوں کو بھی ضبط تولید کے آلات آسانی سے فراہم ہو جاتے ہیں اور اسکولی لڑکیوں پر "لنچ ٹائم ابارشن" ان کے والدین کی رضامندی کے بغیر کئے جا رہے ہیں، امریکہ کے کچھ کالجوں میں بے نکاحی ماؤں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کالج کے حدود میں ان کے نوزائدہ بچوں کی پرورش کے لئے کرچز (Cretches) قائم کرنا پڑ رہے ہیں! کمسنی میں حاملہ ہو جانے والی لڑکیوں کی صحت پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں اور خاندان کے نظم میں بگاڑ بڑھتا جا رہا ہے۔ شادی کے ادارے کا تقدس ختم ہونے سے طلاق وتفریق کے واقعات بڑھ رہے ہیں جس کے دور رس نتائج زوجین (Spouses) اور ان کے بچوں پر پڑ رہے ہیں۔ حقوق نسواں کا زبردست علمبردار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مغرب نے دراصل عورت کو محض ایک جنسی کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے۔

آج کے نوجوان اپنے گردوپیش کے ماحول میں ہر طرف اخلاقی اور روحانی قدروں کو روبہ زوال ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ آئنسٹائن نے کہا تھا کہ "ہم بوسیدہ کپڑوں اور معمولی فرنیچر کو دیکھ کر تو شرمندہ ہوتے ہیں لیکن رکیک خیالات اور اوچھے فلسفہ کو اپنا کر ہم میں ندامت کا ذرا بھی احساس پیدا نہیں ہوتا۔"

"We are ashamed of shabby clothes and shoddy furniture, but not of shabby ideas and shody philosophies."

(Alben Eienstein)

نوجوان ہر معاشرہ کے لئے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں ان کی بے پناہ قوت اور تخلیقی صلاحیتوں کو صحیح سمت میں لگانے سے معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ یہی عمر قدروں کے اپنانے اور زندگی کا صحیح نصب العین متعین کر کے مناسب شاہراہ پر چلنے کی ہوتی ہے۔ لیکن موجودہ صدی کا ایک زبردست المیہ یہ ہے کہ جہاں ایک طرف سائنس وٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی نے راحت وآسائش کی بے شمار سہولتیں مہیا کر دی ہیں وہیں دوسری طرف مادیت کے پھیلنے سے اخلاقی قدروں میں زبردست انحطاط رونما ہوا اور ہمارے تمام ادارے مادیت سے مغلوب ہو گئے۔ تعلیم جس کا بنیادی مقصد انسان کی فہم ودانش کو روشن کرنا اور کردار کی تعمیر تھا اب صرف معلومات بہم پہنچانے اور معاش کا وسیلہ بن کر رہ گیا ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی نشوونما اور کردار سازی کی طرف سے یکسر غفلت برتی جانے لگی ہے جس کے نتائج معاشرہ کے لئے بڑے مہلک ثابت ہوئے۔ یہ معلومات صرف خلاء (Vacuum) میں دی جانے لگیں اور علم کا وسیع تر مفہوم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"It Is Providing Knowledge In The Vacuum The Directionless Disembodied Mind"

عنفوان شباب زندگی کا بڑا ہیجان پرور دور ہوتا ہے نوجوان قوت سے بھرپور اور خطرات کی مہم اٹھانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ اگر ان کی اس قوت اور صلاحیت کو تعمیری کاموں میں لگا دیا جائے تو وہ معاشرہ کے لئے کارہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں اور سماج کی فلاح وبہبود کے لئے بیش بہا خدمات انجام دے سکتے ہیں لیکن اگر ان کی یہ قوت وصلاحیت محض عیاشی اور جنسی کارگزاریوں میں لگ جائے تو نہ صرف ان کی صحت، دولت اور وقت برباد ہوگا بلکہ وہ معاشرہ کے لئے کوئی ٹھوس تعمیری کام انجام دینے سے قاصر رہیں گے لہٰذا خود ان کی کردار سازی، فلاح وبہبود اور سماج کے لئے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے بھی یہ ضروری ہے کہ معاشرہ ایسا ماحول مہیا کرے جو ہر قسم کی اخلاقی آلودگی سے پاک وصاف ہو تا کہ وہ ایسے جذبات وخواہشات پر معقول کنٹرول رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکیں۔ مشہور فلسفی ومورخ ول ڈورنٹ (Durant) کا کہنا ہے کہ :

"ہمارے جدید تمدن نے غیر دانشمندانہ طور پر انسان کے سفلی جذبات میں

ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے اسلاف خوب جانتے تھے کہ یہ جذبات (Impulse) بغیر کسی ترغیب کے خودکار قومی ہوتے ہیں اور اس لئے اس پر پوری گرفت قائم رکھی، لیکن ہم نے انہیں برانگیختہ کرنے کے بے شمار طریقے (اشتہارات، زور بیان اور نمائش) اپنا کر اور بھی بھڑکا دیا۔ مزید برآں اُسے اس نظریہ سے مسلح کر دیا کہ رُکاوٗ (Inhibition) غیر مناسب ہے۔ حالانکہ رُکاوٗ یعنی جذبات پر قابو پانا۔ (Control Of Impulse) تمدن کا بنیادی اصول ہے۔"

اعلیٰ قدریں ہی انسان کو بہائم سے ممتاز کرتی ہیں اور اُسے چوپاؤں کی سطح سے بلند ہو کر زندگی گزارنے کا شعور عطا کرتی ہیں اور زندگی میں سوز و گداز پیدا کرتی ہیں۔ قدریں (Values) ہی وہ بنیاد ہیں جن پر کردار کی تعمیر کی جاتی ہے قدریں ہی افراد کی زندگی کو بامقصد بناتی ہیں اور اچھے بُرے، نیک و بد، صحیح اور غلط کا شعور پیدا کرتی ہیں۔ مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ہاورڈ Dr. Haward لکھتے ہیں کہ :

"گپھاؤں اور جنگلوں میں زندگی گزارنے سے لے کر مہذب معاشرہ کی تشکیل تک انسانی تہذیب کی تاریخ اور ہمارے اداروں کے قیام و بقا کا انحصار اسی ضبط نفس، قانون، اخلاقیات اور مذہب پر ہے۔ یہی واحد راستہ ہے جس سے ہم مہذب اور شائستہ تمدن کی طرف بڑھ سکتے ہیں اور انہیں کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی گزارنے کے بعض طریقے ناپسندیدہ ہیں۔ تمدن اُسی وقت ترقی کرتا ہے جس ہم اپنی جبلّات (Instincts) کو عقل کے تابع کر لیں"۔

برطانیہ کے مشہور ماہر قانون لارڈ الفرڈ ٹامسن ڈینگ کا قول ہے کہ" قانون کی بنیاد تو اخلاقیات پر ہی ہوتی ہے اگر اخلاقیات ہی نہیں تو قانون بے معنی ہے اور خود اخلاقیات کی بنیاد مذہب پر ہوتی ہے" گویا اگر مذہب نہیں تو اخلاق و قانون دونوں بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

قوموں کے لئے اخلاقی قدروں کی اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ارنسٹ کلیکسٹن Ernest Claxton لکھتے ہیں کہ" انسان جس کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین اور معیار نہیں ہے کسی حالت میں بھی جیلی فش (Jelly Fish) سے بہتر نہیں ہے اور یہی بات قوم کے لئے بھی صحیح ہے۔ جب کوئی قوم کمزور اور بداطوار ہو جاتی ہے تو اس

کے پاس صرف گزشتہ نسل کا سرمایہ رہ جاتا ہے اور وہ خود آنے والی نسل کے لئے محض اپنے انحطاط کا نمونہ چھوڑ جاتی ہے۔ آج ہماری قوم باوجود اپنی انتہائی خوشحالی، صنعتی کاریگری اور سائنس کے، باوجود اعلیٰ اداروں اور تخلیقات کے، عظیم خطروں سے دوچار ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اخلاقی بندشوں کو ڈھیلا کرتی چلی جا رہی ہے اور اس کے سامنے زندگی کا کوئی متعین نصب العین نہیں ہے"۔

ڈاکٹر ایچ۔ این۔ ڈن (Dunn) لکھتے ہیں (۱) "ادھر تقریباً چار سو سال کے اندر سائنس نے جو بے پناہ قوت پیدا کر دی ہے اس نے انسان کی طبعی دنیا کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے لیکن انسان کے معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی اداروں نے اُسی مناسبت سے ترقی نہیں کی جیسی کہ سائنس نے کی"۔

مشہور عالم فلسفی برٹرینڈ رسل (Russell) نے اپنے ایک نشریہ میں کہا کہ ہم میں سے کثرت سے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس کھانے کو بھی ہے اور تندرستی بھی اچھی ہے اور اس کے بعد انہیں خوش رہنا چاہئے مگر وہ اس کے باوجود خوش نہیں رہتے بلکہ افسردہ و غیر مطمئن ہی رہتے ہیں۔ امریکا میں یہ بلا اور زیادہ ہے۔ بات اصل یہ ہے کہ ہم حیوانوں کی سطح سے اتنے زائد بلند نہیں ہیں جتنا ہم نے اپنی خود پسندی سے اپنے کو سمجھ رکھا ہے انہیں بس کھانے وانے کو مل جائے تو بس وہ خوش ہیں۔ انسان کی ضرورتیں بیشک حیوانات سے زیادہ ہیں تاہم ان کی بھی آخری بنیاد فطرت و جبلت ہی ہونا چاہئے۔ ہمارے متمدن معاشرہ خصوصاً انگریزی زبان والے علاقوں نے اتنی موٹی سی بات کو بھلا رکھا ہے"۔

ایسے ہی خیالات کا اظہار لندن کے کہنہ مشق ڈاکٹر اور صاحب قلم اے۔ جی۔ کرونین نے اپنے ایک مقالہ میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ" انسان اپنی حماقت سے سمجھتا یہ رہتا ہے کہ جتنا زیادہ اپنے کو حاصل ہو جائے اسی قدر مزے میں گزرے گی اور زندگی میں مسرت بے پایاں جب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب ہم بے اندازہ دولت کے مالک ہوں۔ ایثار کی زندگی بے معنی ہو گئی ہے۔ والدین کا اقتدار مذاق بن کر رہ گیا ہے اور ضبط نفس کا تو وجود ہی باقی نہیں رہا۔ سچی آزادی اور مسرت کا اُسے پتہ بھی نہ لگے گا جب تک وہ اپنے آپ کو رام نہ کر لے گا۔" ڈائسن کارٹر کا کہنا ہے کہ" حضرت مسیح نے ہمیں یہ سبق دیا تھا کہ

(۱) کتاب "Your World and mine"

انسان اگر ساری دنیا کی دولت کو بھی پالے لیکن خود اپنی روح کو گم کردے تو اُسے کوئی نفع حاصل نہ ہوسکے گا‘‘۔ اسی طرح جواہر لال نہرو نے اپنے ایک کانوکیشن ایڈرس میں کہا ’’انسان نے بیحد ترقی کرلی ہے مگر باوجود اس کے کہ اُس نے باہر کی دنیا کو فتح کرلیا ہے خود اس کا نفس اس تصادم کی نذر ہوگیا ہے۔ وہ جتنا باہر سے واقف ہوتا گیا اتنا ہی اپنے آپ کو بھولتا گیا اور ہمیں پُرانی بات یاد آنے لگی کہ اپنے آپ کو پہچانو!‘‘ ایک دوسرے لکچر میں انہوں نے کہا کہ ’’ماڈی خوشحالی بغیر رواداری، صلہ رحمی اور حکمت کے گرد وغبار اور خاکستر میں تبدیل ہوسکتی ہے‘‘۔ خواجہ غلام السیدین اپنے ایک مضمون میں تہذیب جدید کی ناکامیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’اس صورت حال کا خاص سبب یہ ہے کہ قوموں کی قدریں مناسب ترتیب میں نہیں ہیں۔ محض اقتصادی خوشحالی میں اضافہ اور علمی ترقی ان پسماندہ ممالک کے مسائل کو حل نہ کردے گی جیسا کہ اُس نے خوشحال اور تعلیم یافتہ ممالک کے مسائل حل نہیں کئے ہیں۔ انسانیت کی فلاح اور ترقی صرف اس سے نہ ہوگی کہ اُن کے ’دماغ‘ کیا سوچتے ہیں بلکہ اس سے کہ اُن کے ’قلب‘ کے احساسات کیا ہیں۔ انسانی ’دماغ‘ آگے بڑھ گیا ہے لیکن انسانی ’قلب‘ پیچھے رہ گیا ہے۔ تمدن کی ترقی کا ہر صحیح قدم اپنی گہرائی میں انسانی ہمدردی اور دوسرے انسانوں کی طرف شفقت کے احساس پر مبنی ہونا چاہئے یہ اوصاف بنیادی طور پر دماغی نہیں بلکہ جذباتی ہیں جن کا منبع تمثیل کی زبان میں ’’قلب‘‘ ہے۔ اگر دل میں رحم اور ترس کا جذبہ نہیں ہے اور ہم ساری دنیا کی دولت اور سائنس وٹکنالوجی سے ملنے والی قوت کے مالک ہوجائیں تو یہ محسوس ہوجائے گا کہ وہ ساری دولت اور قوت ہمارے لئے عذاب کا باعث بن گئی اور بالآخر ہماری تباہی کا سبب۔ اگر قوت وبصیرت، صحیح نصب العین اور اس کے حصول کے ذرائع میں توازن درست نہیں ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ صرف ’’دماغ‘‘ ہماری نجات کے لئے کافی نہ ہوسکے گا‘‘۔

مشرق کے نامور فلسفی آنجہانی ڈاکٹر رادھا کرشنن موجودہ تمدن کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’مجھے یقین ہے اور میرا یہ یقین دن بدن کے تجربات سے مزید پختہ ہوتا جارہا ہے کہ حکمت ودانائی کا رشتہ فلسفہ اور مذہب سے وابستہ ہے۔ دُنیا کے بیشتر ملکوں ترقی یافتہ ملکوں میں قدرتی وسائل یا ذہنی پذیرائی کی کمی نہیں لیکن پھر بھی باوجود قدرتی وسائل کی افراط اور حیرت انگیز ذہنی پذیرائی، اعلیٰ تنظیم، شجاعت اور وفاداری کے وہاں کے لوگ ہر

وقت اپنے کو خوف اور بے اطمینانی میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ آج دنیا کے لوگوں پر ہر وقت خوف کی جو دہشت طاری رہتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ حکمت اور شفقت مناسب ترتیب میں نہیں ہیں‘‘۔

لیپول ویز (Leopol Weiss) لکھتے ہیں (۱) کہ ’یورپ میں انسانوں کی ایک ایسی قطع پیدا ہوگئی ہے جس کی اخلاقیت عملی افادیت کے سوال کے اندر محصور ہے جس کے نزدیک خیر وشر کا بلند ترین معیار ماڈی کامیابی ہے...... اس کے مقابل وہ محاسن جن کی ابھی تک محض اخلاقی حیثیت سے قیمت تھی مثلاً محبت پدری یا ازدواجی وفاداری بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اہمیت کھو رہے ہیں، اس صنعتی سوسائٹی کی تنظیم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ خالص میکانکی خطوط پر کی جارہی ہے...... مغربی تہذیب انسان کی اجتماعی وجسمانی ضروریات اور روحانی اُمنگوں کے درمیان کوئی توازن پیدا نہیں کرسکتی‘‘۔

مشہور مفکر واہل قلم اور صاحب طرز انشاء پرداز عبدالماجد دریابادی تہذیب جدید کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ’’فرنگی معاشرہ اب جن ستونوں پر قائم ہے اس کا مرکزی اور بنیادی ستون یہی آخرت فراموشی ہے۔ کامل اور مطلق لادینیت (نامذہبیت) ہر جاہلی تہذیب کی طرح فرنگی تہذیب کی بھی امتیازی خصوصیت ہے۔ دوسرے موانع جو اس راہ میں ہوسکتے تھے ۱- سوسائٹی میں بدنامی کا ڈر ۲- جسمانی ضرر یا بیماری لگ جانے کا اندیشہ وہ اس طرح ختم ہوگئے کہ ۱- جنسی وشہوانی معاصی فرنگی معاشرہ میں ہرگز چھوٹا بڑا کوئی جرم نہیں معیوب ان کے یہاں صرف وہ زناکاری ہے جس میں زانی پر انگلیاں اٹھنے لگیں اور جہاں فضیحتا عام ہوجائے ۲- اس کے لئے شیطانی ذہانت نے ایسی دوائیں، تدبیریں، ربر کے آلات ایسے ایجاد کرلئے ہیں کہ نہ حمل قرار پائے جانے کا اندیشہ اور نہ سوزاک آتشک وغیرہ موذی امراض کے لگ جانے کا خطرہ! اس تہذیب کے ماحول میں رہ کر اس کا جغرافیائی محل وقوع روئے زمین کے کسی خطہ میں بسنے والی کسی قوم میں ہو اوسط درجہ کے مرد اور اوسط درجہ کی عورت کا سرے سے پاکباز رہنا اور اس ابتلاء میں پڑنے سے محفوظ رہ جانا یہی نہیں کہ دشوار ہے بلکہ تقریباً محالات عادیہ میں سے ہے‘‘۔ (۲)

مشہور ماہر تعلیمات ڈاکٹر ذاکر حسین کا کہنا ہے کہ ’’زندگی کا صحیح مفہوم اس وقت

---

(۱) "Islam at the Crossroads"   (۲) ’’صدق جدید‘‘ (ملخصاً)

تک واضح نہ ہو سکے گا جب تک انسان باہری فتوحات کے ساتھ ساتھ اپنے داخلی احساسات وجذبات پر بھی قابو نہ پالے۔ہم آج جس کشمکش میں مبتلا ہیں وہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتی جب تک ہم سائنس اور اخلاقیات کو الگ الگ سمجھتے رہیں گے ہمیں ان دونوں کے درمیان تطبیق پیدا کرنا چاہئے اور دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہئے۔''

معاشرہ کی بنیادی اکائی خاندان ہوتی ہے اور وہی پہلی ترتیب گاہ اور خاندان کا وجود قیام وبقا رشتۂ ازدواج پر منحصر ہے۔اگر سرے سے رشتہ ازدواج کے تصور کو ختم کردیا جائے اور آزاد محبت (Free Love) کے نظریہ کو فروغ دے دیا جائے اور جنسی پیاس کہیں بھی بجھالینے کی آزادی حاصل ہو تو خاندان کا وجود کہاں باقی رہے گا اور بچوں کی پرورش ونگہداشت کی ذمہ داریاں کون سنبھالے گا؟ اور انسانی رشتے کیسے قائم رہ سکیں گے؟ اسی لئے مذہب اخلاق اور قانون نے خاندان کے تصور کو نہ صرف یہ کہ صحیح تسلیم کیا بلکہ اسے ہر طرح فروغ دینے کی ترغیب دی اور انسانیت کے اس قیمتی ورثہ کو مستحکم بنانے پر زور دیا۔ خاندان کے وجود سے ہی دوسرے انسانی فلاحی ادارے، تعلیم وتربیت کے ادارے نیز سوشلائزیشن کے دیگر ادارے وجود میں آئے اور ان اداروں کو بچوں کی معقول تربیت، کردار سازی اور اخلاقی قدروں کے سنوارنے کا کام سپرد کیا گیا۔کلاسیکی ادب، روحانی صحائف (Scriptures) اور اخلاقیات کے ذریعہ بہترین اوصاف رکھنے والے افراد کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا گیا۔لیکن ہر طرف مادّی قدروں کے پھیل جانے سے اخلاقی قدریں بالکل پیچھے پڑ گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ ''تمدن جدید تخئیل فہم اور جرأت کے مالک انسان پیدا کرنے سے قاصر ہو گیا۔(۱)

پروفیسر ٹوئن بی کا کہنا ہے کہ تمدن کے انحطاط میں سب سے بڑا خدشہ یہ رہتا ہے کہ انسان اخلاقی بربریت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

What is terrifying in the fall of a civilization is the fear of a return to moral barbarism.

مادّیت کے پھیل جانے سے ہی معاشرہ میں خون خرابا اور تشدد بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ ٹکنالوجی کے غیر انسانی اوصاف Dehumanising Effects لوگوں میں فرسٹریشن

---

(۱) "Man The Unknown" مصنف الکسس کیرل

پیدا کردیتے ہیں جس سے وہ تشدد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ڈاکٹر مارٹن لیوتھر کنگ نے بھی کہا تھا کہ تشدد مادیت کا جڑواں بھائی ہے۔ایچ جی ویلس (H.G.Wells) نے بھی موجودہ تمدن کے بارے میں کہا کہ ''یہ ایک طاقتور موٹر کار ہے جس کے اسٹیرنگ وہیل پر بندر بیٹھا ہوا ہے'' اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالتے ہوئے انسان محض وقتی خط ولذت کے پیچھے سرگرداں ہے۔ایسا کیوں؟ اس کا جواب کیرل (Carell) یہ دیتا ہے کہ ''انسان نے اپنے داخلی احساسات کی اتنی نشو ونما نہیں کی جتنی کہ ان اداروں کی جو اس کے دماغ کی اُپج ہیں''۔انسان نے بہترین مشینوں کی ایجاد کر کے انہیں تو آگے بڑھا دیا لیکن وہ خود پیچھے رہ گیا اور اپنی ہی ایجادات کا غلام بن گیا اور اپنی تخلیق کا حقیقی مقصد بھول گیا۔''

ایک عظیم وصالح معاشرہ کی تشکیل کیلئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ اقتصادی خوشحالی کے منصوبوں کے ساتھ ہی ساتھ ایک اچھی با مقصد وباوقار زندگی گزارنے کیلئے بھی کوشش کی جائے تا کہ ایک ایسا سماج وجود میں آسکے جس میں عظیم کردار کے حامل اور اعلیٰ اخلاقی صفات سے متصف افراد وجود میں آسکیں کیونکہ بالآخر ساری انسانی جدوجہد کا مقصد ہی بہترین افراد کی تشکیل ہے۔ماہر سماجیات ممفورڈ کا کہنا ہے کہ ہماری تمام کوششوں کا ماحصل ایک ہی ہے۔بہترین انسانی افراد کی تشکیل اور بہترین معیاری زندگی کو وجود میں لانا

"in the end all our contrivance have but one objective : the continued growth of human personalities and the cultivation of the best life possible."

اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری تمام کارگزاریاں اخلاقیات پر مبنی ہوں۔اخلاق قدریں ہی زندگی میں حسن اور وقار پیدا کرتی ہیں بہترین زندگی وہی قرار دی جاسکتی ہے جس میں قدروں کے لئے جدوجہد ہو نہ کہ صرف دولت کے لئے، کیونکہ محض دولت کا حصول انسان کو دائمی سکون اور طمانیت قلب عطا نہیں کر سکتی۔پروفیسر ٹوئن بی لکھتے ہیں کہ ''کمپیوٹرز کے استعمال کی بدولت یہ صورت ذرائع پیداوار کے اضافہ سے جلد ہی آسکتی ہے جب ہر شخص کے پاس وقت اور پیسہ ہوگا اور وہ یہ نہ جانے گا کہ اسے استعمال کیسے کیا جائے۔ٹکنالوجی اتنی ہی خبیث ثابت ہو رہی ہے جیسی کہ یونانی دیوتاؤں کی وہ دُعا جو میڈا کو دی گئی تھی کہ وہ جس شے کو چھولے گی وہ سونا ہو جائے گی، اس کی یہ سنہری چھونے کی قوت

بالآخر اس کے لئے فاقہ کا باعث بن کر رہی''۔ ایسے پیچیدہ مسائل کا حل ٹوئن بی کے ہی الفاظ میں ''مذہب کی طرف واپسی اور روحانی تصورات کے اُجاگر کرنے سے ہی مل سکے گا، مذہب کو انسانی زندگی میں مرکزی مقام دینا ہوگا یہ انسان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ یہ صرف کچھ ایسے لوگوں کی ایجاد نہیں ہے جو خود ساختہ مسائل سے فرار چاہتے ہیں''۔ برٹرینڈ رسل نے بھی یہی کہا کہ ''انسان کی روح کی گہرائیوں میں پہنچنے کے لئے مذہب ہی رہنمائی کرتا ہے اور عالمی بھائی چارگی مذہبی پیشواؤں کی تعلیمات سے ہی پھیلائی جاسکتی ہے''۔ کارلائل کا بھی یہی کہنا تھا کہ ''ہماری موجودہ پریشانیوں کا سب سے بڑا واحد سبب یہی ہے کہ ''ہم نے خدا کو فراموش کردیا ہے''۔ مشہور مفکر و دانشور راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ ''مذہب ہی انسانی قدروں کی آبیاری کرتا ہے اور اُسے وہ قوت عطا کرتا ہے جس کے سہارے وہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے سعی و جدوجہد کرتا ہے اور ان مقاصد کے لئے اپنی جان تک کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہے''۔ ڈاکٹر باشم (Dr. A.L. Basham) کا یقین ہے کہ ''ماضی کے ثقافتی اور مذہبی خزانوں میں ایسا تریاق موجود ہے جو آج کی بے چین روحوں کو طمانیت قلب عطا کرسکتا ہے''۔

عیسائی راہبوں نے خدا کے نام پر احتسابی عدالتوں کے ذریعہ جو مظالم ڈھائے اس سے مغربی عوام نے یہ باور کرلیا کہ سارے مذاہب قدامت پرست ہیں لیکن مذہب کو ترک کردینے سے جو خلاء ہوا اُسی نے مادّیت اور لذت پرستانہ تہذیب کو جنم دیا۔ <u>اخلاقیات کی اساس مذہب ہے</u> اس لئے جب مذہب بے دخل کردیا گیا تو بدکرداری کو فروغ حاصل ہوگیا۔ اس صدی کی ساتویں دہائی سے تو بدکرداری اور فحاشی برابر ترقی پر ہے اور اس کا سب سے پہلا نشانہ خاندانی زندگی ہے (۱)۔ امریکا میں مذہب اور خدا کے نام سے بیزاری کس حد تک بڑھ گئی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ریاست الباما میں ایک سشن جج نے اپنے اجلاس میں خدا کے دس احکام اٹکا رکھے ہیں اور ان کے اجلاس میں عدالت کی کارروائی Prayer کے بعد شروع ہوتی ہے امریکن سول لبریٹز یونین نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور اس معاملہ کو عدالت عالیہ لئے جارہی ہے کہ یہ دونوں کارروائیاں اسٹیٹ کو چرچ کے اثر سے علیحدہ رکھنے کے آئینی ضابطہ کی خلاف ورزی کرتی

(۱) مضمون ''پاکستان میں ہمارا جزوی اسلام'' عمران خاں ''تعمیر حیات'' ۲۵ رجنوری ۱۹۹۶ء

ہیں۔ جج موصوف نے کہا کہ ''ایک ایسے ملک میں جو اس اصول پر قائم کیا گیا ہے کہ ہمیں خدائے برتر نے پیدا کیا ہے ہم اپنے بچوں کو یہ پڑھاتے ہیں کہ ہم جانوروں سے evolve ہوئے ہیں اور پھر یہ تعجب کرتے ہیں کہ ہم جانوروں جیسے افعال کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر ان لوگوں کا بس چلے تو یہ امریکی معاشرہ سے خدا کا نام ونشان بالکل ہی مٹا ڈالیں''!

چونکہ خاندان ہی وہ بنیادی اکائی ہے جس پر معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے، اس لئے ہمیں اسے مستحکم بنانا ہوگا اور رشتۂ ازدواج کے تقدس کو تسلیم کرتے ہوئے ہر ایسی کوشش کو ناکام بنانا ہوگا جو آزاد محبت جیسے نظریہ کو فروغ دے کر اسے کمزور کرنے کی سعی کرے۔ روحانی قدروں کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے شروع سے ہی بچوں کی تربیت ایسے ڈھنگ سے کی جانی چاہئے کہ وہ اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی میں اتارلیں۔ ایسا تعلیمی نظام رائج کرنا ہوگا جس میں بچوں کو معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ہی ساتھ دانشمندی اور کردار سازی پر بھی خاصی توجہ دی جائے اور انہیں انسانیت کے اعلیٰ مقام سے آشنا کرایا جائے اور دل کی گہرائیوں، روح وقلب کی وسعتوں، یقین وایمان کی حلاوتوں سے بہرہ ور کرایا جاسکے۔ سوربون یونیورسٹی میں ایک خطاب کے دوران اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ تمدن کا موجودہ بحران کلچر کے تصادم سے نہیں بلکہ تشدد سے ہے صرف وہ تشدد نہیں جو آتشیں اسلحہ جات سے پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ تشدد جو عام لوگوں کے برتاؤ اور ان کی بے رحمی سے جھلکتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد حکومتوں اور پروفیشن نے صرف کارکردگی میں اضافہ کی کوشش کی۔ بڑھی ہوئی صارفیت اور کم سے کم طمانیت جو تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کے سامنے مسئلہ رہا ہے آج پورے عالم کا مسئلہ بن گیا ہے۔ تعلیم جس کا مقصد زندگی کے مسائل سے ہم آہنگ ہونا تھا اب اپنا توازن کھوچکی ہے کیونکہ اب تعلیم صرف کارکردگی کے لئے رہ گئی ہے، ہم آہنگی کے لئے نہیں۔

"...... because it is education for efficiency not for harmony"

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں ''اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں جو بھی تعلیم ملتی ہے سب اسی تہذیب کے ماتحت ہے۔ تفریحی منظر، کھیل تماشے جو بھی سامنے آتے ہیں سب اسی شعلہ کو اور تیز کرنے والے ہیں۔ وضع ولباس کی ساری فیشن طرازیاں اسی آگ پر تیل ڈالنے والی ہیں، اس لئے ماحول سارے کا سارا اسی منزل کا موید ہے''۔

ہمیں اس پورے ماحول کو بدلنا ہوگا جسے سوروکن نے De sexualisation of culture کہا ہے یعنی اپنے کلچر اور اس کے تمام اداروں کو جنسی گراوٹ Dregs of Sexuality سے چھٹکارا دلانا ہوگا اور اس میں سماج کے ہر طبقہ کو دانشوروں، اہل علم، اہل صحافت، الیکٹرانک میڈیا، ارباب سیاست اور حکومتوں کو اپنا پورا اشتراک وتعاون دینا ہوگا اور سب سے بڑھ والدین کو اپنے بچوں کے سامنے اعلیٰ کردار کا بہترین نمونہ پیش کرنا ہوگا کیونکہ والدین کے برتاؤ کا زبردست اثر بچوں پر پڑتا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ سن بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد والدین کا اثر بچوں پر کم ہوجاتا ہے اور وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں (Peer Group) کا زیادہ اثر قبول کرتے ہیں لیکن حال میں امریکا میں نوجوانوں کے برتاؤ کے اس پہلو کا ایک گہرا مطالعہ ماہر سماجیات مائکل. ڈی. رِسنک (Michael D. Resneck) مِنی سوٹا یونیورسٹی نے کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

والدین کے برتاؤ کا زبردست اثر اب بھی اپنے بچوں پر پڑتا ہے۔ جن بچوں کو اپنے والدین کی بے پناہ شفقت ومحبت ملتی رہتی ہے وہ اسکول میں بھی راحت محسوس کرتے ہیں اور اپنی پڑھائی کی طرف بھی معقول توجہ دیتے ہیں۔ ایسے بچے نہ شراب وسگریٹ نوشی کی لت میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ قبل از وقت جنسی اختلاط میں اور نہ ہی اُن میں خودکشی کا رجحان پنپتا ہے۔ اس مطالعہ نے اس خام خیالی (Myth) کی تردید کردی ہے کہ نوجوان لڑکوں پر والدین کا اثر کم ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم تہذیب جدید کی ظاہری چمک دمک سے اس درجہ مرعوب ہوگئے ہیں کہ ہم ان نتائج واثرات سے یکسر غافل ہوکر رہ گئے ہیں جس نے وہاں کے معاشرہ میں فحاشی، میخواری، عریانی اور جنسی بے راہ روی کو فروغ دے کر سارے معاشرہ کو پراگندہ کردیا ہے۔ ہمیں ان کی اچھی قدروں اور لائق ستائش خوبیوں کو یقیناً اپنانا چاہئے لیکن مخرب اخلاق قدروں سے کنارہ کش رہنا چاہئے تاکہ ہمارے معاشرہ میں وہ برائیاں نہ پیدا ہوسکیں اور وہ نتائج نہ مرتب ہوں جو مذموم قدروں کے اپنانے کی وجہ سے انکے معاشرہ میں پیدا ہوچکے ہیں۔ شری وی. کے. سبرامنین (V.K. Subramanian) مشورہ دیتے ہیں کہ "اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوئے تجدد کی رو میں ہمیں اپنے قیمتی ثقافتی ورثہ اور مضبوط خاندانی رشتوں کو فراموش نہ کرنا چاہئے جنہوں نے صدیوں سے ہماری

رہنمائی کی ہے اور ہمارے معاشرہ کو مستحکم بنائے رکھا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت علیحدگی، غیر محفوظیت، تنہائی اور بے اعتمادی کی طرف لے جاتی ہے اور معاشرہ میں عدم استحکام پیدا کرکے انحطاط کی جانب ہی لے جاتی ہے۔ ہمیں ان لغزشوں سے بچنے کی کوشش کرنا چاہئے جنہوں نے مغربی ملکوں کو افسوسناک مشکلات میں مبتلا کردیا ہے۔ قبل از وقت اور حد سے بڑھی ہوئی صنفین کی آمیزش (Excessive Mingling of Sexes) میڈیا فلموں اور ٹیلی ویژن میں جنسی محرکات کی حد سے بڑھی ہوئی عکاسی، اور دوسروں کی مدد کرنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے اسے چھوڑ کر محض رنگ رلیوں میں شدید انہماک۔ ہمیں دائمی سکون اور طمانیت قلب نہیں دے سکتے۔ مشہور فلسفی دانشور اور سیاسی مدبر آنجہانی راج گوپال اچاریہ نے بھی یہی کہا تھا کہ "تمدن کو اب بھی بچایا جاسکتا ہے اگر ہم اخلاق قدروں کو دوبارہ اپنی زندگی میں رچا بسالیں:

"Civilization May Yet Be Saved If We Recover Our Sense Of Values."

ضمیمہ

مغربی تمدن کی ''ترقی'' کی راہ پر چلنے کی کچھ اہم تاریخیں

* ۱۴۹۳ء میں کولمبس کی امریکا سے واپسی کے بعد جنسی امراض (آتشک وسوزاک) یورپ میں پھیلنا شروع ہوئے۔
* ۱۵۶۴ء کنڈومس کا پہلا تحریری تذکرہ کیا گیا جب اٹلی کے ماہر تشریح جسم انسانی فیلو پیو (Fallopio) نے دعویٰ کیا کہ باریک جھلّی (Sheath) سے جنسی امراض سے بچاؤ کیا جاسکتا ہے۔
* ۱۷۰۰ء سے کنڈومس (Condoms) کا استعمال جنسی امراض سے بچنے کے لئے شروع کیا گیا۔ انگلستان کے شاہ چارلس دوم کے انگریز ڈاکٹر Condom نے انہیں اس آلہ کے استعمال کا مشورہ دیا جن کے نام سے ہی یہ مشہور ہوئے۔ بعد میں اسے امتناع حمل کی ایک موثر تدبیر کے طور پر اپنایا جانے لگا اور اب ایڈس کے پھیلنے کے بعد اس کے استعمال پر اور زیادہ زور دیا جارہا ہے۔
* ۱۸۳۵ء میں ریوالور کی ایجاد ہوئی جو آج خانگی تشدد اور جرائم کا سب سے بڑا مہلک ہتھیار ثابت ہو رہا ہے۔
* ۱۸۳۹ء میں کیمرہ کی ایجاد ہوئی اور ۱۸۸۹ء میں Cine Camera دریافت ہوا۔ محققین کا کہنا ہے کہ "Explicit Sex Scenes Were Photographed Almost As Soon As Photography As a Workable Medium Was Invented In 1839"
* ۱۸۸۰ء میں ایک جرمن سائنسداں نے کوکا (Coca) کے پودے سے خالص کوکین کو الگ کیا اُسی وقت سے اس کا استعمال ماڈرن سرجری اور میڈیسن میں کیا جانے لگا بعد میں اُسے نشلی دوا کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس کا استعمال اب عالمگیر پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں مارفین سے ہیروئن نکالی گئی جسے کھانسی کی دوا کے

طور پر ایک جرمن دوا ساز کمپنی نے رائج کیا اور اب کروڑوں کی تعداد میں اس کے رسیا ہوگئے۔

* ۱۸۹۵ء میں سینما کی ایجاد فلموں کی تیاری کی ابتدا۔
* ۱۹۱۴ء پہلی عالمی جنگ کے بعد سے پورنوگرافی کی زبردست اشاعت۔ کامکس فحش لٹریچر، عریاں فلموں، بلیو فلموں کی گرم بازاری۔
* ۱۹۲۰ء سگمنڈ فرائیڈ، ایڈلر اور جنگ کے نظریات جنس (Sex) پیش ہونے کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک میں جنسی رجحانات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔
* ۱۹۲۵ء سے پیرس کے نائٹ کلب میں اسٹرپ ٹیز (Strip Tease) رقص کی ابتدا ہوئی جو اب ساری دنیا میں رائج ہوگیا ہے۔
* ۱۹۲۶ء ٹیلی ویژن کی ایجاد جس نے ہر ملک کے کلچر میں انقلاب برپا کر دیا۔
* ۱۹۳۳ء میں ریزرونیچر پارک شکاگو کے پاس قائم ہوا جس کا نام ہی Naked City رکھا گیا۔
* ۱۹۵۰ء بکنی (Bikini) کی اختراع ہوئی اب تو ساری دنیا میں لباس تیراکی کی حیثیت سے مقبول۔ اسی سال سے ٹاپ لیس (Topless) داخل فیشن ہوا۔
* ۱۹۵۰ء سے ڈیزائنر ڈرگس اور Molecules لیبوریٹری میں تیار کی جانے لگیں۔
* ۱۹۵۱ء سے جسمانی حسن کے مقابلے شروع ہوئے۔ مس ورلڈ، مس یونیورس وغیرہ
* ۱۹۵۴ء سے روس نے اسقاط حمل کو قانوناً جائز قرار دیا۔
* ۱۹۵۶ء میں امریکا نے دنیا کی سب سے پہلی عریاں فلم بنا کر اوّلیت کا شرف حاصل کیا۔
* ۱۹۵۷ء والفنڈن کمیٹی کی رپورٹ برطانیہ میں شائع ہوئی جس میں ہوموسکولیٹی Homosexuality کے قانونی جواز کی سفارش کی گئی۔
* ۱۹۵۸ء سے بین الاقوامی سیاحی میں زبردست اضافہ جس نے اجنبیوں سے سرگرم اختلاط ہونے کے مزید مواقع فراہم کردیے۔
* ۱۹۶۰ء امریکی میگزین 'پلے بوائے' (Play Boy) نے برہنگی کو داخل فیشن کرنے کی زبردست مہم شروع کی۔ اسٹرچ پینٹ پہن کر امریکی و یوروپی خواتین تقریبات میں

شرکت کرنے لگیں۔

* ۱۹۶۰ء سے منع حمل گولیوں (Pills) کا استعمال دنیا میں شروع ہوا۔ IUCD کا رواج بھی شروع ہوا۔
* ۱۹۶۴ء میں فلوریڈا کے ایک برہنہ کلب میں برہنہ شادی کی سب سے بڑی تقریب منعقد ہوئی۔
* ۱۹۶۷ء میں برطانیہ میں جانبین کی رضامندی سے لواطت کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔
* ۱۹۶۹ء میں ڈی.ایچ لارنس کی فحش ناول "لیڈی چیٹر لیزلور" کی اشاعت پر عائد پابندی برطانوی عدالت کے فیصلے کے بعد ختم کر دی گئی۔ اشاعت لاکھوں میں پہنچی۔
* ۱۹۷۰ء سے کیلیفورنیا میں بیچ پر برہنہ غسل آفتابی شروع ہوا۔
* ۱۹۷۱ء میں جاپان میں پہلی عریاں شادی (Bed In Wedding)
* ۱۹۷۱ء میں Italian League for Legalisation of Nudism کی بنیاد اٹلی میں پڑی۔
* ۱۹۷۲ء سے وائزڈن (جرمنی) میں پبلک مقامات پر برہنہ غسل کرنے کا رواج شروع ہوا۔
* ۱۹۷۳ء امریکی سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ کہ اسٹیٹ کو عورتوں کے اسقاط حمل کے حق میں کوئی مداخلت نہ کرنا چاہیے۔
* ۱۹۷۴ء میں برہنگی کامل (Streaking) کا نیا فیشن امریکی یونیورسٹیوں میں شروع ہوا۔ طلباء برہنہ ہو کر لان پر رقص میں مصروف۔
* ۱۹۷۶ء میں واشنگٹن میں بیسواؤں کی پہلی عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔
اسی سال واشنگٹن میں پہلی بار ۵۰ فیصدی سے زائد ناجائز ولادتیں ہوئیں۔
* ۱۹۷۸ء سے سوئزرلینڈ کے شہر Berne میں بھی ٹاپ لیس Topless کی اجازت سرکاری طور پر دے دی گئی۔
* ۱۹۸۰ء دنیا میں مہلک مرض ایڈز AIDS کے کیس کی پہلی بار شناخت ہوئی جو آج ساری دنیا میں مہلک مرض کی طرح پھیل چکا ہے۔
* ۱۹۸۱ء میں امریکا کے اٹارنی جنرل Edwin Mese کی صدارت میں

پارنوگرافک لٹریچر کی تحقیقات کے لئے کمیشن مقرر ہوا جس نے اپنی رپورٹ ۱۹۸۶ء میں پیش کی جس میں بڑھتے ہوئے جرائم کے لئے Hard Core Pornogrophy کو ذمہ دار قرار دیا گیا۔

* ۱۹۸۱ء سے جاپان کے عریاں رسالے Focus کی اشاعت شروع ہوئی۔
* ۱۹۸۵ء نوجوانوں کے مسائل کی طرف لوگوں کے شعور کو بیدار کرنے کے مقصد سے اقوام متحدہ نے بین الاقوامی نوجوانوں کا سال منایا۔
* ۱۹۸۹ء سے ڈنمارک میں ہوموسکشول شادیاں جائز قرار دے دی گئیں۔ اور ۱۹۹۳ء سے ناروے وسویڈن نے بھی ایسا ہی قانون وضع کر دیا۔
* ۱۹۹۰ء سے ہنگری میں بلیو فلمیں اتنی تیزی سے تیار کی جانے لگیں کہ اُسے "بلیو فلموں کا ہالی وڈ" کہا جانے لگا۔
* ۱۹۹۴ء "خاندان" جیسے اہم ادارے کے انحطاط کو روکنے کی غرض سے اور عوام کے شعور کو اسے مستحکم بنانے کے لئے بیدار کرنے کے مقصد سے اقوام متحدہ نے "بین الاقوامی فیملی سال" منایا۔
* ۱۹۹۶ء میں آسٹریا میں عورتوں کے درمیان پہلی لیزبین Lesbian شادی کی تقریب منعقد ہوئی۔
* ۱۹۹۹ء امریکا کے شہر کولوریڈو کے ایک اسکول میں طلباء میں باہمی شوٹنگ کا عبرتناک واقعہ۔ امریکیوں کی خانگی زندگی میں بڑھتے ہوئے تشدد پر حکام فکرمند ہوئے۔
* ۲۰۰۰ء بندوق کے تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کے خلاف واشنگٹن اور ۲۰ دوسرے شہروں میں Million Mom March Rally مئی ۲۰۰۰ء میں نکالی گئی۔
* ۲۰۰۰ء Gay Parade 2000 کا عالی شان جلوس فرانس، اسپین اور اٹلی میں جون ۲۰۰۰ء میں نکالا گیا۔ رومن کیتھولک چرچ نے حضرت مسیحؑ کی ولادت کے دو ہزار سال پورا ہونے کے سال میں اس پریڈ کے نکالے جانے پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن گیز Gays نے ان سنی کرتے ہوئے پورے تزک واحتشام سے جلوس نکالا۔

دُنیا کی آبادی

☆ ۱۸۰۰ء میں دنیا کی آبادی ایک ارب تھی جو ۱۹۳۰ء میں بڑھ کر دو ارب ہوگئی۔ ۱۹۶۰ء میں تین ارب، ۱۹۷۴ء میں چار ارب اور ۱۱ر جولائی ۱۹۸۷ء کو پانچ ارب اور ۱۲ر اکتوبر ۱۹۹۹ء کو چھ ارب (Six Billion) ہوگئی۔

☆ صرف بیسویں صدی میں ہی دنیا کی آبادی میں 4.4 ارب کا اضافہ ہوا۔

☆ سب سے بڑا براعظم ایشیا ہے جس میں دنیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حصہ شامل ہے۔

☆ چین، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، اور روس ہی دنیا کی نصف آبادی پر مشتمل ہے۔

براعظم کی آبادی: (کروڑ میں)

۱-	ایشیا	۳۱۷،۱	۲-	یورپ	۵۰،۰
۳-	امریکا	۷۳،۴	۴-	افریقہ	۶۶،۲
۵-	آسٹریلیا	۱،۶۴	۶-	اوشیانیا	۲،۶

دنیا کے مختلف ممالک کی آبادی

ملک	لاکھ	کروڑ	ملک	لاکھ	کروڑ
ایشیا			فلپائن	--	۶
چین	۷۶	۱۲۷	تھائی لینڈ	۵۰	۵
ہندوستان	۷۰	۱۰۲	**یورپ**		
پاکستان	۴۸	۱۵	جرمنی	--	۸
انڈونیشیا	۲۱	۲۱	برطانیہ	۶۷	۵
روس	۶۹	۱۴	فرانس	۵۷	۵
جاپان	۶۹	۱۲	اٹلی	۷۲	۵
بنگلا دیش	۹۲	۱۲	اسپین	--	۴

ملک	لاکھ	کروڑ	ملک	لاکھ	کروڑ
پولینڈ	۸۰	۳	کناڈا	۶۱	۲
یوگوسلاویہ	۵۰	۲	میکسیکو	۵۰	۸
رومانیہ	۳۰	۲	**جنوبی امریکا**		
زی کوسلوا کیا	۷۵	۱	برازیل	--	۱۷
ہالینڈ	۵۰	۱	ارجنٹائنا	۲۶	۳
ہنگری	۵	۱	کولمبیا	۲۶	۳
بلجیم	--	۱	**افریقہ**		
بلغاریہ	۹۰	--	مصر	۵۰	۵
ڈن مارک	۵۱	--	الجیریا	۵۰	۲
ناروے	۴۲	--	نائیجیریا	۱۵	۱۱
سویڈن	۸۳	--	جنوبی افریقہ	۵۷	۳
شمالی امریکا			**آسٹریلیا**	۶۴	۱
یو۔ایس۔اے	۱۴	۲۸	نیوزی لینڈ	۶۴	--

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد

مذہب	ہزار	لاکھ	کروڑ	مذہب	ہزار	لاکھ	کروڑ
عیسائیت	۵۳	۷۹	۱۹۲	سکھ	۶۱	۹۱	۱
اسلام	۳۴	۹۶	۱۰۹	یہودی	۱۷	۴۱	۱
غیر مذہبی	۴۹	۱۵	۸۴	کنفوشس	۵۴	۵۲	--
ہندو	۴۷	۰۵	۷۸	بہائی	۰۴	۶۱	--
بدھسٹ	۹۴	۳۸	۳۲	جین	۸۶	۴۸	--
اتھیسٹ	۲۵	۹۹	۲۱	شنتوواسٹ	۸۴	۲۸	--
چین کے دیسی مذاہب	۳۷	۵۱	۲۲	دیگر مذاہب	۲۳	۱۹	--
نئے مذاہب کے ماننے والے	۹۷	۱۲	۱۲				
[illegible] مذاہب کے ماننے والے	۷۷	۱۷	۱۱				

(حوالہ: انسائکلو پیڈیا برٹانیکا ایئر بک ۱۹۹۶ء)

دُنیا میں نوجوانوں کی آبادی

اقوام متحدہ پاپولیشن فنڈ کی رپورٹ (۱۹۹۸ء) میں بتایا گیا کہ ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے نوجوان دُنیا کی کل آبادی کا بیس فیصدی ہوگئے ہیں اور اس وقت انکی مجموعی تعداد ایک ارب پانچ کروڑ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد ۱۹۹۰ء میں دس کروڑ ۶۴ لاکھ ۹ ہزار تھی جو ۱۹۹۸ء میں بڑھ کر دس کروڑ ۵۷ لاکھ ۶ ہزار ہوگئی۔

متفرق معلومات :

یونیسف کی رپورٹ (۱۹۹۹ء) میں بتایا گیا کہ اس وقت ایڈز کے مہلک مرض کی وجہ سے دنیا میں ۸۲ لاکھ بچے ایسے ہیں جن کے سر سے ماں یا ماں باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا ہے اور ۲۰۰۰ء تک ایسے بچوں کی تعداد بڑھ کر ایک کروڑ ۳ لاکھ ہوجائے گی جن میں تقریباً ایک کروڑ بچے ۱۵ سال سے کم عمر کے ہوں گے۔ ایڈز کی وجہ سے ایشیا میں یتیم بچوں کی تعداد تگنی ہوجائے گی۔

- ❑ یو۔ایس۔اے میں ۲۰ کروڑ لوگوں کے پاس پرائیویٹ طور پر گن ہیں۔
- ❑ فرانس میں کاسمٹکس اشیاء کی فروخت ۲۸،۳ بلین فرینک (۶،۵ بلین ڈالر) ہر سال ہوتی ہے۔
- ❑ امریکی کتے اور بلیاں پالنے کے بے حد شوقین ہیں۔ وہاں ۶ کروڑ ۱۰ لاکھ پالتو کتے اور ۷ کروڑ ۴ لاکھ پالتو بلیاں ہیں جن کے کھانے اور دوا علاج پر ۲۰۰۰ء میں ۲۷۰۰ کروڑ روپے خرچ کئے گئے۔
- ❑ امریکی ۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر روزانہ لاٹری پر خرچ کرتے ہیں۔
- ❑ دُنیا کی کل ۵۰ کروڑ کاروں میں ایک تہائی صرف یو۔ایس۔اے میں ہیں۔ امریکی سیر سپاٹے میں اپنی کاروں کے ذریعہ ۲،۴ ٹریلین (Trillion) کیلومیٹر کا سفر ہر سال طے کرتے ہیں اور ساری دُنیا میں خرچ ہونے والے فیول سے زیادہ صرف امریکا میں خرچ ہوجاتا ہے۔

کتابیات

۱۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش..... مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

۲۔ مضامین عبدالماجد دریابادی .... مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

۳۔ دو مہینے امریکہ میں .... محمد رابع حسنی ندوی

۴۔ یہ ہے مغربی تہذیب .... ڈاکٹر عبدالمغنی فاروق

۵۔ پردہ اجتماعی اور شرعی نقطہ نظر سے.................. مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۶۔ انسانیت حیوانیت کی راہ پر .... منشی عبدالرحمٰن خاں

۷۔ آتم ہتھیا اور واسنا کے اپرادھ (ہندی) .... پری پورنا نند ورما

۸۔ اسلام اور جنسیات .... بدر شکیب

۹۔ تسخیر عالم کا یہودی منصوبہ

۱۰۔ طوفان سے ساحل تک .... محمد اسد

۱۱۔ مغربی تہذیب۔ انحطاط اور علاج .... حبیب ریحان خاں ندوی

1. Sexual Wilderness..................Vance Packard
2. Sane Sex Order..................Pitrim Sorokin
3. Sexual Offences in India & Abroad..............Paripurnanand Varma
4. Sexual Behaviour of the Human Male.
5. Sexual Behviour of Human Female — Kinsey, Pomery & Gebhard (4–5)
6. Sexual Behaviour of the American Female..................G.S.Ghure
7. Drugs the Evil Addiction..................Beena Menon & Dr. Bhim Sen
8. Medical & Health Encyclopaedia..................Richard G. Wagman
9. Narcotic Drugs..................Anil Agarwal
10. Permissiveness & Modern Youth..................Ikramullah
11. Challenge of Crime in a Free Society
12. Crime Explosion..................Peter Gladstone Smith
13. Chicago Confidential
14. United Stated Confidential
15. Washington Confidential
16. New York Confidential — J. Lait & L. Mortimer (13–16)
17. Women on the Street (British Biology Council)
18. War & Immorality..................S.L. Roy
19. The Rise of the new Criminal
20. Youthful Offenders..................A.A.Weeks

اِشاریہ

(الف)

(ب)

(پ)

(ت)

(ٹ)

(ج)

(ق)

(ک)

(گ)

(ل)

(م)

(ن)

(و)

(ہ)

(ن)

(و)

(ہ)

مصنف کی تصنیفات کا تعارف

۱۔"فریب تمدن"

پیش لفظ از مولانا عبدالماجد دریابادی "فرنگی" تہذیب کے اخلاقی ومعاشرتی پہلوؤں کا پوری طرح جائزہ لیا ہے۔کتاب استادوں، اتالیقوں، والدین سب کی نظر سے گزرنے کے قابل"۔ (صدق جدید)
"مغربی تہذیب وتمدن کے چہرے سے ریشمی نقاب اتار لیا ہے اور اسکی اصل تصویر نگاہوں کے سامنے پیش کردی ہے۔۔۔محنت سے مواد اکٹھا کیا ہے اور اسکو سلیقے سے ترتیب دیکر اردو میں ایک گرانقدر کتاب کا اضافہ کیا ہے"۔(نیا دور)

۲۔"دولوں کی خیر"

مہلک نیوکلیائی اسلحہ جات، دنیا کے بڑھتے ہوئے ملیٹری اخراجات، عالمی افلاس اور جنگ کی غارت گری کا مفصل جائزہ۔اردو کے معلوماتی اور بامقصد لٹریچر میں ایک اہم اضافہ۔(دعوت) "اردو میں اپنے قسم کی پہلی تصنیف" (ہماری زبان)

۳۔"نشے کی لت موت کا سایہ"

مے نوشی، نشیلی ادویات اور سگریٹ نوشی کی مہلک عادتوں کا تفصیلی جائزہ علمی تحقیقات کی روشنی میں۔اردو زبان میں ایک منفرد حیثیت رکھنے والی علمی ومعلوماتی کتاب"(نیا دور)" اس طرح کے انوکھے اور ضروری موضوع پر پچاسوں سال میں ایک یا دو کتابیں منظر عام پر آتی ہیں"(ہماری زبان)"بے شک مصنف نے موضوع کا حق ادا کردیا ہے ہر عنوان کے تحت معلومات کا ایک خزانہ نظر آتا ہے"(تعمیر حیات)

۴۔"مادک پدارتھ سیون سمسیا ایوم ندان"(ہندی)

مندرجہ بالا عنوان پر ہندی میں تصنیف۔کتاب پر تبصرے "اتیو"(جون ۱۹۹۶) اور وشوایکتا سندیش"(مئی ۱۹۹۷ء) میں شائع ہوئے۔

۵ - PERMISSIVENESS & MODERN YOUTH (انگریزی)

مغربی تہذیب نے نئی نسل کے نوجوانوں کے لئے جو زبردست چیلنج پیش کردیے ہیں انکا عمیق تجزیہ اعداد وشمار کی روشنی میں۔پبلشر: انمول پبلیکیشنز، انصاری روڈ نئی دہلی۔تفصیلی تبصرہ ٹائمس آف انڈیا ۲۰ رجنوری ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔

ملنے کا پتہ :- اودھ بک سنٹر 96/130 گنیش گنج لکھنؤ - 18 ٹیلیفون نمبر: 2682180